تُو نے میرا رُوپ سنوارا

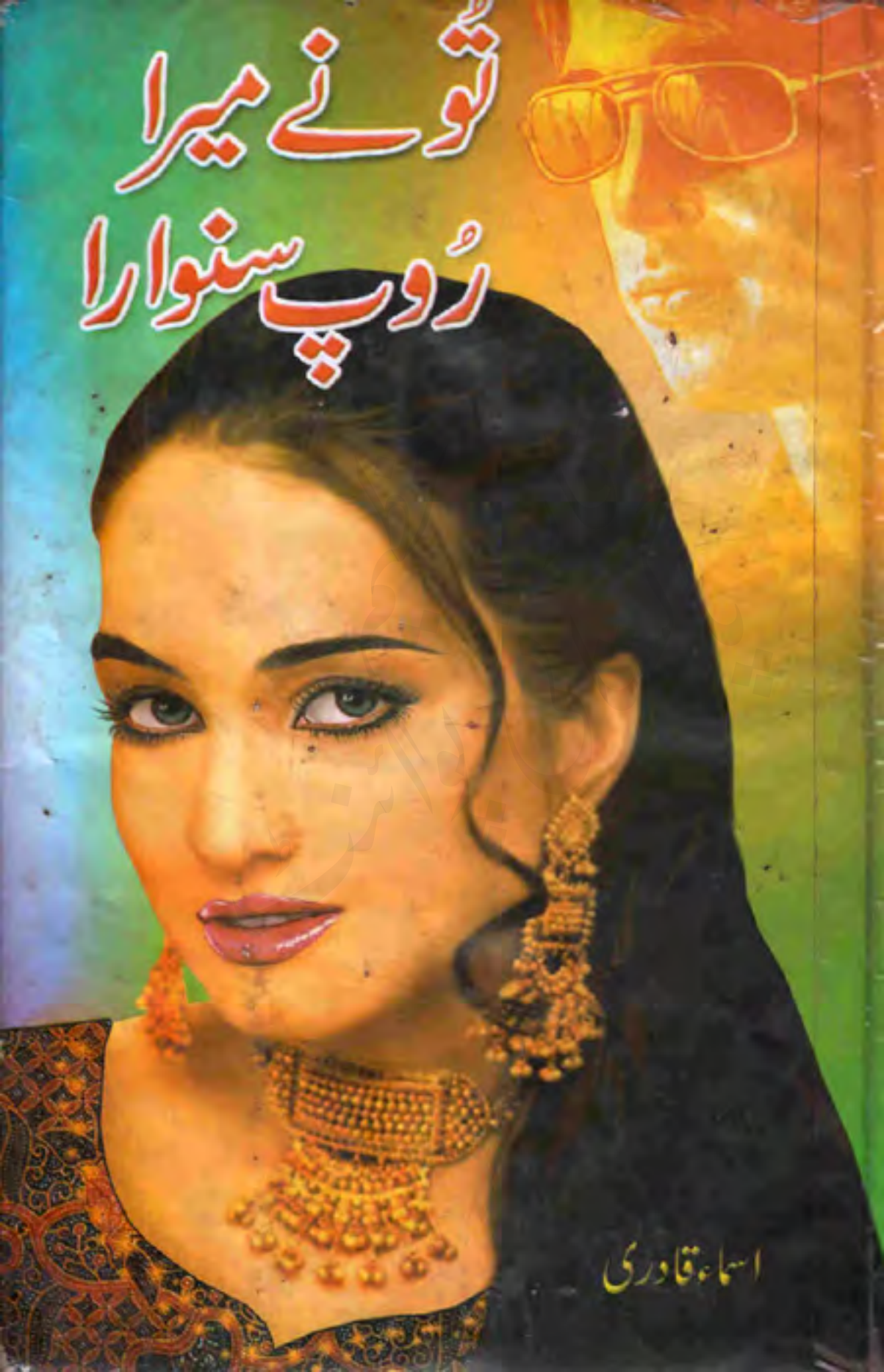

اسماء قادری

ترتیب

1) گر ہو جائے ذوقِ نظر زندہ 09
2) ہمیں عشق راس نہیں 86
3) لمحوں کے سراب 107
4) اس پرچم کے سائے تلے 123
5) کس کے لئے 134
6) منے بھیا 139
7) محبت یا سراب 170
8) خواب، خواہشیں اور زندگی 207
9) تو نے میرا رُوپ سنوارا 270

☆☆☆

گر ہو جائے ذوقِ نظر زندہ

بائیں جانب سے اُبھرتی سسکیوں کی آواز نے اس کے درد کو مزید بڑھا دیا۔ رہ رہ کر سینے میں اُٹھتی رنج و غم کی لہریں پورے وجود میں ٹھاٹھیں مارنے لگیں۔ بائیں جانب سے اُبھرتی یہ سسکیوں آوازیں ممی اور جولین کی تھیں۔ ممی اور جولین اس کی دُنیا کے تین افراد میں سے وہ دو ہستیاں تھیں جنہیں وہ صرف اور صرف ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتا تھا۔ جبکہ تیسری ہستی مائیکل کی تھی اور آج یہاں فادر اسمتھ کے پیچھے کھڑا وہ اذیت کے جس بحرِ بے کراں میں ڈوب رہا تھا وہ اس کے اس یقین کو واثق کر رہا تھا کہ مائیکل ہی ان تینوں میں اسے سب سے بڑھ کر عزیز تھا۔

''تھا، ہاں وہ کل تک اور اب نہیں ہے۔'' فادر اسمتھ کے پیچھے کھڑے ہو کر اس کی آخری رسومات کو اپنی آنکھوں سے انجام پاتا دیکھ کر بھی وہ خود کو یہ حقیقت باور نہیں کروا پا رہا تھا یا شاید یہ تھا کہ وہ اس حقیقت کو ماننا ہی نہیں چاہتا تھا لیکن ممی اور جولین کی سسکیاں ایک ضربِ مسلسل کی طرح اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں اور ہر ضرب اس کی نفرت کا گراف بلند سے بلند کر رہی تھی۔

وہ شخص جو اس کے پیاروں کی آنکھ میں آنسو لانے کا سبب بنا تھا، جس نے اس کے صرف اٹھارہ سال کے بھائی کو اس سے چھین کر موت کے سپرد کر دیا تھا۔

اس کے لئے اس کے دل میں نفرت کے علاوہ اور کون سا جذبہ ہو سکتا تھا اور یہ

نفرت لمحوں میں ہر حد پھلانگتی اس موڑ پر پہنچ چکی تھی جہاں سے اگلا راستہ صرف انتقام کا ہی ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

"عائشہ.....! اُٹھ جاؤ بیٹا.....! پونے سات ہو چکے ہیں۔" وہ کوئی پانچویں بار اسے جگانے آئی تھیں۔

"سونے دیں نا امی.....! اتنی اچھی نیند آ رہی ہے۔" منہ پر تکیہ رکھ کر اس نے ایک بار پھر سونے کی کوشش کی۔

"بالکل نہیں.....! پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ ساڑھے سات بجے تمہاری وین آجائے گی۔" انہوں نے قدرے سختی سے کہا۔

"آنے دیں وین کو۔ مجھے نہیں جانا کالج والج۔" اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی ناراضی تھی۔

"کیوں نہیں جانا کالج.....؟ اگر کالج نہیں جاؤ گی تو تمہارا لیکچرار بننے کا خواب کیسے پورا ہوگا.....؟" انہوں نے اس کی دُکھتی رگ کو چھیڑا۔

"اور اگر لیکچرار بن گئی تو آپ لوگ مجھ پر کوئی نئی پابندی لگا دیں گے۔" بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے اس نے شکوہ کیا۔

"فلط.....! ہم نے کبھی تم پر کوئی بے جا پابندی نہیں لگائی۔"

"تو پھر مجھے میری پسند کے کالج میں ایڈمشن کیوں نہیں دلوایا.....؟"

"وہ تمہاری پسند کا نہیں ثمینہ کی پسند کا کالج تھا اور اگر تمہیں پسند بھی ہوتا تو ماں باپ ہونے کی حیثیت سے ہمارا حق تھا کہ ہم تمہیں اس کام سے روکتے جس سے تمہارا نقصان ہوتا ہو۔ اپنے گھر سے نزدیک اچھا کالج چھوڑ کر شہر کے دوسرے کونے میں موجود کالج میں ایڈمیشن لینے کا آخر فائدہ ہی کیا تھا۔ اُلٹا وقت خراب ہوتا اتنے لمبے سفر میں اور تھکن الگ ہوتی۔"

وہ اپنے کئی بار کے دیئے دلائل دہرا رہی تھیں۔ البتہ عائشہ کے چہرے پر صاف لکھا

تھا کہ وہ پہلے کی طرح اب بھی ان کے دلائل سے قائل نہیں ہوئی ہے۔

"تم باتھ لے کر تیار ہو جاؤ۔ تب تک میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔" اسے مزید سمجھانا بیکار سمجھتے ہوئے انہوں نے باہر کا رُخ کیا۔

"السلام علیکم بابا.....! السلام علیکم بھیا.....!" وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو وہ لوگ ناشتے کے لئے اس کے منتظر تھے۔

"وعلیکم السلام.....!" بھیا اور بابا نے بیک وقت جواب دیا۔

"بابا.....! دیکھیں یہ بلی اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ آج کالج جا رہی ہے۔" حدید بھیا نے اس کو کالج یونیفارم میں ملبوس دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

"بس دو سال کی بات ہے صاحبزادے.....! پھر تمہارے پیچھے یہ بھی یونیورسٹی پہنچ جائے گی۔"

بابا کا بھیا کو دیا جانے والا جواب اسے شرمندہ کر گیا۔ اب تک وہ اپنے دل میں اس خیال کو جگائے بیٹھی تھی کہ بابا نے اسے ثمینہ کے ساتھ ایڈمیشن اس لئے نہیں لینے دیا کہ وہ ایک تو ایجوکیشن کالج میں ایڈمیشن لے رہی تھی اور بابا جو کافی زیادہ مذہبی رُجحان (عائشہ کے خیال میں دقیانوسی) رکھنے والے شخص ہیں، بہانے بنا کر اسے روکتے رہے ہیں لیکن اب جبکہ وہ اسے یونیورسٹی میں پڑھانے کے خیال کا اظہار کر رہے تھے تو اس کا مطلب تھا عائشہ کی سوچ غلط تھی۔

"مانو.....! ناشتہ کرلو۔ ورنہ کالج جا کر بھوک لگے گی اور پھر کینٹین کی اُلٹی سیدھی چیزیں کھا کر تم نے اپنی طبیعت خراب کر لینی ہے۔" حدید بھیا اسے ہمیشہ ایسے ہی ناموں سے پکارتے تھے۔

"اوہ.....اوہ آ گئی۔" گیٹ پر سنائی دیتی ہارن کی آواز پر وہ چائے کا کپ ہاتھ سے رکھ کر بیگ اُٹھانے لگی۔

"چلو.....! میں اپنی بیٹی کو گیٹ تک چھوڑ دوں۔" بابا اس سے پہلے اس کا بیگ اُٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

"او کے بابا.....! اللہ حافظ.....!" گیٹ پر بیگ ان کے ہاتھ سے لے کر وہ وین کی طرف بڑھی۔

"اللہ حافظ بیٹا.....! اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔" پیچھے سے بابا کی دُعاؤں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔

☆☆☆

"تھینک گاڈ.....! ناؤ ہی از آؤٹ آف ڈینجر۔" ڈاکٹر ایثار یوسفی نے کرسی پر بیٹھ کر پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سکون کا سانس لیا۔

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے ڈاکٹر.....! ورنہ وہ جس نیم مردہ حالت میں یہاں لایا گیا تھا ہم لوگ اس کے بچنے کی بہت کم اُمید کر رہے تھے۔" سسٹر عندلیب نے چائے کا کپ ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"اصل مسئلہ خون کی بڑی مقدار کے بہہ جانے کی وجہ سے ہوا تھا ورنہ درحقیقت اسے کوئی جان لیوا چوٹ نہیں لگی تھی۔ سر اور سینہ چند معمولی خراشوں کے علاوہ بالکل محفوظ ہیں۔ البتہ کولہے اور ران کی ہڈی میں ہونے والے فریکچرز طویل عرصے تک اسے اپنے پیروں پر بغیر کسی سہارے کے کھڑا نہیں ہونے دیں گے۔" چائے کے گھونٹ بھرتے انہوں نے سسٹر عندلیب کو تفصیلات بتائیں۔

"اوہ.....! پور بوائے۔ لائف کو انجوائے کرنے کے وقت یہ کیسی بے بسی کا شکار ہوا ہے۔ اس کے مدر، فادر اسے اس حال میں دیکھیں گے تو انہیں کتنا دُکھ ہوگا۔" سسٹر عندلیب اپنی ہمدرد فطرت کی وجہ سے اس کے لئے دُکھی ہونے لگیں۔

"سسٹر.....! اس کے گھر والوں سے کونٹیکٹ کیا آپ لوگوں نے.....؟ اس وقت اسے ان لوگوں کی شدید ضرورت ہوگی۔"

"سوری ڈاکٹر.....! فرصت نہیں مل سکی۔ آپ اس کے ساتھ مصروف تھے تو باقی اسٹاف پر کام کا لوڈ مزید بڑھ گیا تھا لیکن آپ فکر نہ کریں۔ ملک صاحب کا ڈرائیور بشارت جو اس پیشنٹ کو لے کر آیا تھا باہر موجود ہے۔ میں اس سے معلوم کرتی ہوں۔ ہوسکتا ہے اسے اس

لڑکے کے پاس سے کوئی آئی ڈی کارڈ وغیرہ ملا ہو۔" سسٹر عندلیب معذرت خواہانہ لہجے میں بولتی کمرے سے باہر نکل گئیں اور ڈاکٹر یوسفی سوچنے لگے کہ وہ ایک بار پھر حکومت سے اس ہاسپٹل کے اسٹاف میں اضافہ کرنے کی درخواست کریں گے۔ سسٹر عندلیب کا کہنا بالکل درست تھا۔ وہ لوگ اکثر اسٹاف کی کمی کے باعث پریشانیوں کا شکار ہو جاتے تھے۔

"یہ والٹ دیا ہے سر بشارت نے۔ اس میں لڑکے کا آئی ڈی کارڈ بھی موجود ہے جس پر اس کا نام داؤد رضا اور پتہ کراچی کا لکھا ہے۔" سسٹر عندلیب نے سیاہ رنگ کا ایک والٹ لا کر ان کے سامنے ٹیبل پر رکھا۔

"داؤد رضا.....!" آہستہ سے دہراتے ہوئے انہوں نے سامنے پڑے والٹ میں سے آئی ڈی کارڈ نکالا۔

"داؤد رضا ولد رضا احمد۔" اجنبی لڑکے کا نام جان کر وہ شدید حیرت کا شکار تھے۔

☆☆☆

"تمہاری آواز بہت خوبصورت ہے۔" وہ جو اپنے سامنے کھلی کتاب پورے انہماک سے پڑھ رہی تھی، اس جملے کو سن کر بری طرح چونک پڑی۔

بے تحاشا گوری رنگت اور کھڑے کھڑے نقوش کے ساتھ سنہری بالوں والی ایک لڑکی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ عائشہ کو یاد آیا وہ ابھی کچھ دن پہلے ہی ان کی کلاس میں آئی تھی۔

"تھینکس.....!" وہ سمجھ گئی کہ صبح اسمبلی میں گائے گئے ملی نغمے کے حوالے سے اس کی تعریف کی جا رہی ہے۔

"تمہاری کوئی دوست نہیں ہے یہاں کالج میں۔ مجھے چار دن ہوگئے ہیں کالج جوائن کئے اور میں نے ہمیشہ تمہیں تنہا ہی دیکھا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"تم نے اناٹیمی کیوں جوائن کیا.....؟ سیشن اسٹارٹ ہوئے تو کافی عرصہ ہو چکا ہے۔" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے عائشہ نے اس سے پوچھا۔

"کچھ فیملی کرائسس کی وجہ سے میں شدید ٹینشن کا شکار تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اب کبھی پڑھائی شروع نہیں کر سکوں گی لیکن پھر میرے کزن ڈیوڈ نے مجھ میں ایک نیا عزم پیدا

کیا اور اب اسی عزم کو لئے میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔" عائشہ نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں نے ایک لمحے میں کئی رنگ بدلے ہیں لیکن وہ رنگوں کی اس زبان کو جاننے سے قاصر تھی۔

"تم چاہو تو میں تمہاری ہیلپ کر دیا کروں گی لیکن بہت زیادہ کی تم مجھ سے اُمید نہ رکھنا کیونکہ درست ٹائم پر کالج جوائن کرنے کے باوجود میں درمیان میں ایسے پرابلم سے دوچار ہو گئی تھی کہ اپنی اسٹڈیز کی طرف بھرپور توجہ نہیں دے سکی۔ میری اکلوتی دوست ثمینہ نے کوئی دوسرا کالج جوائن کر لیا تھا۔ اس لئے اور بھی مشکل پیش آئی اور نئے دوست بنانے کے معاملے میں میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیتی ہوں۔"

"تو کیا تم میری دوستی بھی قبول نہ کرو گی......؟" عائشہ کے صاف گوئی سے کہنے پر اس نے اتنی معصومیت سے پوچھا کہ وہ انکار کرنے کا سوچ بھی نہ سکی۔ اور یہ جولین عرف جولی کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

☆☆☆

"ہاں تو داؤد رضا صاحب......! یہ بتائیں آپ کہاں سے آ رہے تھے اور کدھر کا ارادہ تھا......؟" اسے ہوش آ چکا تھا اور اب وہ ایک پولیس انسپکٹر کے سوالوں کی زد میں تھا۔

"میں کراچی سے لاہور جا رہا تھا۔"

"کس کام سے......؟"

"یونہی گھومنے پھرنے۔" چند پل خاموش رہنے کے بعد اس نے جواب دیا۔

"لاہور جاتے جاتے ہمارے شہر کی طرف کیسے آ گئے......؟" انسپکٹر کی جرح جاری تھی۔

"راستے میں اچانک ہی میری طبیعت خراب ہونے لگی اور مجھے لگا کہ میں لاہور تک ڈرائیو نہیں کر سکوں گا۔ اس لئے رات قریبی شہر میں گزارنے کے خیال سے میں نے اس طرف کا رُخ کر لیا لیکن پھر میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی اور میں اسٹیئرنگ پر اپنا کنٹرول قائم رکھنے میں ناکام ہو گیا۔ نتیجتاً میری گاڑی ایک درخت سے ٹکرا گئی اور اس کے بعد

[illegible] ابھی ہوش آیا ہے۔" اتنی بات کر کے شاید وہ تھک گیا تھا سو آنکھیں موند لیں۔

"انسپکٹر......! پلیز ابھی پیشنٹ کو آرام کی ضرورت ہے اور ویسے بھی میرا خیال ہے کہ یہ اپنا مکمل بیان دے چکا ہے۔" اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے ڈاکٹر ایثار یوسفی نے انسپکٹر کو ٹوکا۔

"او کے ڈاکٹر......! آپ جانتے ہیں یہ ضابطے کی کارروائی تھی۔ بہرحال اب ہم چلتے ہیں۔" وہ ان سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔

"ڈاکٹر......! میں کہیں فون کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرے کمرے تک ٹیلی فون سیٹ بھجوا سکتے ہیں......؟" ڈاکٹر ایثار خود بھی انسپکٹر کے پیچھے باہر نکلنے لگے تھے، اس کی آواز سن کر واپس پلٹے۔

"ضرور۔ شاید اپنے گھر والوں سے رابطہ کرنا چاہتے ہو۔ ویسے خود میں نے ذاتی طور پر بھی تمہارے آئی ڈی کارڈ پر موجود ایڈریس پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہاں جواب ملا کہ یہاں داؤد رضا نام کا کوئی شخص نہیں رہتا۔ بہرحال اب تم خود صحیح جگہ پر کونٹیکٹ کر کے اپنے بارے میں اطمینان کرا دینا۔ یقیناً پچھلے پانچ دن سے تمہارے رابطہ نہ کرنے پر تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔"

"پانچ دن......؟ تو کیا میں پانچ دن بعد ہوش میں آیا ہوں......؟" ڈاکٹر ایثار کی بات نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

"ویسے تو تمہیں ایکسیڈنٹ کے اگلے ہی روز ہوش آ گیا تھا لیکن تمہارے سیدھے [illegible] کی ہڈیاں اتنی بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی تھیں کہ مجھے آپریشن کر کے باقاعدہ راڈ ڈالنی پڑی ہے۔ تکلیف کی شدت تمہیں محسوس نہ ہو، اس لئے ہم تمہیں مسلسل ٹرنکولائزر دیتے [illegible]۔"

"ڈاکٹر......! پلیز مجھے فون لا دیں۔" ان کی زبانی تفصیلات جان کر وہ بے حد بے [illegible] ہو گیا تھا۔

"ہیلو......! مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ 19 جولائی کو روم نمبر ٹوئنٹی ون میں جو لڑکی

ٹھہری تھی وہ اب بھی موجود ہے یا کہیں جا چکی ہے......؟"

اس کی فرمائش پر فون سیٹ کا انتظام کروا کر وہاں سے باہر نکلتے ڈاکٹر ایثار یوسفی کے کان میں پڑنے والے جملے نے ان کے ذہن کو مزید اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆☆☆

"تم ہمیشہ نعتیں پڑھتی ہو یا پھر ملی نغمے گاتی ہو۔ اتنی سریلی آواز پر کبھی کچھ ا گنگنانے کو دل نہیں چاہا تمہارا......؟" جولین کی بات پر نوٹ بک پر تیزی سے چلتا عائشہ کا ق رُک گیا اور اس نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھا کر جولین کی طرف دیکھا۔

"مشورہ واقعی مفت کی چیز کا نام ہے جو تم جیسے لوگ آرام سے دوسروں کو دے پھرتے ہیں۔"

"واقعی......؟" جولین کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ویسے یہ صرف مفت کا مشورہ نہیں بلکہ کافی بے ضرر سی ایک فرمائش ہے جسے ا دوست کی خاطر پورا کر دو تو تمہارا کوئی نقصان نہ ہوگا۔"

"بات یہ ہے جولی ڈیئر......! کہ ہمارے مذہب میں گانا بجانا جائز نہیں ہے۔ میرے بابا کو بھی یہ سب قطعی پسند نہیں۔ اس لئے باوجود خواہش کے میں نے کبھی اس کام ک کرنے کی کوشش نہیں کی۔" ہاتھ میں پکڑا بال پوائنٹ بند کر کے بالوں میں پھنساتے و قدرے پرسکون ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ ان لوگوں کا فری پیریڈ تھا سو کلاس میں بیٹھے رہنے کے بجائے وہ لوگ باہر اپنے مخصوص درخت کے نیچے آ بیٹھی تھیں۔

"مذہب کی بات مت کرو کیونکہ تمہاری ہم مذہب بے شمار خواتین و حضرات اس فیلڈ سے وابستہ ہیں بلکہ اپنے ہر آڈیو اور ویڈیو کے کامیاب ہونے پر ببانگ دہل اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ رہی تمہارے بابا کی پسند کی بات تو میں کون سا تمہیں ان کے سامنے گانے پر مجبور کر رہی ہوں۔ ایک دوست کی خوشی کے لئے تھوڑا سا گنگنا دینے پر کوئی سخت عذاب نازل نہ ہو جائے گا۔"

"اچھا بابا......! تم جیتیں میں ہاری۔ اب کہو کیا سننا پسند کرو گی لیکن پلیز کوئی آسان

اور مشہور سانگ بتانا کیونکہ مجھے وین والے کی مہربانی سے گنتی کے چند ہی گیت یاد ہیں۔ وہ بھی اس لئے کہ وہ روزانہ آنے جانے کے دوران با آواز بلند ٹیپ ریکارڈ آن کر کے بیٹھا ہوتا ہے۔"

"تو چلو ان ہی میں سے کوئی سنا دو۔" اس کے پسپائی اختیار کرنے نے جولی کو خوش کر دیا تھا۔

"پل پل بہتی ہے......
چلتی رہتی ہے......
رُکتی نہیں......
دوستی......
ہے تیرے لئے......
ہے میرے لئے......
سب کے لئے......
دوستی......"

جولین کا ہاتھ تھامے وہ گنگنا رہی تھی۔ اس کی سریلی آواز کا جادو جولین کے ساتھ ساتھ پیپل کے درخت کو بھی وجد میں لے آیا تھا۔ درخت کے پتے تالیاں بجا بجا کر اسے داد دے رہے تھے۔

☆☆☆

"آج تمہیں ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ تم نے سوچا ہے کہ کہاں جاؤ گے کیونکہ ابھی تمہیں نارمل لائف شروع کرنے میں کافی عرصہ لگے گا۔" داؤد رضا کا چیک اپ کرتے ڈاکٹر ایثار نے پوچھا تو وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"یہ بات سوچ کر میں خود بھی پریشان ہوں۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ گھر والے ملک سے باہر شفٹ ہو چکے ہیں اور گھر بھی ہم لوگوں نے فروخت کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ سیر و تفریح میں گزارنے کے بعد میرا اپنا ارادہ بھی ان کے پاس چلے جانے کا تھا لیکن اب تو ہر

چیز اُلٹ پلٹ گئی ہے۔"

"تو تم اپنے گھر والوں کو واپس یہاں کیوں نہیں بلا لیتے.....؟ میں پہلے بھی کئی بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ تمہیں ان کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر ایثار جھنجلائے۔

"آپ نہیں سمجھ سکتے ڈاکٹر.....! میرے لئے ایسا کرنا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ میں چاہتا ہوں وہ لوگ مستقلاً وہاں سیٹل ہو جائیں لیکن اس طرح یہاں واپس آ جانے سے قانونی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ دوسرے میری مدر مجھے اس حال میں دیکھ کر برداشت نہیں کر سکیں گی۔ اسی لئے میں نے ان سے بہانہ کر دیا ہے کہ فی الحال میں کچھ عرصہ پاکستان میں ہی رُکوں گا۔"

"تمہارا کوئی ایسا دوست ہے یہاں جو ان حالات میں تمہارے کام آ سکے.....؟" ڈاکٹر ایثار کی پرسوچ آواز اُبھری۔

"میں بہت لئے دیئے رہنے والا شخص ہوں ڈاکٹر.....! اس لئے لوگوں سے میرے تعلقات ہیلو ہائے تک ہی محدود ہیں۔ میرے شہر کے کئی لوگ مجھے جانتے تو ہیں لیکن ان میں سے کسی سے میرے اتنے قریبی تعلقات نہیں کہ وہ میری خاطر زحمت اُٹھا سکیں۔" اس نے نہایت صاف گوئی سے بتایا اور اس بات کے تو ڈاکٹر ایثار خود بھی گواہ تھے۔ اتنا عرصہ ہاسپٹل میں رہنے کے باوجود وہ ابھی تک کسی پر کھلا نہیں تھا اور اول دن سے اس کے لئے ان کے ذہن میں پیدا ہوانے والا تجسس ہنوز قائم تھا۔

"اوکے.....! تم آرام کرو۔ تمہارے مسئلے کا حل میں خود نکال لوں گا۔" ڈاکٹر ایثار اس کا شانہ تھپکتے باہر نکل گئے۔

کسی اجنبی شہر میں، اپنوں سے دُور، بے یار و مددگار انسان اذیت کی کس کیفیت سے گزرتا ہے۔ وقت اسے باور کروا رہا تھا اور اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

"کل میرا برتھ ڈے ہے۔ تم آؤ گی نا میرے گھر.....؟"

"نہیں.....!" جولین کے پوچھنے پر اس نے صاف انکار کیا۔

"لیکن کیوں.....؟" وہ حیران ہوئی۔

"بات یہ ہے مس جولین رابرٹ.....! کہ میں آج تک اپنے گھر والوں کو یہ بتا سکی کہ میری کسی کرسچن لڑکی سے دوستی ہے کیونکہ میں جانتی ہوں وہ اسے بالکل بھی برداشت نہیں کریں گے تو ایسی صورت میں تمہارے گھر جانے کی فرمائش کرنا وہ بھی برتھ ڈے میں شرکت کے لئے نری حماقت ہے۔ ارے میرے گھر والوں نے تو کبھی میرا برتھ ڈے سیلیبریٹ نہیں کیا، تمہارے برتھ ڈے کو خاک اہمیت دیں گے۔"

"کیا.....؟ تمہارے گھر والوں نے کبھی تمہارا برتھ ڈے سیلیبریٹ نہیں کیا.....؟"

"نہیں.....!" جولین کی حیرت کے جواب میں اس نے آرام سے نفی میں گردن ہلائی۔

"لیکن کیوں.....؟"

"بھئی میرے بابا کا خیال ہے کہ یہ ساری خرافات ہیں جو تم لوگ کرتے ہو اور ہمارے ہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔"

"اوہ گاڈ.....! آخر تمہارے بابا کس زمانے کے انسان ہیں.....؟ میں بے شک مسلمان نہیں ہوں لیکن بچپن سے یہیں اسی ملک میں تمہارے ہی لوگوں کے درمیان رہتی آئی ہوں۔ نہ تو یہاں سب لوگ تمہاری طرح تین گز کی چادر میں چھپ کر رہتے ہیں نہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں مذہب کو درمیان میں لاتے ہیں۔ برتھ ڈیز، نیو ائیر پارٹی، بسنت یہ سب چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں جو ہماری لائف کو خوبصورت بناتی ہیں اور تمہارے بابا جیسے دقیانوسی لوگ طرح طرح کے اعتراضات اُٹھا کر نہ خود خوش رہتے ہیں نہ دوسروں کو اپنی زندگی سے لطف اندوز ہونے دیتے ہیں۔"

"اچھا اگر میں مان بھی لوں کہ میرے بابا دقیانوسی ہیں تو اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ تمہاری برتھ ڈے میں آنے کی اجازت تو بہرحال مجھے کسی صورت نہیں ملنے کی۔" وہ کچھ چڑ کر کلاس روم کی طرف چل پڑی۔ صبح کالج گیٹ پہ اندر داخل ہوتے ہی اسے جولین مل گئی تھی اور وہیں سے ان دونوں کے درمیان اس گفتگو کا آغاز ہوا تھا۔

''لیکن میں نے کہہ دیا ہے، تمہیں ضرور اور ضرور میری برتھ ڈے پر آنا ہوگا۔ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔'' وہ عائشہ کے پیچھے ہی لپکتی آ رہی تھی۔

''مگر کیسے.....؟'' وہ جھنجلا کر جولین کی طرف پلٹی۔

''اگر میں بتا دوں کیسے تو کیا تم میری بان مان لو گی.....؟'' جولین کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

''ماننے والی ہوئی تو۔'' عائشہ نے شانے اُچکائے۔

''یار.....! ماننا نہ ماننا تو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ورنہ میرا آئیڈیا تو بہت سمپل ہے۔'' اس نے لاڈ سے عائشہ کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔

''اچھا تم پہلے بتاؤ تو سہی۔''

''بس تم یہ کرنا کہ جب وین تمہیں کالج کے گیٹ پر چھوڑے تو تم اندر آنے کے بجائے باہر ہی رُک جانا۔ میں اپنی گاڑی میں تمہارا انتظار کروں گی۔ بس پھر تم میرے ساتھ میرے گھر چلی چلنا۔ دوپہر میں وین کے آنے کے وقت میں تمہیں واپس گیٹ پر چھوڑ دوں گی۔''

''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے جولی.....! میں ایسی حرکت کیسے کر سکتی ہوں.....؟'' وہ اس کی بات یکسر رد کر کے کلاس روم میں داخل ہوگئی۔ جولین بھی اس کے پیچھے ہی تھی لیکن مسز ترمذی کے کلاس میں آجانے کے سبب مزید بات نہ کر سکی۔

''تم تو میری بات پر ایسے ری ایکٹ کر رہی ہو عائشہ.....! جیسے میں اپنے گھر لے جانے کے بجائے تمہیں کسی لڑکے کے ساتھ ڈیٹ پر جانے کا مشورہ دے رہی ہوں۔'' پیریڈز کے اختتام پر وہ ایک بار پھر سابقہ موضوع پر آ گئی۔

''لیکن میں اپنے ماں باپ کی اجازت کے بغیر اس طرح چوری چھپے کہیں کیسے جا سکتی ہوں.....؟ میں نے آج تک بیک ڈور کا استعمال نہیں کیا۔''

''جب ماں باپ ایسی بے جا اور بے سروپا پابندیاں لگائیں تو بیک ڈور استعمال کرنے کے علاوہ اولاد کے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں رہتا۔ وہ لوگ تمہاری اتنی سی خوشی

میں رکاوٹ بن رہے ہیں تو تم بھی ان کے ساتھ یہ چھوٹا سا دھوکا کر سکتی ہو۔ آخر تمہاری بھی تو خواہش ہوگی نا کہ تم میری برتھ ڈے میں شریک ہو یا پھر تم کہہ دو کہ تم خود بھی آنا نہیں چاہتیں۔''

''ایسی بات نہیں ہے جولی.....!'' عائشہ کے انداز میں بے بسی در آئی۔

''بس تو پھر تم میری بات مان لو۔'' جولین نے اصرار کیا اور اس کا یہ اصرار مختلف دلائل کے ساتھ پورے دن جاری رہا۔

''اچھا بابا.....! میں کل چلوں گی تمہارے ساتھ۔'' بالآخر وہ چھٹی تک پسپا ہو ہی گئی تھی۔

☆☆☆

''تھینک یو ڈاکٹر.....! تھینک یو ویری مچ.....!''

''اٹس اوکے بوائے.....! میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔'' ڈاکٹر ایثار نے اس کے ہاتھ تھپتھپائے۔

''آج کے دور میں آپ جیسے لوگ کہاں ملتے ہیں.....؟ پہلے آپ نے میرے علاج پر خصوصی توجہ دی اور اب اپنے گھر پناہ دے کر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ کسی عام آدمی سے اس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ ایک اجنبی اور وہ بھی معذور شخص کے ساتھ ہمارے معاشرے میں اتنا ہمدردانہ رویہ دیکھنے میں نہیں آتا۔''

وہ واقعی ان کا بے حد ممنون تھا۔

''بات یہ ہے داؤد رضا.....! کہ میں انسان کو بچانے میں ہی انسانیت کی بقا سمجھتا ہوں۔ اب وہ انسان اجنبی ہو یا آشنا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور پلیز اب تم بار بار احسان وغیرہ کا ذکر کر کے مجھے شرمندہ نہ کرنا۔''

''شمس الدین.....!'' اس سے کہتے کہتے انہوں نے آواز لگائی۔

''یہ داؤد صاحب ہیں۔ ان کا خصوصی خیال رکھنا ہے۔ میرے کاموں میں چاہے کوتاہی ہو جائے لیکن انہیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔''

"آپ فکر نہ کریں جناب.....!" شمس الدین نے انہیں تسلی دی۔

"اچھا داؤد.....! تم ریسٹ کرو۔ میں چلتا ہوں کچھ کام ہے مجھے۔" وہ اسے شمس الدین کے حوالے کر کے مطمئن ہو گئے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں پہلے سے بتا رکھا تھا۔ آپ بالکل بے فکر ہو کر یہاں رہیں۔ یہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب بڑے عظیم آدمی ہیں۔" اس کی دوائیں سائیڈ ٹیبل پر ترتیب سے رکھتے ہوئے شمس الدین کی زبان چل پڑی تھی۔

"یہ بات تو میں خود بھی اچھی طرح جان چکا ہوں شمس الدین.....! ان جیسا ہائیلی کوالیفائیڈ ڈاکٹر اس چھوٹے سے شہر میں یونہی تو نہیں رُکا ہوا۔ وہ تو کسی فارن کنٹری میں رہ کر ٹھیک ٹھاک کما سکتے تھے۔"

"یہ بھی اللہ کے کھیل ہیں داؤد صاحب.....! اس مالک کو کائنات کا نظام چلانا ہے تو بندوبست بھی کرنا وہ خوب جانتا ہے۔ دس سال پہلے اپنے ڈاکٹر صاحب امریکہ میں ہی رہتے تھے۔ ایک بار ان کی بیگم اور دونوں بچے یہاں پاکستان آئے ہوئے تھے کہ ہائی وے سے گزرتے ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ڈرائیور اور ڈاکٹر صاحب کا بیٹا تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے جبکہ ان کی بیگم اور بیٹی کو قریبی شہر ہونے کی وجہ سے یہیں لایا گیا تھا لیکن کسی اچھے ڈاکٹر کے نہ ہونے اور سہولیات کی کمی کی وجہ سے ان کا ڈھنگ سے علاج نہ ہو سکا اور وہ بھی ختم ہو گئے۔ حادثے کی اطلاع سن کر ڈاکٹر صاحب جب تک امریکہ سے یہاں پہنچے تب تک سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ بس پھر ڈاکٹر صاحب کو احساس ہوا کہ اس ملک کو اور خصوصاً چھوٹے شہروں کو امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کے مقابلے میں ان کی ضرورت کہیں زیادہ ہے اور اب پچھلے دس سال سے وہ یہاں ہیں۔ ہاسپٹل کو بھی انہوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے کافی ترقی دی ہے۔"

شمس الدین مسلسل بول رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔

"درد کے صحرا سے گزرنے والے لوگ دوسروں کے لئے گھنا سایہ بن جاتے ہیں

اور میں کسی بے گناہ کو خاردار راستوں پر بھٹکنے کے لئے تنہا چھوڑ آیا ہوں۔"

☆☆☆

"آج تو تم نے مجھے مروا ہی دیا جولی.....! اتنا برا لگ رہا تھا یوں کالج کے باہر کھڑے ہونا۔ جن لڑکیوں نے مجھے اس طرح تمہاری گاڑی میں بیٹھتے دیکھا ہوگا پتا نہیں میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوں گی.....؟" وہ حسب پروگرام وین سے اُتر کر کالج سے اندر جانے کے بجائے جولی کے انتظار میں باہر گیٹ پر ہی رُکی رہی تھی اور اب اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھی اپنے اس فعل پر شرمندہ بھی تھی۔

"بیکار کی باتیں سوچ کر اپنا ذہن مت اُلجھاؤ۔ تم اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ نہیں بلکہ میرے ساتھ ہو اور یہ بات کوئی اتنی قابل اعتراض نہیں کہ جس پر تمہیں احساسِ ندامت ہو۔ رہی لڑکیوں کی تمہارے بارے میں اُلٹا سیدھا سوچنے کی بات تو جب تم کوئی غلط کام کر ہی نہیں رہیں تو تمہیں لوگوں سے ڈرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔" جولی نے اسے سمجھایا تو وہ قدرے مطمئن سی ہو کر بیٹھ گئی۔

"دیکھو تمہارے بے وجہ کے خوف نے میری بھی مت مار دی۔ میں نے ڈیوڈ سے تمہارا تعارف تک نہیں کروایا۔" جولی نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو عائشہ کی نظریں خود بخود ہی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان شخص کی طرف اُٹھ گئیں۔ سیاہ بالوں اور گندمی رنگت والا وہ شخص جولی سے قطعی مختلف محسوس ہو رہا تھا۔

"ڈیوڈ میری آنٹی سنتھیا کے بیٹے ہیں۔ انہوں نے پچھلے سال ہی ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں ماسٹرز کی ڈگری لی ہے اور اب آنٹی سنتھیا کے ساتھ ان کی بوتیک چلا رہے ہیں۔" جولی نے تعارف کروایا۔

"ہیلو عائشہ.....!" بیک ویو مرر کو عائشہ پر مرکوز کرتے ڈیوڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارے تعارف کی مجھے قطعی ضرورت نہیں کیونکہ جولی تمہارے بارے میں اتنا بتاتی ہے کہ مجھے تمہارا پورا بائیو ڈیٹا حفظ ہو چکا ہے بلکہ اس نے مجھے تمہارے تین نقش تک اتنے

تفصیل سے بتا رکھے تھے کہ اگر اس وقت تم میری گاڑی کے بجائے باہر سڑک پر بھی کھڑی ہوتیں تو بھی مجھے تمہیں عائشہ کی حیثیت سے پہچاننے میں بس ایک پل ہی لگتا مگر میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ وہ یہ کہ جولی تمہارے بارے بتاتے ہوئے کچھ ڈٹڈی مار گئی یا پھر تمہارا حسن ہے ہی اتنا مکمل کہ جولی لفظوں میں اسے بیان ہی نہیں کر سکی۔" اس کی گمبھیر آواز گاڑی کی محدود فضا میں گونج کر سیدھی عائشہ کی سماعتوں میں اُترتی چلی گئی۔

اتنے صاف اور واضح لفظوں میں اپنی تعریف سن کر اس کا نوخیز دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس کے ساڑھے سولہ سال کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی مرد سے اپنی تعریف سن رہی تھی۔ پہلے اسکول اور اب کالج میں اکثر لڑکیاں اس کے حسن کی تعریف کرتی رہتی تھیں اور اپنی یہ تعریف اسے خوش بھی کرتی تھی لیکن اب یوں اچانک کسی اجنبی لڑکے کی زبان سے اپنی تعریف سننا ایک بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ اپنے رنگ بدلتے چہرے کی سرخی کو چھپانے کے لئے وہ سر جھکا گئی۔

"اوہ کم آن ڈیوڈ.....! تم نے تو میری دوست کو پزل ہی کر دیا۔" جولی نے آہستہ سے اسے ٹوکا تو وہ بے پروائی سے ہنسنے لگا۔

"تعریف پر خوش ہونے کے بجائے شرمندہ ہوتے میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔"

"عائشہ عام لڑکیوں سے مختلف ہے۔" جولی نے اس کی طرفداری کی۔

"یہ تو میں پہلی نظر میں ہی تسلیم کر چکا ہوں۔" وہ ذومعنی لہجے میں بولا تو عائشہ کی ہتھیلیوں میں نمی اُترنے لگی۔ اتنے بے باک شخص سے اس کا پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ غنیمت یہ گزری کہ باقی کا راستہ اس نے مزید کچھ کہے بغیر خاموشی سے گزار دیا۔

"یہ میری آنٹی سنتھیا ہیں۔ انکل کی انہوں نے ہی مجھے ماں بن کر پالا ہے۔" گھر پہنچنے پر ڈیوڈ سے ملتے جلتے نقوش رکھنے والی ادھیڑ عمر، اُداس آنکھوں والی ایک خاتون کا سامنا ہونے پر جولی نے تعارف کروایا۔

"گڈ مارننگ آنٹی.....!"

"مارننگ.....!" عائشہ کو قدرے سرد مہری سے جواب دیتی وہ جولی کی طرف

مڑیں۔

"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، میں اپنے کمرے میں آرام کروں گی۔ الزبتھ سے کہہ دیا ہے وہ تم لوگوں کے لئے لنچ تیار کر دے گی اور ہاں تم لوگوں کو جو کچھ کرنا ہو کر لینا۔ مجھے ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں۔" کہنے کے ساتھ ہی وہ وہاں سے چلی گئی تھیں۔

"تمہاری آنٹی کو شاید میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا۔"

"ارے نہیں.....! ایسی کوئی بات نہیں۔ آنٹی سنتھیا کا پرابلم کچھ اور ہے۔ وہ تقریباً سب ہی لوگوں سے اس طرح کا رویہ رکھتی ہیں۔"

عائشہ کے پوچھنے پر اسے تسلی دیتے ہوئے جولی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف رُخ کیا۔ ڈیوڈ ان دونوں کو گھر پہنچا کر باہر سے ہی کہیں روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے داؤد صاحب.....! بڑے خاموش اور اُداس دکھائی دے رہے ہیں۔" شمس الدین جو حسب معمول جائزہ لینے آیا تھا کہ آیا داؤد کو کوئی ضرورت تو نہیں۔ اس کے چہرے پر چھائی کیفیت کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"کیا کہوں یار.....! مسلسل بستر پر رہتے رہتے طبیعت بیزار ہو گئی ہے۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہو پھر اس عمر میں تو آدمی یوں بھی آزاد پنچھی کی طرح اُڑتے پھرنا چاہتا ہے۔ بس یہ سوچ کر خود کو تسلی دیا کریں کہ چند دن کی معذوری کے بدلے میں آپ کی زندگی بچا کر مالک نے آپ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے اور پھر ہو سکتا ہے یہ معذوری بھی آئندہ آنے والے کسی فائدے کو جنم دے۔ ابھی تو آپ کو اللہ نے موقع دیا ہے۔ بھاگتی دوڑتی زندگی میں یہ جو تھوڑا سا سکوت آیا ہے۔ یہ انسان کی سوچ اور احساس کو بڑی روانی دیتا ہے اور پھر یہ جو اچھے برے حادثات آتے ہیں نا زندگی میں، یہ انسان سے کچھ لیتے نہیں بلکہ تجربے کی دولت سے مالا مال کر دیتے ہیں اور یہ تو آپ کو پتا ہی ہوگا کہ ہر میدان میں "تجربہ" بڑی اہمیت رکھتا ہے۔" اپنی بات کے اختتام پر شمس الدین ہولے سے ہنسا۔

"یار شمس الدین.....! تم تو بڑی عالمانہ گفتگو کرتے ہو۔" ایک گھریلو ملازم کے

اندازِ گفتگو نے داؤد رضا کو حقیقتاً حیران کر دیا تھا۔

''شمس الدین کی کیا حیثیت صاحب.....! بس جیسے عطر فروش کے ساتھ میل جول رکھنے والا خوشبو کا تحفہ پا لیتا ہے، شمس الدین بھی ڈاکٹر صاحب کی محبت میں رہ کر میکنے لگا ہے۔'' شمس الدین نے نہایت انکساری سے کہا پھر اچانک یاد آجانے پر چونک گیا۔

''اوہو.....! میں یہاں باتوں میں لگ گیا اور وہاں ڈاکٹر صاحب نے نہ جانے کیا کیا بتا دیا ہوگا۔''

''کیا مطلب.....؟ میں سمجھا نہیں۔'' داؤد حیران ہوا۔

''آج کے دن اپنے ڈاکٹر صاحب کی اسٹڈی میں محفل جمتی ہے۔ اردگرد رہنے والے اور ان کے جاننے والے کچھ لوگ جمع ہو کر ان سے کام کی چار باتیں سیکھ لیتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ کو بھی وہیں لے چلتا ہوں۔ آپ کا دل بھی بہل جائے گا۔'' شمس الدین نے آفر کی تو وہ جو واقعی بے انتہا بور ہو رہا تھا، فوراً راضی ہو گیا۔

وہیل چیئر پر داؤد رضا کو بٹھا کر شمس الدین جب اسٹڈی میں داخل ہوا تو ڈاکٹر ایثار ان دونوں کو دیکھ کر دھیرے سے مسکرائے اور پھر وہاں بیٹھے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ہاں تو بھئی.....! میں یہ پوچھنے جا رہا تھا کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کا کیا مطلب ہے.....؟''

''نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔'' کئی لوگ بیک وقت بول اُٹھے۔

''اور معبود کسے کہتے ہیں.....؟''

''جس کی عبادت کی جائے۔'' ایک نوجوان نے جواب دیا۔

''اچھا تو کیا عبادت کرتے ہیں آپ لوگ اپنے معبود کی.....؟'' ان کے سوالات داؤد رضا کو دلچسپ لگنے لگے تھے۔

''نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، حج کو اللہ توفیق دے وہ حج پر بھی ہو آتا ہے۔'' ایک ادھیڑ عمر آدمی نے جواب دیا اور باقی لوگ تائیدی انداز میں سر ہلانے لگے۔

''اور تقریباً یہی سب کچھ مشرکین اور کفار بھی اپنے جوٹے خداؤں کے لئے کرتے ہیں۔ وہ بھی اپنے پتھر کے بتوں کے سامنے ماتھا ٹیکتے ہیں۔ ان کے چرنوں میں مال و دولت نچھاور کرتے ہیں۔ اس کے نام کا برت رکھتے ہیں اور جیسے تم حج کو جاتے ہو وہ بھی تیرتھ یاترا پر جاتے ہیں پھر تم میں اور ان میں کیا فرق رہ جاتا ہے.....؟''

''لیکن ڈاکٹر صاحب.....! ہم نے ان کی طرح سینکڑوں خدا تو نہیں بنا رکھے۔ ہم تو صرف خدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں۔'' ایک پرجوش سانوعمر لڑکا فوراً ہی بول اُٹھا۔

''لیکن کیا ان عبادتوں سے جو بقول تمہارے تم خدائے واحد کے لئے کرتے ہو، معاشرے کے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے مسلم معاشرے میں لوگ رشوت بھی لیتے ہیں، جوا بھی کھیلتے ہیں، شراب اور زنا میں بھی مبتلا ہیں، چوری بھی کی جا رہی ہے اور ایک دوسرے کے حقوق بھی غصب کئے جا رہے ہیں پھر کیا حاصل ہے ایسی بے روح عبادتوں کا.....؟'' ان کے سوالات نے تمام حاضرین پر سکوت طاری کر دیا تھا۔

''بات یہ ہے میرے عزیزو.....! کہ ہم نے ''الٰہ'' کا مطلب بہت محدود بنا لیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ چند عبادات کو ادا کر کے ہم اس لفظ ''الٰہ'' کا حق ادا کر دیتے ہیں لیکن میں تمہیں بتاؤں۔ میرے نزدیک ''لا الٰہ الا اللہ'' کا مطلب کیا ہے۔ میں اس کا مطلب لیتا ہوں۔ Sovereignty belongs to Allah یعنی ''حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔'' یا دوسرے الفاظ میں ''نہیں ہے کوئی حاکم سوائے اللہ کے'' اور یقین جانو یہ مطلب زندگی کا مفہوم بدل دیتا ہے کیونکہ جب تم اللہ کو ''حاکم'' تسلیم کر لو گے تو زندگی کی راہیں خود بخود متعین ہو جائیں گی کیونکہ جو حاکم ہوتا ہے، اسی کے آگے ماتھا ٹیکا جاتا ہے۔ اپنی جان و مال کو اس کے قبضے میں دے کر اس کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی کی جاتی ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نگراں نگاہیں ہر پل ہمیں دیکھ رہی ہیں۔ وہ ہمارا خالق ہے، پالنے پوسنے والا ہے، دعاؤں کا سننے والا ہے اور اگر ہم نے اس کے بنائے قوانین کی خلاف ورزی کی تو اس کی گرفت بھی بڑی سخت ہے جس سے بچ کر نہیں بھاگا جا سکتا کیونکہ یہ پوری کائنات اس کی ملکیت ہے۔ دوستو.....! اگر ہم اپنے حقیقی حاکم کی بندگی اختیار کر لیں تو اس رُسوا کن زندگی

سے نجات حاصل کرلیں گے۔ جہاں ہم قدم قدم پر معمولی اور خودساختہ "خداؤں" کے آگے جھکنے پر مجبور ہیں۔ ہم اپنے زمینی خداؤں سے ڈر کر ان کی اور ان کے بنائے قوانین کی اطاعت تو کرتے ہیں لیکن اپنے اصلی حاکم کی اطاعت سے بے بہرہ ہیں۔ حالانکہ وہی تو ہے جسے اختیار کل حاصل ہے اور پھر بھی وہ انتہا رحمٰن و رحیم ہے کہ اس نے جو بھی قانون نافذ کیا ہے، انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کیا ہے۔ اگر ہم ان احکامات و قوانین کی پیروی کریں تو ہمارے ہر مسئلے کا حل باسانی مل جائے لیکن ہم ایسا کرتے نہیں۔ ہم چند عبادتوں کے سہارے خود بھی خوش ہوتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے وہ بھی خوش ہو جائے گا لیکن غور کرو، اگر تم اپنے ملک کے حکمران کی صرف زبانی تعریف و توصیف کرو اور عمل تمہارا یہ ہو کہ چوری سے تم بازنہ آؤ، ٹریفک کے قوانین کی پابندی تم نہ کرو، رشوت تم لو، غرض ہر قانون توڑو تو کیا صرف زبانی اطاعت پر وہ تمہیں معاف کر دے گا.....؟ ہرگز نہیں۔ تو پھر تم اللہ سے یہ اُمید کیوں رکھتے ہو؟ زمینی حکمران تو چلو شاید اس طریقہ کار سے بہل بھی جائے کہ وہ بہرحال اپنے نفس کا غلام ہے لیکن اللہ تو ایسی کسی حاجت سے پاک ہے۔ اس جیسی بے نیاز ہستی کو راضی رکھنے کا طریقہ تو بس یہی ہے کہ اس کی "حاکمیت اعلیٰ" کو مان کر ہر عمل اس کے حکم کے تابع کرلیا جائے۔"

وہ تسلسل سے کہہ رہے تھے اور سب پوری توجہ سے کان لگائے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

آدھی سے زیادہ رات گزر جانے کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ آج کا دن اس کے لئے بے حد انوکھا اور سنسنی خیز ثابت ہوا تھا۔ وہ جولی کے گھر جاتے ہوئے جتنی خوفزدہ تھی، اس کے گھر وقت گزار کر اتنی ہی سرشار بھی ہوگئی تھی۔ جولی نے اسے بتایا تھا کہ اصل میں تو برتھ ڈے پارٹی شام میں منعقد ہوگی لیکن وہ اس اہم موقع کو خصوصاً عائشہ کے ساتھ سلیبریٹ کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے اس نے یہ سارا کھڑاگ پھیلایا ہے اور عائشہ کو اپنی اس قدر اہمیت بہت اچھی لگی تھی۔

جولی کے ساتھ گپیں لگاتے اس کا وقت بہت اچھا گزرا تھا۔ گفتگو کے دوران سارا

وقت دھیمے سروں میں ٹیپ ریکارڈر پر گانے بجتے رہے تھے جس سے ماحول بے حد خوشگوار ہوگیا تھا۔ جولی نے اس ایک انڈین مووی بھی دکھائی تھی۔ عائشہ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کوئی انڈین مووی دیکھی تھی ورنہ خود اس کے گھر میں تو ٹیلی ویژن پر سخت پابندی عائد تھی۔ فلم میں کئی ایسے بے باک سین تھے جنہیں دیکھ کر اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہوگئی تھیں۔

"اوہ گاڈ عائشہ.....! تم تو کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہو جسے دُنیا کی کچھ خبر ہی نہیں۔"

جولین کے مذاق اُڑانے پر وہ کچھ شرمندہ ہوگئی تھی لیکن پھر بھی اسے وہاں بہت لطف آیا تھا۔ اس قدر آزاد زندگی کا اس کے اپنے گھر میں کوئی تصور نہیں تھا۔ ٹھیک ٹھاک مالی حالات ہونے کے باوجود اس کے یا حدید بھیا کے کمرے میں ٹی وی، وی سی آر یا سی ڈی پلیئر کی سہولت میسر نہیں تھی۔ وہ لوگ کبھی کبھار کسی رشتے دار کے گھر چھپ کر ٹی وی دیکھ لیتے تھے لیکن ایسے مواقع بھی بہت کم ملتے تھے کیونکہ وہاں بھی امی یا بابا انہیں اپنی نظر میں رکھتے تھے۔ حدید بھیا کا تو پتا نہیں لیکن عائشہ ان پابندیوں سے بیزار تھی۔

آج کے دن ہونے والے تجربات میں سے سب سے انوکھا تجربہ ڈیوڈ کی گفتگو اور نظروں کے پیغام کا تھا۔ ڈیوڈ نے لنچ ان دونوں کے ساتھ ہی کیا تھا اور جولی سے بڑھ کر وہ اس کی میزبانی میں پیش پیش رہا تھا۔ اس کی اس قدر توجہ کی وجہ سے وہ ٹھیک سے کچھ کھا بھی نہیں سکی تھی۔

"اتنا کم کھاتی ہو۔ جب ہی تو اتنی نازک سی ہو۔" ڈیوڈ کے دیئے گئے ریمارکس سے وہ شرما گئی تھی اور پھر جس طرح واپسی کے سفر میں وہ گاہے بگاہے اسے بیک ویو مرر میں دیکھتا رہا تھا اس نے بھی عائشہ کو کافی پزل کیا تھا۔

"تم سے ایک بار مل کر اتنی خوشی ہوئی ہے کہ دل بار بار تم سے ملنے کو چاہے گا۔" جب وہ جولین کو گڈبائے کہہ کر گاڑی سے اُتر رہی تھی تو ڈیوڈ نے اس سے کہا تھا۔

اور اب یہ ساری یادیں اسے سونے نہیں دے رہی تھیں۔ ٹین ایج میں ہونے والی

پہلی پہلی واردات یوں بھی ہر ایک کو بڑی حسین لگتی ہے۔

☆☆☆

"یہ تمہاری آنکھیں اتنی سرخ کیوں ہو رہی ہیں.....؟ کیا رات بھر سوئی نہیں.....؟" صبح جولی نے اسے گھیر لیا تھا۔

"ہاں.....! پتا نہیں کیوں رات کو نیند نہیں آئی۔" وہ دھیرے سے کہہ کر تکیے کی مدد سے زمین پر آڑی ترچھی لکیریں بنانے لگی۔

"کمال ہے، کل ہمارے گھر میں بھی ایک شخص رات بھر سو نہ سکا۔"

"کون.....؟" جولی کی بات پر عائشہ کا دل بری طرح دھڑکا۔

"اچھا بیٹا.....! اب یہ بھی بتانا پڑے گا کہ کون.....؟" جولی نے زور سے اس کے بازو میں چٹکی بھری تو ہونٹوں سے نکلنے والی ہلکی سی "سی" کی آواز کے علاوہ وہ خاموشی سے بیٹھی اپنے سابقہ شغل میں مشغول رہی۔

"ڈیوڈ تم سے ملنا چاہتا ہے عائشہ.....!" جولی کی بات پر اس نے یکدم چونک کر سر اُٹھایا۔ اس پل درخت پر موجود پرندے بھی نہ جانے کیوں چپ سادھ گئے اور عائشہ کے کانوں میں صرف جولی کی آواز کی بازگشت باقی رہ گئی۔

"وہ بہت اچھا ہے عائشہ.....! تم ایک بار مل کر اس کی بات سن لو۔" اس کی خاموشی نے جولی کو مزید اصرار کا حوصلہ دیا۔

"یہ ممکن نہیں جولی.....! اگر میرے گھر والوں کو ایسی کسی بات کی بھنک بھی پڑ گئی تو سمجھو قیامت آجائے گی۔" بالآخر ہمت کر کے اس نے انکار کر ہی دیا تھا۔ درخت پر چھانے والی خاموشی یکدم ٹوٹ گئی اور پرندے اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔

"مجھے معلوم ہے تم مذہب درمیان میں آجانے کی وجہ سے گریز کر رہی ہو لیکن یار.....! سچ بتاؤ اس میں تمہارا یا ڈیوڈ کا کیا قصور۔ اللہ نے تم دونوں کو الگ الگ مذہب سے تعلق رکھنے والے گھرانوں میں پیدا کرنے کے باوجود تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈالی ہے تو اس کا مطلب ہے وہ مذاہب کے درمیان نہیں بلکہ انسانوں کے درمیان رشتے

قائم کرنا چاہتا ہے اور پھر تم اتنا آگے کا سوچ کر اپنی محبت کا گلا پہلے قدم پر گھونٹ سکتی ہو لیکن ڈیوڈ ایسا نہیں کر پائے گا۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"محبت.....؟" عائشہ حیران تھی۔ کل ڈیوڈ سے ملاقات ہونے کے بعد اب تک پورے چوبیس گھنٹے بھی تو نہیں گزرے تھے۔ وہ خود اپنی بدلتی کیفیت کو پوری طرح سمجھ نہیں سکی تھی اور اتنی آسانی سے جولی "محبت" کی سفیر بن کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

وین میں بیٹھتے ہوئے اس نے یونہی گردن موڑ کر جولی کی گاڑی کی طرف دیکھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ڈیوڈ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ بڑھے ہوئے شیو اور بکھرے بکھرے بالوں کے ساتھ وہ قدرے کمزور لگ رہا تھا۔ اس کی اُداس آنکھیں عائشہ کے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ نظریں ملنے پر وہ مسکرایا تو اس کی آنکھوں کی اُداسی کچھ اور بڑھ گئی۔ عائشہ نے گھبرا کر اپنا رُخ تبدیل کیا اور تیزی سے وین میں بیٹھ گئی۔ اس کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ ڈیوڈ کی یہ حالت اس کی وجہ سے ہوئی ہے۔ وہ یہ سوچ کر بہت پشیمان تھی۔ پہلے ہی اپنے دل اور جولی سے نمٹتے نمٹتے وہ ادھ موئی ہو چکی تھی۔ جولی مسلسل چار دن تک اسے ڈیوڈ کے حق میں قائل کرتی رہی تھی اور پھر اس نے ناکام ہو کر عائشہ سے گفتگو ترک کر دی تھی۔

"میں تم سے کس دل سے بات کروں عائشہ.....! میں جب بھی تمہیں دیکھتی ہوں ڈیوڈ کی شکل میری نگاہوں میں گھومنے لگتی ہے۔ تمہاری سنگ دلی نے چند دن میں اس کے چہرے سے مسکراہٹ چھین لی ہے۔ وہ جو اس قدر شوخ اور ہنس مکھ ہوا کرتا تھا، بالکل بجھ کر رہ گیا ہے اور اس کی یہ خاموشی آنٹی سنتھیا کو مارے ڈال رہی ہے۔ جب میں ان کی اور ڈیوڈ کی حالت کو دیکھتی ہوں تو خیال آتا ہے۔ کاش! میں نے کبھی تم سے دوستی کی ہی نہ ہوتی اور اگر دوستی کی تھی تو تمہیں اپنے ساتھ گھر نہ لے جاتی۔ میں تو تمہیں اپنے ساتھ اپنی خوشی شیئر کرنے لے گئی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ڈیوڈ کی جان کو روگ لگ جائے گا۔ آنٹی اور ڈیوڈ مجھے کتنے عزیز ہیں، تم نہیں جان سکتیں۔ اس وقت جب میرے ڈیڈی کی ڈیتھ کے بعد میری ماما کسی اور شخص سے شادی کر کے ملک سے باہر چلی گئی تھیں۔ آنٹی سنتھیا ہی تھیں جنہوں نے

مجھے ماں کا پیار دیا۔ وہ میری ماما کی سگی بہن ہونے کے باوجود ان سے بہت مختلف ہیں۔ میری ماما نے ہمیشہ صرف اپنی خوشی کو ترجیح دی جبکہ آنٹی کے لئے اپنی اولاد اور میری خوشیاں عزیز رہیں اور اب جبکہ ڈیوڈ کی حالت چیخ چیخ کر اس کے تکلیف میں ہونے کا پتا دے رہی ہے، میں کیسے ان سے نظر ملاؤں۔ کیسے بتاؤں کہ میری دوست نے ان کے بیٹے کا سکون چھین لیا ہے۔"

آج جب اس نے جولی سے خود سے بات نہ کرنے کا شکوہ کیا تھا تو وہ پھٹ پڑی تھی۔ اس کے آنسوؤں نے عائشہ کا دل بوجھل کر دیا تھا اور اس بوجھل دل کے لئے ڈیوڈ کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھنا ایک اور تازیانہ ثابت ہوا تھا۔

"مجھے ڈیوڈ کے ساتھ اتنا سخت رویہ اختیار نہیں کرنا چاہئے گا۔ آخر اس کا قصور ہی کیا ہے۔ اسے مجھ سے محبت ہوگئی ہے تو یہ کوئی اتنا بڑا جرم تو نہیں کہ اسے یوں تڑپتے رہنے کی سزا سنا دی جائے۔ ٹھیک ہے میں اس کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی لیکن اسے سمجھا تو سکتی ہوں۔ مذہب سے ہٹ کر انسانیت بھی تو ایک شے ہے۔"

گھر پہنچ کر بھی اس کے دل میں مختلف خیالات اُبھرتے رہے تھے اور بالآخر کسی نتیجے پر پہنچ کر اس نے جولی کو فون کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"ہیلو......!" جولی کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے پر فون ریسیو کرنے والے کی آواز سن کر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ گمبھیر، دل میں اُتر جانے والی، اُداس اُداس سی یہ آواز ڈیوڈ کے سوا کس کی ہو سکتی تھی۔

"مم...... میں عائشہ بول رہی ہوں۔" بہت مشکل سے وہ کہہ پائی تھی۔

"ہاں......! بولو ناں عائشہ......! کیسی ہو تم......؟" وہ جیسے تڑپ ہی گیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں، آپ بتائیں۔ کیا حال ہے آپ کا......؟"

"اپنے دل سے پوچھ لو۔" وہ بے ساختہ ہی بولا تھا اور عائشہ اپنے دل سے کیا پوچھتی۔ دل نے تو دھڑک دھڑک کر سینے میں ایک شور سا برپا کر دیا تھا۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔" بمشکل خود پر قابو پا کر اس نے کہا۔

"تم کہو میں دل و جان سے سنوں گا۔ تمہاری مدھر آواز نے تو میرے اندر زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ لگتا ہے صحرا کی سختی کو سہتے سہتے اچانک ہی وجود میں کوئی نخلستان آباد ہو گیا ہے۔" اس کے لہجے میں شوریدہ سر جذبوں کی آنچ تھی۔

"میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس کی آواز بے حد مدھم ہو گئی تھی۔

"کب اور کہاں......؟" ڈیوڈ نے بہت تیزی سے پوچھا تھا۔

"کل صبح کالج ٹائم میں لیکن کہاں، اس کا مجھے نہیں پتا۔ یہ آپ کو خود سوچنا ہوگا۔"

اس نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ بابا اپنے کمرے سے نکل کر اسی طرف آ رہے تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ ڈیوڈ کی باتوں سے اس کے چہرے پر چھاتے رنگ ان کی نظروں میں آئیں۔

☆☆☆

"ڈاکٹر صاحب......! میرا بیٹا میڈیکل کالج میں داخلے کے لئے ٹیسٹ دینے والا ہے۔ میری گھر والی نے کہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے کامیابی کے لئے کوئی وظیفہ معلوم کر لینا۔"

ڈاکٹر ابشار یوسفی کے گھر حسبِ معمول جمع لوگوں میں سے ایک شخص نے پوچھا تو وہ مسکرا دیئے۔

"کامیابی کا تو ایک ہی وظیفہ ہے نور محمد......! محنت اور انتھک محنت۔ اپنے بیٹے سے کہو وہ محنت سے ٹیسٹ کی تیاری کرے۔ انشاء اللہ کامیابی اس کے قدم چومے گی۔"

"وہ تو جی ٹھیک ہے، محنت تو بچہ اپنی جگہ کر ہی رہا ہے لیکن اللہ کے کلام میں بھی تو بڑی طاقت ہے۔"

"اور افسوس یہ ہے کہ ہم اس طاقت کو سمجھتے نہیں۔ ہم نے اس کلام کو صرف ثواب حاصل کرنے اور رُکے ہوئے کام انجام دینے کا کوئی منتر سمجھ لیا ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ بلاناغہ قرآنِ پاک کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ ان آیات کو نازل کرنے والا ہم سے کیا کہہ رہا ہے۔ ہماری حالت اس رٹو طوطے کی ہے جو سکھائے گئے بول بڑی روانی سے بغیر مفہوم جانے دن رات ادا کرتا رہتا ہے۔ لیکن دوستو......! انسان اور جانور میں بہت فرق ہے اور وہ انسان جو مسلمان ہونے کا دعویدار ہو، اس کی ذمہ داریاں تو

کئی گنا بڑھ جاتی ہیں کیونکہ جب "حق" ہم تک پہنچ چکا تو پھر ہمارے اِدھر اُدھر ٹانک ٹوئیاں مارتے پھرنے کا کوئی جواز نہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم نے مسلمان ہونے کا مطلب صرف سمجھ لیا ہے کہ چند مخصوص عبادات کر لی جائیں تو خالق حقیقی کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریاں پوری ہو جائیں گی۔ قرآن جو ہمارے لئے ضابطۂ حیات ہے، ہم نے اسے یکسر فراموش کر رکھا ہے۔ قرآن ہم سے کہتا ہے غور و فکر کرو اور ہم سوچتے ہیں یہ کام ہمارے اسلاف کر چکے اور اب ہماری ذمہ داری صرف اتنی رہ گئی ہے کہ ہم ریشم و حریر کے جزدانوں میں لپیٹ کر، آنکھوں سے چوم کر اسے کسی بلند مقام پر اُٹھا کر رکھ دیں۔"

جذبات کے باعث ان کی آواز معمول سے بلند ہو گئی تھی۔

"تو ڈاکٹر صاحب.....! ہمیں کیا کرنا چاہئے کہ قرآن کا حق ادا ہو سکے۔"

چودہ سالہ ایک بچے نے پوچھا۔

"میرے بچے.....! حق تو یہ ہے کہ ہم اس کا حق کبھی ادا نہیں کر سکتے لیکن اپنی طاقت بھر کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔ اپنی زندگیاں اسے سمجھنے میں کھپا سکتے ہیں۔ دیوبند، بریلوی، اہل حدیث کے جھگڑوں سے نکل کر صرف ایک مومن کی نگاہ اپنے اندر جگا کر دیکھ جاؤ گے کہ یہ قرآن علم کا کیسا بحرِ بے کراں ہے۔ جو کچھ ہمارے اسلاف نے اس میں سے جان لیا، وہ تو بہت معمولی قصہ ہے اور جو ہم معلوم کر سکیں گے وہ بھی اس کی عظمت کا اک معمولی جز ہی ہوگا کیونکہ قرآن خود دعوتِ فکر دیتا ہے اور یہ دعوت ہر دور کے لوگوں کے لئے ہے۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین نہ ہو تو ذرا حالات و واقعات کا جائزہ لو۔ دُنیا میں مسلمانوں کی حالت زار کو دیکھو۔ دُنیا میں کتنے مسلمان ہیں جن کا نام بڑے سائنس دانوں کی فہرست میں آتا ہے۔ دُنیا کے قابل ڈاکٹروں کی لسٹ میں مسلمانوں کی تعداد کتنی ہے۔ کتنی مشہور عمارتیں ہیں جن کو بنانے کا سہرا مسلمان انجینئرز کے سر جاتا ہے۔ اگر حساب کتاب کرنے بیٹھ گے تو تمہارا سر شرم سے جھک جائے گا اور یہ ساری خرابی ہے قرآن سے دوری اختیار کرنے کی۔ ہمارا مسلم معاشرہ تین طرح کے لوگوں میں بٹ چکا ہے۔

ایک وہ جو سرے سے دین کے ہیں اور نہ دُنیا کے اور جن کی زندگیاں انسانوں پر

خدا سے شکوہ کرتے ہی گزرتی ہیں۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو نامی گرامی تعلیمی اداروں سے ڈگریاں حاصل کر کے اچھی مراعات یافتہ نوکریوں اور عیش و عشرت کے حصول کو ہی زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔

اور تیسرا طبقہ ان دو طبقوں سے بھی زیادہ قابل افسوس ہے کیونکہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو قرآن حفظ کرنے، حدیثیں رٹنے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دینے میں زندگیاں گزار دیتے ہیں اور ان کی ذہنی استعداد بس صرف اتنی ہوتی ہے کہ یہ لوگوں کو مسائل وضو، زکوٰۃ و صدقات کا حساب کتاب، نمازوں کی ادائیگی کے طریقے کی تعلیم دیتے رہیں یا پھر دوسرے مسلک کے لوگوں کو غلط ثابت کرنے کے لئے دلائل ڈھونڈتے رہیں۔ ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی شخص ایسا ہوتا ہے جس کا جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے کوئی واسطہ ہو۔

قرآن کو پڑھنے والے عموماً وہ لوگ ہیں جو اسے سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے اور اگر قسمت سے کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ان کے درمیان آ جائے تو فروعی مسائل میں اُلجھ کر اپنی تمام تر صلاحیتیں کھو بیٹھتا ہے۔ یہ صورتِ حال اتنی تباہ کن ہے کہ اس نے سارے عالم میں ہمیں ذلیل و پست کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ مسلمان جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں دُنیا پر چھائے ہوئے تھے، آج ظلم و ستم کا شکار ہیں۔ ہم شکوہ کرتے ہیں کہ ہمیں دہشت گرد قرار دے کر یہود و نصاریٰ ناحق ہمارے لوگوں کا خون بہا رہے ہیں لیکن ہم متحد ہو کر ان کا مقابلہ نہیں کرتے۔ ہم وہ جسم ہی نہیں رہے جس کے ایک عضو میں درد ہونے پر پورا جسم تڑپتا ہے۔ ہم افغانستان، عراق اور کشمیر میں ہونے والے ظلم و ستم کی نیوز چینلز پر اپنی معلومات میں اضافے کا ایک حصہ سمجھ کر دیکھتے ہیں اور پھر سکون کی نیند سو جاتے ہیں۔ ہماری بے حسی ہی ہماری تنزلی کا سبب ہے۔ ہم کہ جنہیں قرآن کی صورت "نورِ مبین" سے نوازا گیا تھا۔ قرآن کو طاقوں میں سجا کر اندھیروں میں ٹانک ٹوئیاں مارتے پھر رہے ہیں۔"

بولتے بولتے وہ گویا تھک کر چپ ہو گئے لیکن ان کی آنکھوں میں موجود ہلکی سی نمی ان کی دلی کیفیات کا پتا دے رہی تھی۔ داؤد رضا جو اپنے کمرے کی تنہائی سے گھبرا کر آج پھر ان کی محفل میں شریک ہو گیا تھا، ایک ٹک انہیں دیکھ رہا تھا۔ اتنی روشن پیشانی والا کوئی اور شخص

اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

"تم کہاں جا رہی ہو جولی......!" وہ ڈیوڈ کی گاڑی میں بیٹھی تو دوسری طرف دروازہ کھول کر اترتی جولین کو دیکھ کر فوراً بول اُٹھی۔

"ریلیکس عائشہ......! ڈیوڈ تمہیں کھا نہیں جائے گا۔ میں صرف اس وجہ سے جا رہی ہوں کہ تم دونوں اطمینان سے بات کر سکو۔ ہو سکتا ہے میری موجودگی کے سبب کوئی بات ہو تم دونوں کے درمیان ان کہی رہ جائے اور تمہارے دلوں میں ساری زندگی کے لئے خلش چھوڑ جائے۔" وہ عائشہ کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کالج کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"اگر تم مجھے اعتبار کے لائق سمجھو تو میں گاڑی آگے بڑھاؤں ورنہ واپسی کا راستہ تمہیں ہمیشہ کھلا ہی ملے گا۔"

ڈیوڈ کی آواز گاڑی میں گونجی تھی۔ پہلے سے پزل بیٹھی عائشہ مزید پزل ہو کر صرف آہستہ سے "جی" ہی کہہ سکی اور ڈیوڈ کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ اگلے پل اس کی کار سڑکوں پر فراٹے بھر رہی تھی۔

"یہ...... یہ کس جگہ لے آئے آپ مجھے......؟" ایک ہوٹل کے سامنے گاڑی رُکنے پر وہ گھبرا گئی تھی۔

"جہاں اتنا اعتبار کیا ہے وہاں تھوڑا سا اور کر لو۔" ڈیوڈ نے کہا تو وہ اپنی چادر کو مزید اچھی طرح لپیٹتے ہوئے گاڑی سے اُتر آئی۔

"بالکل ریلیکس رہو۔ ورنہ لوگ مشکوک بھی ہو سکتے ہیں۔"

اس سے کہنے کے ساتھ ڈیوڈ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ پل بھر کو عائشہ کے ہاتھ میں برق سی دوڑی لیکن پھر حیرت انگیز طور پر اس کی کیفیت بدل گئی۔ ڈیوڈ کے مضبوط ہاتھ کی گرفت نے اس کا اعتماد بحال کر دیا تھا۔ شاندار سراپے کے مالک ڈیوڈ کے پہلو میں چلتے وہ سرشاری کا شکار ہو رہی تھی۔ ریسیپشن سے چابی لے کر وہ لفٹ کے ذریعے سیکنڈ فلور کے ایک کمرے میں پہنچنے تک بالکل خاموش رہا تھا لیکن اس کی خاموشی بھی عائشہ سے میٹھی میٹھی

سرگوشیاں کرتی رہی تھی۔

"دل تو چاہتا تھا تمہیں ستاروں کی رہ گزر سے گزار کر چاند کی سرزمین پر لے جاؤں لیکن ہائے مجبوری کہ میرا اختیار فائیو اسٹار ہوٹل کے اس کمرے تک ہی تھا۔" اسے بیڈ پر بٹھا کر وہ خود ایک کرسی پر عین اس کے سامنے براجمان ہو گیا تھا اور وفورِ شوق سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"میں تمہارا ہاتھ تھام کر یہاں تک لایا ہوں لیکن پھر بھی اپنی خوش قسمتی کا یقین نہیں آ رہا۔ تم پچھلے کئی دن تک جس بے دردی کا مظاہرہ کرتی رہی ہو اس کے بعد یہ یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ میں تم سے مخاطب ہوں اور تم میرے سامنے میرے اتنے قریب بیٹھی ہو کہ میں چاہوں تو ہاتھ بڑھا کر تمہیں چھو سکتا ہوں۔"

وہ اتنا خوش دکھائی دے رہا تھا کہ عائشہ کو اپنا آپ فضاؤں میں پرواز کرتا محسوس ہونے لگا۔ اتنی چاہت اور دیوانگی کوئی شخص اس کے لئے اپنے دل میں رکھتا ہے یہ احساس بڑا سرور بخش تھا۔

"لیکن ڈیوڈ میرا ہم مذہب نہیں ہے۔" اس سوچ نے اس کی سرشاری کو یکدم خلش میں بدل دیا تھا اور اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ کیا کہنے یہاں آئی ہے۔

"آپ بہت اچھے ہیں ڈیوڈ......! اتنے اچھے کہ آپ کا کسی لڑکی کو چاہنا اس کے لئے اعزاز کی حیثیت رکھتا ہے لیکن وہ لڑکی میں نہیں ہو سکتی۔"

"وہ اس لئے کہ میں مسلمان نہیں ہوں......؟" وہ عائشہ کی بات کاٹ کر تیزی سے بولا۔

"ہاں......!" نہ جانے کیوں عائشہ کی آنکھوں سے بہت سے آنسو چھلک پڑے تھے۔

"تمہارے یہ آنسو گواہ ہیں عائشہ......! کہ تمہیں بھی مجھ سے پیار ہو گیا ہے، تم بھی مجھ سے جدائی کا سوچ کر خوفزدہ ہو، ورنہ یہ آنسو کبھی تمہاری آنکھوں سے نہ بہتے۔" اس نے انگلیوں کی پوروں سے عائشہ کے آنسو چنے مگر وہ اور زیادہ شدت سے رونے لگی۔

”دیکھو عائشہ......! یہ جو محبت ہوتی ہے ناں یہ سارے اندیشوں اور نفع و نقصـ
سے مبرا چیز کا نام ہے۔ تم یہ سوچ کر محبت کرنے سے ڈرتی ہو کہ ڈیوڈ مسلمان نہیں۔ میں ا
پا نہیں سکوں گی اور میں نے تم سے محبت کرتے وقت کچھ بھی نہیں سوچا۔ مجھے تم سے محبت ہ
اور اب بھی میری طلب صرف اتنی ہے کہ مجھے کبھی کبھار تمہاری رفاقت کے چند پل مل
کریں۔ آگے کیا ہوگا، میں نہیں جانتا لیکن یہ ضرور سوچتا ہوں کہ ابھی تم بہت نوعمر ہو اور پ
رہی ہو۔ تمہارے گھر والے اتنی جلدی تمہاری شادی نہیں کریں گے۔ دو چار سال بعد ہی ا
کے ذہن میں یہ خیال آسکتا ہے اور اس عرصے میں جانے کیا کچھ بدل جائے۔ ہوسکتا ہے ا
عرصے میں تمہاری خاطر تمہارا دین اختیار کرنے کو میں ذہنی طور پر خود کو آمادہ کرلوں اور یہ
ہمارے تمہارے درمیان واحد مسئلہ ہے از خود ہی حل ہو جائے۔“

ڈیوڈ کی آخری بات ایسی تسلی تھی جس نے یکلخت ہی اس کے آنسوؤں کو روک دیا۔

☆☆☆

”ہیلو ینگ مین......! کیا حال ہے تمہارا......؟“ وہ سوچوں میں غرق بیڈ کی پشت
سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ ڈاکٹر ایثار کی آواز پر ان کی طرف متوجہ ہو کر ہولے سے مسکرایا۔

”معذوری کی زندگی جی رہا ہوں اور اس عالم میں سوچیں کچھ زیادہ ہی پریشان کرتی
ہیں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے کہ تمہیں زندگی نے سوچنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ جب
سوچ بچار کے اس دور سے نکلو گے تو ہو سکتا ہے، خود کو کسی نئی اور سیدھی راہ پر پاؤ لیکن بس اپنے
آپ کو معذور اور ناکارہ سمجھنا چھوڑ دو۔ یہ سمجھو کہ شاہراہِ حیات پر ایک موڑ آگیا ہے جہاں تمہیں
گاڑی کی رفتار کم کرنا پڑی ہے لیکن دیکھنا جب اس موڑ سے گزر جاؤ گے تو آگے راستہ بڑا ہموار
اور سیدھا ملے گا۔“ وہ اس سے باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا چیک اَپ بھی کرتے جا
رہے تھے۔

”بس اب کچھ عرصے کی بات ہے۔ تم وہیل چیئر کے بجائے اسٹک کے سہارے
چلنے پھرنے کے لائق ہو جاؤ گے۔“

”آپ کو دیکھ کر مجھ میں حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ شمس الدین
الہانی آپ پر گزرے حادثے کے بارے میں سنا تھا اور اب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا
ں کہ کیسے آپ نے اپنی زندگی کو انسانیت کی فلاح کے لئے وقف کر دیا ہے۔ کئی کئی گھنٹے بنا
ی صلے کی پروا کئے آپ ہاسپٹل میں کام کرتے ہیں اور کبھی آپ کے چہرے پر تھکن دکھائی
یں دیتی۔ آپ میں کچھ تو ایسا ہے کہ لوگ آپ کے در پر کھینچے چلے آتے ہیں۔ آپ کی باتیں
ل کے تاروں کو چھیڑ جاتی ہیں۔“ وہ کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔

”تم مجھے ایسے ہی ہیرو نہ بناؤ یار......! میں تو ربّ کائنات کا وسیع و عریض کائنات
ں ایک معمولی ذرّے کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہاں بس یہ کوشش کرتا ہوں کہ اس مالک نے
یثیت انسان جو کام میرے ذمہ لگائے ہیں ان کو ادا کرنے کی کوشش کرتا رہوں۔“ ان کا لہجہ
ہد عاجزانہ تھا۔

”آپ نے یہ اتنی انکساری کہاں سے سیکھی ڈاکٹر ایثار......! ورنہ عموماً تو لوگوں کا یہ
ال ہوتا ہے کہ اپنے کیے ہوئے معمولی کاموں کو بھی ”کارنامہ“ بنا کر پیش کرتے ہیں۔“ وہ
لدم ہی ان کا ہاتھ پکڑ کر پوچھنے لگا۔

”قرآن سے۔ جب سے قرآن سمجھ کر پڑھنا شروع کیا ہے اپنے فرائض اور
یثیت دونوں کے تعین میں آسانی ہو گئی ہے۔“

”قرآن......! آپ اس دن بھی کچھ کہہ رہے تھے قرآن کی عظمت کے بارے
ں۔ کیا واقعی اس کلام میں اتنی قوت ہے کہ اس پر عمل کرنے والے دُنیا پر راج کرنے لگیں۔“

”یقیناً......! اس بات پر تو مجھے ایک فیصد بھی شک نہیں ہے۔ وہ کتاب جس میں
الق حقیقی خود مخلوق سے ہم کلام ہو، کوئی معمولی کتاب نہیں ہو سکتی۔ آئن اسٹائن، نیوٹن،
ارشمیدس، مینڈل کے بنائے گئے لاز کو سامنے رکھ کر آج انسان کیسے کیسے حیرت انگیز کارنامے
نجام دے رہا ہے تو پھر جس نے کائنات کو تخلیق کیا۔ اس کے لاز پر عمل کر کے کیا کچھ نہ کر
گزرے گا۔“

”تو قوانین کی یہ کتاب قرآن ہی کیوں......؟ توریت اور انجیل بھی تو اسی اللہ کا

کلام ہے۔ آپ ان پر عمل کرنے کی تاکید کیوں نہیں کرتے.....؟" وہ اپنے ذہن کی اُلجھ زیر بحث لا رہا تھا۔

"سیدھی سی بات ہے۔ لاء صرف اس بات کو ٹھہرایا جاتا ہے جو مستند ہو جس کوئی تبدیلی نہ ہو اور یہ اعزاز صرف قرآن مجید کو حاصل ہے۔ اللہ نے خود اس میں اس حفاظت کا وعدہ کر کے اسے ہر طرح سے محفوظ کر دیا ہے۔ آج چودہ سو سال گزر جانے باوجود کوئی اس میں زبر زبر پیش یا نقطوں کی معمولی تحریف کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکا اس کے مقابلے میں تم صرف بائبل کی مثال لے لو۔ رومن کیتھولک کی بائبل میں عہد (پرانے عہدنامے) کے صحیفوں کی تعداد 46 اور عہد جدید کی تعداد 28 ہے۔ یعنی کل ملا کر کی تعداد 74 ہوئی جبکہ پروٹسٹنٹ فرقے میں عہد عتیق 39 اور عہد جدید 27 صحیفوں پر مشت ہے۔ یعنی کل ملا کر 66 جن کتابوں میں اتنی زبردست تحریف اور اختلاف پایا جائے۔ اُن قانون کی حیثیت سے لوگوں سے نہیں منوایا جا سکتا۔

قرآن دعویٰ کرتا ہے کہ "اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو یقیناً تم اس اختلاف پاتے۔" کتنا شاندار اُصول ہے حفاظت کلام کو ثابت کرنے کا۔ ہر قسم کی انسانی دسترد سے پاک، خدائے واحد کا کلام ہونے کے سبب ہی تو یہ اختلافات سے پاک ہے جبکہ دیگر کتب کا حال دیکھو۔ پیدائش ۳/۱۹ آیت میں ہے کہ "خدا غیب کا علم نہیں رکھتا۔" اور ۲۴/۱۳۶ میں مرقوم ہے کہ "خدا کو غیب کا علم ہے اور اس کے سوا کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا۔" اس شدید اختلاف رکھنے والی کتابوں کا قرآن سے کیا مقابلہ.....؟ مسلمان بھلے چاہے کتنے گمراہ ہو گئے ہوں، انہوں نے قرآن کے کتنے ہی تراجم اور مفہوم بنا لئے ہوں، قرآن عربی زبان میں اپنی اصل حالت میں بنا کسی تحریف اور اختلاف کے موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا۔ چاہے دُنیا کی ساری کتابوں سے اسے مٹا دیا جائے تو بھی کیونکہ ہمارے پاس حفاظ کرام کی پوری ایک کھیپ موجود ہے جبکہ بائبل وغیرہ کا ایک بھی حافظ موجود نہیں۔"

وہ بول رہے تھے اور داؤد رضا کی پیشانی پر سوچوں کا جال پھیلتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

جب پیار کیا تو ڈرنا کیا
جب پیار کیا تو ڈرنا کیا
پیار کیا کوئی چوری نہیں کی
چھپ چھپ آہیں بھرنا کیا
جب پیار کیا تو ڈرنا کیا

"اوہو.....! بڑی بہادری کے دعوے ہو رہے ہیں۔ کیا خیال ہے پھر کل تمہارے گھر پہنچ جاؤں۔ اپنے امی ابا سے میرا تعارف کروا دینا۔" وہ آج پھر کالج سے غائب ہو کر جولی کے گھر میں موجود تھی اور اس کے کمرے میں بیٹھی اس کی فرمائش پر گانا سنا رہی تھی کہ اچانک ہی ڈیوڈ وہاں چلا آیا۔

"اچھا تو اب آپ میرا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کی خاطر میں اپنے آپ کو اتنے خطرے میں ڈال کر یہاں آئی ہوں۔ اگر کسی دن بابا کو خبر مل گئی تو شاید وہ مجھے جان سے ہی مار دیں۔" وہ ڈیوڈ کے چھیڑنے پر کچھ روٹھ کر بولی۔

"ارے بابا.....! میں مذاق کر رہا تھا۔ ورنہ نتائج کی خبر خود مجھے بھی اچھی طرح ہے۔" وہ شرمندہ دکھائی دینے لگا۔

"تم نے میری دوست کا اتنا اچھا موڈ خراب کر دیا ڈیوڈ.....! اب تمہاری ڈیوٹی ہے کہ تم اس کا موڈ ٹھیک کرو۔ میں جب تک ذرا کچن کی خبر لے لوں کیونکہ آج الزبتھ نے آنے سے منع کر رکھا ہے۔" جولی ڈیوڈ سے کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"تم ہنستی گاتی کتنی اچھی لگتی ہو عائشہ.....! یہ میں تمہیں لفظوں میں نہیں بتا سکتا۔ بس یہ چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ بہت خوش رہو۔" وہ اس کے سامنے آ بیٹھا تھا اور اس کے نازک ہاتھ کو اپنی گرفت میں لئے دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، میں نے تم پر ظلم کیا ہے۔ کیا تھا جو میں اپنی آگ میں آپ ہی چپ چاپ جل مرتا۔ کم از کم تم تو محفوظ رہتیں اور اب بھی ہمارا انجام جدائی کے سوا کیا ہونا ہے۔ ایکدن تمہارے گھر والے، تمہارے ہی ہم مذہب سے تمہیں بیاہ دیں گے اور میں

شاید خودکشی کرلوں کیونکہ تمہارے بنا جینا شاید ممکن ہو جائے لیکن تمہیں کسی اور کا دیکھنا بہت مشکل ہے۔"

"اور میں جی لوں گی ایسی زندگی، یہ آپ سوچ بھی کیسے سکتے ہیں.....؟ محبت اتنی کمزور رشتہ نہیں کہ اسے توڑ کر پھر کوئی اور راہ اختیار کی جاسکے۔ محبت کی راہ گزر پر واپسی کا کوئی راستہ ہوتا ہی نہیں۔" وہ اپنی عمر سے بہت بڑی بڑی باتیں کرنے لگی تھی۔

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے عائشہ.....! کہ میں تمہاری خاطر اپنا مذہب چینج کرلوں گا پھر تو تمہارے ماں باپ کو ہمارے تعلق پر کوئی اعتراض نہ ہوگا.....؟" وہ بہت آہستہ آواز میں اسے بتا رہا تھا۔

"لیکن کیا آپ اپنے گھر والوں کو بدل سکیں گے یا انہیں چھوڑ سکیں گے.....؟"

"ان لوگوں کا اس معاملے سے کیا تعلق.....؟ تم سے رشتہ مجھے جوڑنا ہے تو میرا بدلنا کافی ہوگا۔ ان کو کسی بھی معاملے میں نہ تو میں مجبور کرسکتا ہوں اور نہ ہی انہیں چھوڑ سکتا ہوں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ممی اور جولی کا میرے سوا کوئی نہیں۔"

"آپ سے تعلق جوڑنے کے بعد میں مسلسل کئی مہینوں سے اس مسئلے پر غور کر رہی ہوں۔ پہلے مجھے لگتا تھا کہ اگر آپ مسلمان ہو جائیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن بہت سوچنے کے بعد یہ حقیقت میرے سامنے آئی ہے کہ مسئلہ تب بھی جوں کا توں رہے گا کیونکہ میرا غیر مسلم لوگوں کے ساتھ رہنا اور اُٹھنا بیٹھنا میرے گھر والے کسی صورت برداشت نہیں کریں گے۔ وہ لوگ بہت شدت پسند ہیں۔ خصوصاً میرے حدید بھیا۔ میں نے آپ کو اپنے بھیا کے متعلق بتایا تھا ناں کہ وہ ملک سے باہر ہیں لیکن میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیوں باہر چلے گئے۔ بابا کو ڈر تھا کہ اگر وہ یہاں رہے تو ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ اصل میں یونیورسٹی میں ایک بار....." وہ جو کچھ بتا رہی تھی اسے سن کر ڈیوڈ کو اپنے اندر شعلے لپکتے محسوس ہونے لگے۔ وہ مٹھیاں بھینچے خود پر ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سوری عائشہ.....! آج میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا۔ ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ بوتیک نہیں جاسکیں گی۔ اس لئے میرا جلدی پہنچنا ضروری ہے۔ تمہیں ڈرائیور

گاڑی ڈراپ کردے گا۔" وہ اچانک ہی کھڑا ہوگیا تھا۔ عائشہ حیران نظروں سے اسے کمرے سے نکلتا ہوا دیکھتی رہی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا سنایا ہوا واقعہ ڈیوڈ کو اتنی برح طرح متاثر کرے گا۔

وہ کچھ دیر ساکت بیٹھی رہی پھر گھڑی پر نظر پڑتے ہی چونک کر کھڑی ہوگئی۔ جولی وہ نہیں کہاں مصروف تھی۔ اسے کالج وین کے آنے سے پہلے کالج بھی پہنچنا تھا۔

"میں پوچھتی ہوں یہ لڑکی آخر میرے گھر کیوں آتی ہے.....؟ تم نے اگر کالج میں کسی مسلمان لڑکی سے دوستی کر بھی لی تھی تو اسے وہیں تک محدود رکھتیں۔ اسے گھر تک لانے کی کیا ضرورت تھی.....؟ میں اپنے گھر میں اس مذہب کے کسی فرد کو برداشت نہیں کرسکتی اور ڈیوڈ کیوں اس کے ساتھ اتنا انوالو ہو رہا ہے۔ اسے بتاؤ کہ میں اب مزید کوئی نقصان برداشت نہیں کرسکتی اور اس لڑکی کی اپنے گھر میں آمد مجھے کسی خطرے کا پتا دے رہی ہے۔" وہ سیڑھیاں اُتر کر کچن کی طرف بڑھ رہی تھی کہ آنٹی سنتھیا کے کمرے سے آتی ان کی بلند آواز پر چونک کر رُک گئی۔

"آنٹی.....! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ عائشہ مجھے آپ کو یا ڈیوڈ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ وہ یہاں کیوں آتی ہے، بہت جلد آپ جان لیں گی لیکن پلیز اس وقت خاموش ہو جائیں۔ وہ گھر میں موجود ہے۔ اگر اس نے آپ کی بات سن لی تو اچھا نہیں ہوگا۔" جولی دھیرے دھیرے انہیں سمجھا رہی تھی۔

"میں ہرگز بھی خاموش نہیں رہوں گی بلکہ میں تمہیں وارننگ دے رہی ہوں کہ آئندہ اگر اس نے میرے گھر میں قدم بھی رکھا تو میں اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دوں گی۔" آنٹی سنتھیا کی آواز کچھ اور بلند ہوگئی تھی۔

"اس وقت آپ کو کچھ سمجھانا ممکن نہیں۔ بہتر ہے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں۔" جولی جھنجلا کر کمرے سے نکل آئی تھی لیکن سامنے کھڑی عائشہ کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔

"عا..... عائشہ.....! تم..... تم یہاں کیسے چلی آئیں.....؟ کیا ڈیوڈ کہیں چلا گیا.....؟" وہ تیزی سے چلتی اس کے قریب آگئی اور اس کا ہاتھ تھام کر پوچھنے لگی۔ یکدم ہی

اسے احساس ہوا کہ عائشہ کا ہاتھ بہت سرد ہو رہا ہے اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی ہے۔

"اوہ گاڈ......! چلو تم میرے ساتھ۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے اسے گھسیٹ دوسرے کمرے میں لے گئی تھی۔

"اب کیا ہوگا جولی......! تمہاری آنٹی تو مجھے اپنے گھر تک میں دیکھنا نہیں چاہتیں میرا اور ڈیوڈ کا زندگی بھر کا ساتھ کیسے قبول کریں گی۔"

وہ دھواں دھار رونے لگی تھی۔ جولی کو اطمینان سا محسوس ہوا۔ عائشہ کی بات ظاہر تھا کہ وہ آنٹی سنتھیا کی گفتگو کا بس آخری حصہ ہی سن سکی تھی۔

"رونے سے مسئلے حل نہیں ہوتے عائشہ......! جب تم نے اتنے خطرناک کھیل حصہ لیا ہے تو حوصلہ بھی کرو۔ میں ڈیوڈ کو آنٹی سنتھیا کے بارے میں بتاؤں گی پھر تم دونوں کر اس مسئلے کا حل نکال لینا۔ مجھ سے بھی جہاں تک اور جتنا ہو سکا۔ میں تمہارا ساتھ دوں" وہ اسے تسلیاں دے رہی تھی۔ آہستہ آہستہ عائشہ کے آنسو تھمنے لگے۔

☆☆☆

"ڈاکٹر صاحب......! سنا ہے حکومت توہین رسالتؐ کے قوانین میں تبدیلی کرن ارادہ کر رہی ہے۔ یہ تو جی خود کو کمزور ظاہر کرنے والی بات ہے۔ ہم کیا ڈرتے ہیں ان کا سے جو ان کی ناپاک زبانوں سے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کو سن کر بیٹھے ہیں۔" دین الٰہی بڑے جوش میں بول رہا تھا۔ ڈاکٹر ایثار اس کے انداز کو دیکھتے ہ مسکرائے۔

"یہ تو بتاؤ دین الٰہی! کہ تم توہین رسالتؐ سے آخر سمجھتے کیا ہو......؟"

"لو جی......! یہ بھی کوئی پوچھنے والی گل ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر کوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی گندی بات کہے گا تو اسے ہم آپ صلی اللہ علی کی توہین ہی سمجھیں گے۔" ڈاکٹر ایثار کے سوال نے اس کے جوش وخروش میں کچھ اور ا کیا۔

"اور یہ سوچ بڑی محدود ہے۔ کیا تمہارے ایمان کی بنیادوں میں یہ بات ش

نہیں کہ تم تمام انبیاء علیہ السلام اور تمام آسمانی کتابوں پر یقین رکھتے ہو؟"

"کیوں نہیں جی......! ہم تو آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی کو برحق ماننے والوں میں سے ہیں۔"

"تو پھر توہین رسالت کا تصور اتنا محدود کیوں......؟ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ہونے والا کوئی جملہ کیوں تمہیں توہین رسالتؐ لگتا ہے......؟ ہمیں تو ہر نبی کی عزت وحرمت کے لئے بلاتفریق اٹھ کھڑے ہونا چاہئے۔ وہ نبی عیسیٰ علیہ السلام ہوں یا موسیٰ علیہ السلام۔" وہ آہستہ آہستہ اس کا گھیراؤ کر رہے تھے۔

"ہاں جی ڈاکٹر صاحب......! بالکل، وقت پڑا تو ایسا ہی ہوگا۔" دین الٰہی نے دعویٰ کیا اور باقی سب لوگ بھی زور زور سے تائیدی انداز میں سر ہلانے لگے۔

"غلط......! تمہارا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ تمہارے سامنے دن رات انبیاء علیہم السلام کی شان میں گستاخی ہوتی ہے بلکہ اللہ کی شان میں گستاخی ہوتی ہے اور تم چپ رہتے ہو۔"

"وہ کیسے ڈاکٹر صاحب......!" وہ حیران ہوئے۔

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ یہود و نصاریٰ کس راہ پر چل رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی مرضی سے اپنے مذہب میں تبدیلیاں کر رکھی ہیں۔ کیا کسی نبی کی دی ہوئی تعلیمات کو اپنی مرضی سے تبدیل کر دینا اس کی توہین نہیں اور پھر اس سے بڑھ کر وہ اللہ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ کوئی عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہ السلام کو اس کی خدائی میں شریک کر کے اس کی وحدانیت کے تصور کو پارہ پارہ کرتا ہے تو کوئی حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتا ہے۔ بت پرستوں کا تو کوئی حساب کتاب ہی نہیں۔ وہ سینکڑوں ہزاروں بتوں کو اللہ کے اختیارات میں شامل کر کے مسلسل اس کی توہین کر رہے ہیں اور ہم ہیں کہ چپ بیٹھے ہیں۔ ہمارا یہ لولا لنگڑا ایمان اللہ کو مطلوب نہیں ہے۔ وہ ہم سے جو چاہتا ہے وہ ہم نے کبھی سمجھا ہی نہیں۔ ہم تو تقلید کی اندھی راہ پر چلنے والے وہ لوگ ہیں جن کی آنکھیں بصیرت سے اور کان سماعت سے محروم ہیں۔ ہم تو اپنے مسلمان ہونے کا حق ادا کرنا جانتے ہی نہیں۔" ان کا لہجہ آج بہت غیر

معمولی تھا۔ تمام حاضرین کو سانپ سونگھ گیا۔

"ہمیں کیا کرنا چاہئے کہ ہم اپنے مسلمان ہونے کا حق ادا کر سکیں.....؟" بالآ
شمس الدین نے ہی ہمت کر کے پوچھا۔

"پہلی بات تو آپ سب یہ سمجھ لیں کہ میں کوئی مفتی اور عالم دین نہیں ہوں۔
کہا حرف آخر نہیں ہو سکتا لیکن اللہ نے اپنی آخری کتاب قرآن مجید اور عقل و شعور کی دول
سے نواز کر جو احسان کیا ہے، اس کے سہارے آج میں وہ کہنے کے لائق ہوں جو شاید آ
لوگوں نے کبھی سنا نہ ہو لیکن اگر آپ قلب سلیم رکھتے ہیں تو آپ کے دل کو میری بات لگے
ضرور۔" وہ تمہید باندھ رہے تھے۔ تمام حاضرین سنبھل کر بیٹھ گئے۔ یقیناً آج کچھ مختلف
جانے والا تھا۔

"بات کو سمجھنے کے لئے ہمیں ذرا قرآن میں بیان کی گئی تاریخ کو کھنگالنا ہوگا۔ س
طٰہٰ کی آیت نمبر ۴۳ میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو حکم
ہے۔ "جاؤ تم فرعون کے پاس کیونکہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔" اور اس کے فوراً بعد اگلی ہی آ
میں ہدایت دی جاتی ہے۔ "اور کرنا تم دونوں اس سے بات نرمی سے۔ شاید کہ وہ نصیح
پکڑے یا ڈر جائے۔" اب ذرا غور کرو یہ ہدایت ہے فرعون کے لئے جو روئے زمین پر س
سے بڑا کافر ہے بلکہ انتہا تو یہ ہے کہ "خدا" ہونے کا دعویٰ کر کے براہ راست ربّ کائنا
سے اعلان جنگ کر رکھا ہے اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہے ہیں کہ اس سے نرمی
بات کی جائے۔ اس سے آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا جائزہ لو۔ مکہ کے تیرہ س
شدید مخالفت اور ظلم و ستم کے تھے لیکن وہاں تلوار نیام سے نہ نکلی۔ یہاں تک کہ جب طائ
والوں نے پتھر مار مار کر لہولہان کر دیا تب بھی انہیں بددعا تک نہ دی۔ صرف اس خیال سے
یہ لوگ نادان ہیں اور ایک دن حق کو قبول کر لیں گے۔ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں کے
تاج بادشاہ کی حیثیت اختیار کر لی لیکن تلوار ابھی بھی نیام میں ہی ہے۔ مکہ میں فاتح کی حیثیت
سے داخل ہوئے تو اس شان سے کہ تمام دشمنوں کے لئے معافی کا عام اعلان کر دیا۔ یہا
تک کہ پیارے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبا جانے والی ہندہ تک انتقامی کارروائی سے محف

رہی اور کیا اسی اعلیٰ ظرفی کا نتیجہ نہیں تھا کہ لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے۔ وہاں
اپنی ذات کی بلندی کے لئے تو کچھ مقصود تھا ہی نہیں۔ وہاں تو صرف ایک جذبہ تھا۔ اللہ کا ذکر
عام کرنا اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو راہ حق پر لانا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کیا تو انسانیت
کی فلاح و بہبود کے لئے لیکن آج جس طرح ردِعمل ہم ظاہر کرتے ہیں کیا اس میں فلاح کوئی
پہلو ہے؟ انتقامی کارروائیاں دشمنیوں کو جنم دیتی ہیں اور بامقصد جہاد انسانی بہبود کو لیکن افسوس
کہ آج ہم انتقام اور جہاد کا فرق ہی بھول چکے ہیں۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کفار کچھ بھی بکتے رہیں اور ہم چپ رہیں۔" کسی کی
غصیلی آواز ابھری۔

"نہیں.....! میں یہ نہیں کہنا چاہتا۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں اس کو سمجھنے کے لئے ایک
قصہ سنو۔ قیام پاکستان سے کئی سال قبل ایک شخص علم دین نے ایک ہندو رائٹر راج گوپال کو قتل
کر دیا۔ وجہ قتل راج گوپال کی کتاب "رنگیلا رسول" (نعوذ باللہ) تھی جس میں نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کی ذات اقدس پر رکیک الزامات لگائے گئے تھے۔ علم دین کے مقدمے کی پیروی
بیرسٹر محمد علی جناح (قائداعظم) نے کی لیکن وہ علم دین کو پھانسی کے پھندے تک جانے سے نہ
بچا پائے۔

اس مقدمے کے ساتھ ساتھ مسلمان ایک مقدمہ اور لڑ رہے تھے اور وہ تھا۔ راج
گوپال کی کتاب کو بجبر سرکار ضبط کرنے کا مطالبہ لیکن اس مقدمے میں بھی کامیابی ہوتی دکھائی
نہیں دے رہی تھی۔ بالآخر مسلم عوام کی درخواست پر بادشاہی مسجد کے امام Appeal
Hearing میں واحد نمائندہ بن کر قرآن پاک لے کر عدالت میں پہنچے اور فاضل ججوں سے
کہا۔ "مسلم قوم کے پاس خالق کائنات کی طرف سے دین کے ماخذ کی حیثیت سے صرف یہ
کتاب موجود ہے۔ اگر اس کتاب میں آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو داغدار کرنے
کے لئے کوئی ایک بات بھی ہے تو مجھے دکھایا جائے۔ ورنہ راج گوپال کی کتاب کو ضبط کر کے
اس پر پابندی لگانا چاہئے۔" اور امام بادشاہی مسجد کی اس حکیمانہ دلیل نے وہ کام کر دکھایا جو علم
دین کا "چھرا" نہ کر سکا۔ راج گوپال کی کتاب کو Banned کر دینے کا حکم عدالت سے

جاری کر دیا گیا۔

اب دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ علم دین کا کارنامہ زیادہ بڑا تھا یا امام بادشاہی مسجد کا۔ علم دین نے راج گوپال کو مار دیا لیکن اس کا اگلا ہوا زہر تو معاشرے میں تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اصل کارنامہ تو اس زہر کو پھیلنے سے روکنے کا تھا جو محض تدبیر اور حکمت کے سہارے انجام دیا گیا۔ بہرحال میں علم دین شہید کے عمل کو یکسر غلط قرار دینے کا کوئی فتویٰ نہیں دے رہا کیونکہ ایک فطری ری ایکشن تھا۔ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں، آج بھی لوگ اپنے پیاروں پر حرف آنے پر دشمن کو قتل کر ڈالتے ہیں لیکن بات صرف اتنی ہے کہ انسان کے پیش نظر انتقام سے بڑھ کر فلاح کا جذبہ ہونا چاہئے۔ جیسے چاند پر تھوکنے سے چاند کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ ایسے ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو داغدار کرنے کی کوئی کوشش بار آور نہیں ہو سکتی ان کی شخصیت تو اتنی مکمل اور شفاف ہے کہ مائیکل ہارٹ جو کہ خود ایک عیسائی ہے، جب دُنیا کی سو عظیم شخصیات کی فہرست مرتب کرنے بیٹھا تو نبی آخر الزماںؐ کو پہلا نمبر دینے یعنی دُنیا کی سب سے عظیم شخصیت تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔" وہ سانس لینے کے لئے ذرا دیر رُکے۔

"اگر ہمیں بحیثیت قوم خود کو منوانا ہے تو خود کو اندر سے تبدیل کر کے عمل کی راہ پر نکلنا ہوگا۔ سوچو تو آج ہماری راہیں کتنی آسان ہیں اور وہ کیسا دور ابتداء تھا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اشاعت دین کا کام کیا۔ آج ہمارے پاس پرنٹ میڈیا سے لے کر الیکٹرانک میڈیا تک ہر سہولت موجود ہے۔ ہم اگر اس طاقت کو استعمال کریں۔ دُنیا کو اسلام کی سچائی اور حقیقت بتائیں تو کیا یہود و نصاریٰ کی سازشوں کے نتیجے میں ہم پر دہشت گرد ہونے کا جو لیبل لگ گیا ہے۔ اس سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ آج ہمیں ہر محاذ پر لڑنا ہے۔ اگر افغانستان، کشمیر اور عراق میں کچھ لوگ جہاد بالسیف رکھے ہوئے ہیں تو بہت سے لوگ جہاد بالقلم کے ذریعے کفار کی پروپیگنڈا مہم کا خاتمہ کر سکتے ہیں اور جو یہ دونوں کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ان کے لئے جہاد بالمال کا راستہ کھلا ہے۔ دونوں بڑے محاذوں پر لڑنے والوں کی مالی امداد کر کے وہ بھی اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔"

تمام لوگوں پر ایک پرسوچ خاموشی طاری تھی۔ ڈاکٹر ایثار نے بھی اپنی گفتگو کو مزید آگے نہ بڑھایا۔ وہ جانتے تھے کہ جو کچھ کہہ چکے ہیں، اس پر غور کر کے اگر چند لوگ بھی عمل کی راہ پر چل نکلے تو ان کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

"شمس الدین.....! مجھے میرے کمرے تک پہنچا دو۔" داؤد رضا اب بیساکھی کے سہارے چلنے لگا تھا لیکن اس وقت اسے اپنے جسم میں ایسی ناتوانی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ خود سے چل کر جانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

☆☆☆

"عائشہ.....! نماز پڑھ لو بیٹا.....! وقت نکل رہا ہے۔"

امی اسے ٹوک کر کچن میں چلی گئیں لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلے بغیر سابقہ پوزیشن میں ہی بیٹھی رہی۔ آج پندرہ دن ہو گئے تھے جولی کالج سے غائب تھی۔ فون پر بھی عائشہ کا ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ کل بے حد پریشان ہو کر وہ ان کے گھر بھی جا پہنچی تھی لیکن گیٹ پر لگے تالے نے اس کا استقبال کیا تھا۔ اردگرد سے پوچھنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ جولی کا گھر جس پوش علاقے میں تھا، وہاں لوگوں کو ایک دوسرے کی خبر نہیں ہوتی۔ اس طرح اچانک ان لوگوں کا غائب ہو جانا اسے بے حد تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ اپنی اس پریشانی میں اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا لیکن وہ یہ سوچ کر کہ شاید جولی واپس آ گئی ہو، آج پھر کالج چلی گئی تھی اور اسے وہاں نہ پا کر اتنی شدید مایوسی کا شکار تھی کہ سارا دن اپنے مخصوص درخت کے نیچے سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔

آتے جاتے کئی کلاس فیلوز نے اسے مخاطب کیا تھا۔ کچھ نے اس سے جولی کی خیریت استفسار بھی کیا تھا لیکن خود اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ وہ ہر ایک کے سوال پر آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ سوال کرنے والی مایوس ہو کر از خود ہی وہاں سے چلی جاتی تھی۔ گھر آ کر بھی وہ اسی جامد کیفیت کا شکار تھی۔ دونوں پیر صوفے پر رکھے وہ بے حد خاموش بیٹھی تھی۔

"اتنی دیر سے فون کی بیل بج رہی ہے۔ تم سے یہ نہیں ہو رہا کہ فون ہی اُٹھا لو۔"

مسلسل بجتی ٹیلی فون کی بیل پر امی کچن سے نکلی تھیں اور اسے یوں اطمینان بیٹھا دیکھ کر جھنجلا گئی تھیں۔

"ایک تو آج صبح سے جانے کس کو تکلیف ہے، گھنٹیوں پر گھنٹیاں بجا رہا ہے منہ سے ایک لفظ نہیں پھوٹتا۔" ریسیور اُٹھانے پر جب دوسری طرف سے کسی نے بات کئے لائن کاٹ دی تو وہ مزید جھنجلا گئیں۔ البتہ عائشہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

"سی ایل آئی پر نمبر چیک نہیں کیا آپ نے......؟"

"کیا ہے لیکن ہر دفعہ الگ ہی نمبر ہوتا ہے اور وہ بھی میرے خیال میں کسی پی سی او وغیرہ کا۔" وہ اسے جواب دے کر واپس کچن میں چلی گئیں۔ عائشہ ٹکٹکی باندھ کر ٹیلی فون دیکھنے لگی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ہو نہ ہو یہ ڈیوڈ ہے جو اس سے بات کرنا چاہتا ہے اور پھر چند منٹ کے انتظار کے بعد اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔

"لمبی بات نہیں کروں گا، ایک ایڈریس بتا رہا ہوں کل صبح وہاں آ جانا۔" ساتھ اس نے ایک مشہور ہوٹل کا نام اور روم نمبر اسے بتا دیا تھا۔

عائشہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن ڈیوڈ نے اسے موقع ہی نہیں دیا فوراً لائن کاٹ دی۔

"کیا ہوا عائشہ......! کون تھا......؟" امی نے کچن سے جھانک کر پوچھا۔

"وہی آپ کا خاموش کالر۔" وہ جواب دے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دنوں سے چھائی ٹینشن کافی حد تک ختم ہو چکی تھی۔

☆☆☆

"کہاں غائب ہو گئے تھے......؟ میں پل پل مرتی رہی۔ کتنے فون کئے گھر کا تک لگا آئی۔ اب تو بس دیوانی ہو کر سڑکوں پر نکل پڑنے کی کسر رہ گئی تھی لیکن تمہیں میرا خیال نہیں آیا۔ اچھا تھا کچھ دن اور نہ آتے تو میری جگہ میری نعش سے ہی ملاقات ہوتی۔" وہ ڈیوڈ کو سامنے پا کر دیوانہ وار اس کے سینے پر مکے برساتے ہوئے کہہ رہی تھی اور پھر اس کے سینے پر سر رکھ کر ہی رونے لگی۔

"بس کرو عائشہ......! دیکھو اب تو میں آ گیا ہوں ناں......؟" وہ اس کے اس طرح دھاڑیں مار کر رونے پر بوکھلا گیا تھا۔

"اچھا......! دیکھو یہاں آرام سے بیٹھو پھر میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔" اس کے دونوں شانے تھام کر ڈیوڈ نے اسے بٹھایا اور پھر گلاس میں پانی بھر کر اسے تھمایا۔

"آئندہ مجھے اس طرح چھوڑ کر کبھی مت جانا۔ ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔" ایک گھونٹ پانی پی کر اس نے ڈیوڈ سے کہا تو وہ نظریں چرا گیا۔

"میں تمہیں چھوڑ کر نہیں گیا تھا بلکہ تمہیں ہمیشہ کے لئے پانے کی تدبیریں کر رہا تھا۔ یہ دیکھو کیا کر آیا ہوں میں تمہاری خاطر۔"

اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر عائشہ کی طرف بڑھایا۔ عائشہ یک ٹک اس کارڈ کو دیکھنے لگی۔ وہ شناختی کارڈ تھا جس پر تصویر تو بے شک ڈیوڈ کی لگی تھی لیکن نام اور مذہب کے خانے میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔

"تم نے یہ سب میری خاطر کیا......؟ اُف میرے خدا......!" خوشی سے عائشہ کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"ہاں......! لیکن میں اس سے زیادہ نہیں کر سکا۔ ممی کو تمہارے حق میں قائل کرنے کی میری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ اُلٹا وہ مجھ پر جولی سے شادی کے لئے دباؤ ڈال رہی ہیں۔ ممی نے ہماری خاطر اتنی قربانیاں دی ہیں کہ ان کی بات ٹال کر میں اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا ہوں۔ میرا دل دو خانوں میں بٹ چکا ہے۔ ایک طرف تمہاری محبت کھینچتی ہے تو دوسری طرف ممی اپنی قربانیوں کا صلہ مانگتی دکھائی دیتی ہیں۔" وہ بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"پھر...... پھر آپ نے کیا سوچا......؟" وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"میں نے جو کچھ سوچا ہے، اس پر میں اکیلا عمل نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے مجھے تمہارے ساتھ کی ضرورت ہو گی۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر عائشہ کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

"میرے پاس تمہارا ساتھ دینے کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں۔" عائشہ کو لگا کہ

وہ کوئی غیر معمولی بات کہنے جا رہا ہے اور اسے اس وقت عائشہ کی طرف سے یقین دہانی شدید ضرورت ہے۔

"تم جانتی ہو عائشہ.....! ہماری شادی پر نہ تمہارے گھر والے راضی ہوں گے میرے گھر والے۔ اس سلسلے میں ہمیں خود ہی کچھ کرنا ہوگا اور بہت جلد کیونکہ ممی سمجھ چکی ہیں میں تمہاری خاطر جولی سے شادی کرنے سے انکار کر رہا ہوں اور انہوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے ایک ہفتے کے اندر ان کی بات نہ مانی تو وہ تمہارے گھر والوں کو اس سارے معاملے سے خبردار کر دیں گی۔"

"کیا.....؟" عائشہ کا چہرہ خوف سے فق ہوگیا۔

"اور میں ان کی دھمکی کو صرف دھمکی سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ بہت ضد ہیں۔ اب یا تو میں ان کی بات مان لوں یا پھر ہم دونوں ہی اپنا گھر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر اپنی دُنیا بسا لیں۔ اب تم جو بھی فیصلہ کرو، مجھے منظور ہوگا۔"

وہ ہال اس کے کورٹ میں پھینک کر خود ایک طرف ہوگیا تھا اور عائشہ نے جدائی کے پچھلے پندرہ دن نہ گزارے ہوتے تو فیصلہ کرنے میں کچھ وقت ضرور لیتی۔ اس کٹ کر گزارے جانے والے وہ پندرہ دن جسم و جاں میں کانٹوں کی طرح چبھے تھے۔

"بس پھر ٹھیک ہے، کل شام چھ بجے تم میرے فون کا انتظار کرنا، آگے کیا کرنا میں تمہیں بتا دوں گا۔" اس کی رضامندی پا کر وہ کھل اُٹھا تھا۔

☆☆☆

ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کرتی وہ اپنی نئی دُنیا کی طرف گامزن تھی تنہا سفر کرنے کا اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا لیکن ڈیوڈ نے اسے بہت تسلی دی تھی۔

"تم بالکل فکر مت کرو۔ میں نے سارا انتظام بہت اچھی طرح کیا ہے۔ تمہیں کو پریشانی نہیں ہوگی۔ میں خود تمہارے ساتھ چلتا لیکن میرا یہاں رہنا بھی ضروری ہے۔ تمہارے غائب ہونے پر تمہارے گھر والے تمہیں ڈھونڈنے نکلیں گے تو کئی لوگ ایسے مل جائیں گے جنہوں نے اکثر تمہیں میری گاڑی میں کالج سے آتے جاتے دیکھا ہوگا۔ سب کا شک مجھ

پائے گا اور میں غائب ہوگیا تو پولیس ممی اور جولی کو پریشان کرے گی۔ اس لئے میرا یہاں رہ کر سب کو یہ یقین دلانا کہ تمہارے غائب ہونے سے میرا تعلق نہیں، بہت ضروری ہے۔ آج میں بونیک پر اور گھر پر وقت گزاروں گا تو بہت سے لوگ اس بات کی گواہی دیں گے پھر بس ایسے ہی ایک دو دن میں حالات سازگار ہوئے، میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تم آرام سے اپنے کمرے میں رہنا۔ بڑے ہوٹلوں میں یوں بھی کوئی زیادہ سن گن لینے کی کوشش نہیں کرتا۔"

وہ ڈیوڈ کی ہدایت پر کالج سے ٹیکسی میں بیٹھ کر کینٹ اسٹیشن پہنچی تھی۔ کالج میں ہونے والے کسی فنکشن کا بہانہ بنا کر اس نے یونیفارم کے بجائے جارجٹ کا ایک پلین سوٹ پہن لیا تھا۔ بیگ میں کتابوں کے بجائے اس کے دو جوڑے رکھے تھے۔ رقم یا زیورات رکھنے سے اسے ڈیوڈ نے منع کر دیا تھا۔

"میں تمہارے ماں باپ کی سب سے قیمتی چیز چرا رہا ہوں۔ میرے لئے یہی جرم کافی ہے۔ چیزوں کی تم فکر مت کرنا۔ وہ تو میں تمہیں خود بھی دلا سکتا ہوں۔"

ڈیوڈ کی اس بات نے عائشہ کو بے حد خوش کیا تھا۔ وہ ایک ذمہ دار فرد کی طرح اس کی ذمہ داریاں اُٹھانا چاہتا تھا اور عائشہ اس گھر کے تصور میں کھو گئی تھی جسے وہ اور ڈیوڈ مل کر بناتے۔ پیچھے چھوڑ آنے والے گھر کا خیال اس پل نہ جانے کیوں اس کے دل سے مٹ گیا تھا۔

☆☆☆

"آپ کو اس قدر پسینہ کیوں آ رہا ہے داؤد صاحب.....! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے.....؟"

داؤد رضا کو اس کے بیڈ پر لٹاتا شمس الدین اس کی حالت پر تشویش کا اظہار کرنے لگا لیکن داؤد رضا میں جواب دینے کا یارانہ تھا۔ آنکھوں پر بازو رکھ کر خاموش پڑا رہا۔

"میں ڈاکٹر صاحب کو بلاتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

ڈاکٹر ایثار جو محفل برخاست ہونے کے بعد لوگوں کو رُخصت کر رہے تھے، شمس الدین کی اطلاع پر فوراً ہی اس کے کمرے کی طرف بڑھے لیکن پھر انہیں دروازے پر ہی ٹھٹک

کر رُک جانا پڑا۔ داؤد رضا کے رونے کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ وہ بالکل بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔

''تم جاؤ، میں دیکھتا ہوں۔'' شمس الدین سے کہہ کر وہ کمرے میں داخل ہو گئے۔

''داؤد.....! کیا بات ہے.....؟'' اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے نرم آواز میں پوچھا۔

''وہ مجھے بددُعائیں دے رہی ہے۔ اس سے کہیں ایسا نہ کرے۔ غلطی ہو گئی تھی غصے میں، انتقام میں اندھا ہو رہا تھا لیکن میں برا شخص نہیں ہوں۔ میں نے کوشش کی تھی کہ اسے سمجھا لوں لیکن قسمت نے دھوکا دے دیا۔'' وہ بے ربط بول رہا تھا۔

''داؤد.....! تم کس کی بات کر رہے ہو.....؟ مجھے بتاؤ۔ کیا پریشانی ہے تمہیں؟'' ڈاکٹر ایثار نے جھنجھوڑ کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔

''نہیں.....! میں نہیں بتاؤں گا۔ کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔ ورنہ اس کی طرح آپ بھی مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔'' وہ چیخا۔

''شمس الدین.....! میرا میڈیکل باکس لے کر آؤ۔'' انہوں نے آواز لگائی۔ کچھ دیر بعد وہ سکون آور انجکشن کے زیر اثر گہری نیند سو رہا تھا۔

''اس نوجوان کی زندگی میں کوئی راز ہے۔ اب تک میں خاموش تھا لیکن اب اس سے ضرور وہ سوالات کروں گا جو اول روز سے مجھے اُلجھا رہے ہیں کیونکہ مجھے لگتا ہے صرف یہ شخص ہی نہیں کہیں کوئی اور بھی ہے جو تکلیف میں مبتلا ہے۔''

اس کے خوبصورت چہرے پر نظر جمائے ڈاکٹر ایثار سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

''وہ صرف اٹھارہ سال کا تھا۔ مجھ سے پورے چھ سال چھوٹا لیکن میرا سب سے بہترین دوست۔ مجھ میں اور اس میں بھائی ہونے کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ وہ سراپا پرجوش، قدرے غصیلا اور زندگی سے بھرپور لڑکا تھا۔ میری مذہب میں دلچسپی بہت سرسری لیکن وہ ہر سنڈے باقاعدگی سے ممی کے ساتھ چرچ جاتا تھا۔ میں زیادہ دوست بنانے کا عا

نہیں تھا لیکن اس کے ڈھیر سارے دوست تھے لیکن وہ دوست ہمیشہ اپنے ہم مذہب لڑکوں کو بناتا تھا۔ اس کے مزاج میں تھوڑی سی شدت پسندی تھی۔ وہ جب صرف دو سال کا تھا تو پاپا کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ اسے اس محرومی کا احساس نہ دلانے کے لئے میں نے اور ممی نے ضرورت سے زیادہ محبتیں اس پر لٹائیں۔ ہماری محبتوں نے اسے بہت نازک مزاج بنا دیا تھا۔ خلافِ مزاج کسی بات کو برداشت کرنا اس کے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔

اور شاید یہ اس نازک مزاجی کا ہی سبب تھا کہ اس کا آئے دن کسی نہ کسی سے جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ ہمیں بہت بار اس کے جھگڑوں کو نمٹانا پڑا۔ میں اور ممی اسے سمجھاتے رہتے تھے لیکن وہ کبھی ہماری بات نہ سمجھا اور اس کی یہ جذباتیت آخرکار اسے ہم سے جدا کر گئی۔''

☆☆☆

''چلو بھئی.....! سب لوگ ذرا جلدی جلدی اپنی سیٹیں خالی کر دو اور دیکھو کنجوسی بالکل نہیں چلے گی۔''

آنرز سال اول بائٹی گروپ کی کلاسز کا آغاز ہوئے آج دوسرا ہی دن تھا۔ لہٰذا فری پیریڈ میں طلباء آپس میں تعارف کے مراحل طے کرنے اور ہلکی پھلکی گپ شپ لگانے میں مصروف تھے۔ مائیکل خوش گپیاں کرتے ان طلباء و طالبات سے بے نیاز اپنی سیٹ پر بیٹھا نوٹ بک میں کچھ نوٹ کرنے میں مصروف تھا۔ کلاس میں داخل ہونے والے پانچ چھ لڑکوں کے اس گروپ اور ان میں سے ایک لڑکے کے کہے گئے اعلان پر بے نیازی سے اپنے سابقہ کام میں مصروف رہا۔ البتہ اس کے کان پوری طرح کھلے تھے۔

''کل ہی فائنل ایر والے ہمیں فرسٹ ایئر فول بنا کر لوٹ چکے ہیں۔ اب آپ لوگ کس سلسلے میں سیٹیں خالی کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔'' کلاس میں سب سے زیادہ چہکنے والی لڑکی نے لڑکوں کے اس گروپ سے پوچھا۔

''ہم کسی کو بے وقوف بنانے نہیں آئے۔ آپ نے دیکھا ہوگا ڈپارٹمنٹ میں اور اس کے علاوہ بھی بہت ساری جگہوں پر اس مہینے کی اٹھارہ تاریخ کو ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے سلسلے میں ہونے والے جلسے کے بینرز لگے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ اسی سلسلے میں آپ

سے مالی تعاون چاہتے ہیں۔"

ایک لڑکے نے شائستگی سے بتاتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑے دو لڑکوں کو اشارہ کیا وہ طلباء کے درمیان پہنچ کر ان سے چندے کی رقم وصول کرنے لگے۔

"چلئے بھئی پڑھا کو صاحب.....! پہلے ذرا اپنی جیب سے کچھ ادائیگی کر دیجئے بے شک دوبارہ اپنی کتابی دُنیا میں گم ہو جایئے گا۔" مائیکل کے پاس پہنچ کر ان میں سے لڑکے نے اسے مخاطب کیا۔

"سوری.....! میرے پاس فالتو رقم نہیں ہے۔" اس کا لہجہ بہت خراب تھا۔

"ارے یار.....! یہ تو ثواب کا کام ہے۔ اس میں فالتو کا کیا سوال.....؟" دوسرے لڑکے نے اسے سمجھایا۔

"تمہارے لئے ہوگا ثواب کا کام۔ میرے لئے تو یہ صرف تم لوگوں کی تعریفوں کا پروگرام ہے۔ تم کیا بتاؤ گے وہاں جلسے میں اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سیرت کے بارے میں۔ تو مجھ سے سنو کہ....."

مائیکل کی زبان نے زہر اُگلنا شروع کر دیا تھا۔ حدید احسان جو چندہ جمع کرنے والے لڑکوں میں سے ایک تھا، مائیکل کی اس بدزبانی پر شدید مشتعل ہو گیا۔ قریب پڑی ہوئی کرسی اُٹھا کر اس نے مائیکل کے سر پر دے ماری۔ لکڑی کی مضبوط کرسی سے لگنے والی یہ ضرب بے حد کاری تھی۔ مائیکل کے سر سے خون کا فوارہ بہہ نکلا اور وہ فوری طور پر بے ہوش ہو گیا لیکن حدید احسان کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے بیہوش وجود پر پیر سے مسلسل ٹھوکریں برسا رہا تھا۔ اردگرد موجود طلباء و طالبات جو اس پوزیشن پر کچھ دیر کے لئے دم بخود رہ گئے تھے، وہ قابو کرنے لگے۔ ہنگامے نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ انتظامیہ تک بھی خبر پہنچ گئی اور انہوں نے حالات پر قابو پا کر مائیکل کو ہاسپٹل شفٹ کر دیا۔

☆☆☆

"دو دن کومہ میں پڑا رہا تھا وہ۔ سر پر لگنے والی چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ پھر اس کی دُنیا میں لوٹ کر آ ہی نہ سکا۔ آئی سی یو کے سامنے اس کا ایک ایک سانس شمار کرتے

ہوئے ممی نے اور جولی نے جو اذیت اُٹھائی اس کا اندازہ کوئی اور شخص نہیں کر سکتا اور جب اس کا بے جان وجود ہمارے سپرد کیا گیا تھا تو دلوں پر کیسی قیامت گزری تھی۔ وہ بھی صرف ہم لوگ ہی جانتے ہیں۔ ممی اور جولی سراپا آنسو بن گئی تھیں اور میں..... میرے اندر تو انگارے دہک رہے تھے۔ میں نہیں جانتا چاہتا تھا کہ میرے بھائی نے کتنا بڑا جرم کیا ہے۔ مجھے اس کی حرکت کی سنگینی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ مجھے تو صرف ایک بات کی خبر تھی کہ میرا وہ چھوٹا سا بھائی جسے میں نے اُنگلی تھام کر چلنا سکھایا تھا اور آج میرے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کے لائق ہو چکا تھا، اچانک ہی میری ہتھیلیوں سے پھسل گیا۔ وہ شخص جو مجھ سے میرے بھائی کو جدا کرنے کا سبب بنا تھا، میں اس سے شدید نفرت محسوس کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اسے اس جرم کی سزا دی جائے لیکن وہ تو میرے بھائی کو مار کر اپنی قوم کا ہیرو بن گیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں ٹھان لی تھی کہ میں اس شخص کو زندہ نہیں چھوڑوں گا لیکن اس کے گھر والے بہت ہوشیار نکلے۔ میرے سنبھل کر وار کرنے سے پہلے ہی انہوں نے اسے ملک سے باہر بھیج دیا اور پھر میرے ذہن میں انتقام کا ایک اُچھوتا خیال آیا۔ میں نے اپنے اس خیال میں جولی کو شامل کر لیا۔ جولی جو مائیکل کی منگیتر تھی، میرا ساتھ دینے کے لئے راضی ہو گئی۔ ہم دونوں مل کر حدید احسان کو ایسا زخم دینے والے تھے جو ہماری طرح اسے بھی زندگی بھر تڑپاتا۔"

☆☆☆

"ڈیر عائشہ.....!

جب تمہیں میرا یہ خط ملے گا اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی لیکن میں نے اس وقت کو دیکھنے کے لئے بہت طویل صبر کیا ہے۔ ہاتھ کے بدلے ہاتھ، جان کے بدلے جان، یہی اُصول ہے نا تمہارے مذہب کا۔ میں نے بھی اسی اُصول کو اپنایا ہے۔ جدائی کے بدلے جدائی اور تڑپ کے بدلے تڑپ کا تحفہ تمہارے اس ہیرو بھائی اور ماں باپ کے لئے یقیناً بہت معمولی ہوگا۔ میں نے اور میری ماں نے تمہارے بھائی کی وجہ سے مائیکل کو ہمیشہ کے لئے کھویا تھا اور اب تمہارے گھر والے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو چکے ہیں۔ جو تڑپ ہماری زندگیوں کا حصہ ہے، وہ اب تمہارے گھر والوں کا بھی زندگی بھر ساتھ دے گی اور جو بدنامی وہ لوگ

اُٹھائیں گے، وہ میری طرف سے اصل کے ساتھ سود کی ادائیگی ہے۔

تم یقیناً سمجھ گئی ہوگی کہ سارا قصہ کیا ہے۔ یہ بدلہ ہے میرے بھائی کے خون کا کے لئے میں نے بہت صبر سے کام لیا۔ تمہارے بارے میں معلومات حاصل کر کے جو تک پہنچایا اور پھر تمہارے دل میں اپنے لئے جگہ بنانا کچھ آسان نہیں تھا لیکن میں نے بھائی کی خاطر یہ سب کچھ کیا۔ میں تمہیں محبت کے فریب میں جکڑ کر اس مقام تک لے آ تمہارے پاس میری کہی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں بہرحال تمہاری نادانی اور کم عمری میرے مشن میں بہت کام آئی۔ تمہارے تعاون کے بغیر کیا کر سکتا تھا۔ سو اس کے لئے اسپیشل تھینکس۔

ہوٹل کے جس روم میں تم ٹھہری ہو اس کی بکنگ صرف ایک رات کے لئے کر گئی ہے۔ میرا خط پڑھنے کے بعد اسے فوراً چھوڑ دینا، ورنہ تو خیر ہوٹل والے خود ہی دھکے کر تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔ ویسے دھکے تو اب تمہاری قسمت میں لکھ دیئے گئے ہ پلٹ کر اپنے گھر جانا چاہو گی تو وہاں بھی تمہیں کوئی قبول کرنے والا نہ ہوگا۔ آخر کو بڑے غیر مند لوگ ہیں تمہارے گھر والے۔

اور ہاں.....! ایک اطلاع اور، میں یہاں موجود اپنا گھر اور یونیک دونوں سیل چکا ہوں۔ جولی اور ممی پندرہ دن پہلے ہی جولی کے ماما کے پاس لندن شفٹ ہو چکے ہیں۔ صرف تمہاری کہانی کا دی اینڈ کرنے کے لئے رُکا ہوا تھا۔ جلد روانہ ہو جاؤں گا۔ میرے خ میں تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہوگا۔ سو گڈ بائے.....!"

ڈیوڈ

عائشہ احسان آنکھیں پھاڑے اس خط کو دیکھ رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس روم میں ناشتہ سرو کر کے جانے والا ویٹر ناشتے کے ساتھ اسے ایک لفافہ دے گیا تھا۔ تجس کے سبب اس نے ناشتہ شروع کرنے کے بجائے لفافے کو کھول کر اس میں موجود تحریر کو پڑھ شروع کر دیا۔ خوابوں کے سنگ بلندیوں کی طرف پرواز کرتی عائشہ یکدم زمین پر آگری تھی۔ چھوڑ کر چلے جانے والوں کے آخری خط پیچھے رہ جانے والوں پر کیسا ستم ڈھا

ں۔ اس گھڑی وہ بہت اچھی طرح جان چکی تھی۔ ایک خط اس نے بھی تو اپنے پیچھے اپنے گھر لوں کے لئے چھوڑا تھا۔ کیا فرق تھا اس میں اور ڈیوڈ میں۔ وہ اگر انتقام کی آگ میں جل رہا تھا تو عائشہ نے بھی ایسے ہی کسی جذبے کے تحت ماں باپ کی عزت کو رول دیا تھا۔ ڈیوڈ کے ساتھ تعلق جوڑنے کے پیچھے امی اور بابا کی وہ گفتگو بھی تھی جو ایک روز اتفاقاً اس نے سن لی تھی۔ بابا امی سے کہہ رہے تھے۔

"نفیسہ.....! عائشہ کے لئے کوئی اچھا رشتہ دیکھو۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے انٹر کرتے ہی اس کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔"

"لیکن آپ نے اسے یونیورسٹی تک بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور اب اچانک شادی کا ذکر نکال بیٹھے ہیں۔" امی حیران تھیں۔

"ضروری نہیں جو کہا جائے اس پر عمل بھی لازمی ہو۔ میں نے اس کے یونیورسٹی جانے کا ذکر صرف اس لئے کیا تھا کہ میں اس کے تیور دیکھ رہا تھا۔ اگر میں مصلحتاً جھوٹ نہ بولتا تو وہ بغاوت کی روش پر چل پڑتی۔ آج کل اگر لڑکیوں کی پڑھائی لکھائی پر اتنا زور نہ دیا جا رہا ہوتا تو میں میٹرک کے بعد ہی اسے گھر بٹھا لیتا۔ اب بھی سوچا تھا کہ بی اے تو کروا ہی دوں گا لیکن حدید کے واقعہ نے مجھے خوفزدہ کر دیا ہے۔ براوقت کہہ کر نہیں آتا۔ روز گھر سے نکلتی ہے۔ کھلے دین میں ہی آتی جاتی ہے لیکن خوف تو رہتا ہے۔ لڑکی ذات ہے کہیں کسی کی باتوں میں آ گئی تو میری عزت خاک میں ملا دے گی۔"

وہ کہہ رہے تھے اور عائشہ اس قدر بے اعتباری پر دل ہی دل میں ان سے خفا ہو گئی تھی۔ تب ہی تو جب ڈیوڈ اس کی طرف بڑھا تو اس نے زیادہ مزاحمت نہ کی۔

"میں آخر اپنے دل کو ماروں تو کیوں ماروں۔ میرے والدین کون سا میرے ساتھ پیار سے گیم کھیل رہے ہیں جو میں انہیں دھوکا دیتے ہوئے پچھتاؤں۔"

اس کی یہ سوچ چادر اور چار دیواری کے تحفظ سے نکال کر آج اسے بالکل کھلے آسمان تلے لے آئی تھی۔

☆☆☆

عائشہ کو ٹرین میں بٹھا کر میں سیدھا اس ہوٹل پہنچ گیا جہاں میں نے کچھ دنوں کے لئے ایک کمرہ بک کروا رکھا تھا۔ گھر تو میں بیچ ہی چکا تھا۔ نئے مالکوں سے قبضہ دینے کے جو بیس دن کی مہلت لی تھی، وہ بھی کل ختم ہو چکی تھی۔ یقیناً پراپرٹی ڈیلر نے مکان کی چابی ان لوگوں کے حوالے کر کے انہیں مکان کا قبضہ دے دیا ہوگا۔ میں نے ان لوگوں پر ظاہر نہ کیا تھا کہ میں اپنی فیملی سمیت باہر شفٹ ہو رہا ہوں اور یہ بیچ بھی تھا لیکن میں اپنی آخری چال چلنے کے باوجود صرف اس لئے یہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ اپنے دشمنوں کی تباہی و بربادی کا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ تماشا اتنی جلدی شروع نہ ہوگا۔ کم از کم عائشہ کے کالج ٹائم ختم ہونے تک۔ یہ بات مجھے معلوم تھی سو میں لمبی تان کر سو گیا۔ شام میں میں نہا دھو کر ہوٹل سے باہر نکلا اور ایک پی سی او سے عائشہ کے گھر کا نمبر ملایا۔

''ہیلو جی.....! مجھے احسان صاحب سے بات کرنی ہے۔'' دوسری طرف سے ریسیو کئے جانے پر میں نے فرمائش کی تھی۔

''آپ کون صاحب بات کر رہے ہیں.....؟ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے ہے کہ احسان صاحب کو بہت سیریس ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اس وقت وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔ ان کی بیگم بھی ان کے ساتھ ہی ہیں۔''

مجھے اطلاع فراہم کرنے والی ہستی پتا نہیں کون تھی لیکن میرے دل کو خوشی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ میں فون بند کر کے بڑے خوشگوار موڈ میں شہر میں آوارہ گردی کرنے لگا۔ الحال میں نے اپنی گاڑی فروخت نہ کی تھی۔

رات دس بجے کے بعد میں اپنے ہوٹل واپس پہنچا تھا۔ کئی گھنٹوں کی آوارہ گردی کے بعد میرا خیال تھا کہ میں بستر پر لیٹتے ہی سو جاؤں گا لیکن یکدم ہی بند آنکھوں کے پیچھے چلی آئی۔

سیاہ چادر کے ہالے میں، اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی۔ صبح میں نے اسے ٹرین میں بٹھایا تھا تو ان آنکھوں میں خواب تھے لیکن اب میں وہاں ایک

''میرا کیا قصور تھا.....؟'' وہ پوچھ رہی تھی اور میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میں بیزاری سے اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

کتنی معصوم اور بھولی بھالی تھی وہ جو اپنے گرد بنے جانے والے جال میں خوشی خوشی چلی گئی۔ میں نے اور جولی نے مل کر اسے باقاعدہ ٹریپ کیا ہے۔ وہ کبھی ہی نہیں اور بری جھوٹی محبت پر یقین کر بیٹھی۔ میں نے سول میرج کے بہانے اسے گھر تک چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور اس نے یہ تک نہ سوچا کہ اس جیسی قانوناً نابالغ لڑکی سے سول میرج کیونکر کی جا سکے گی۔

میں نے ٹرپ کر لاہور کے اس ہوٹل کا نمبر ملایا جہاں وہ ٹھہری ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اگر میں ہوٹل کی انتظامیہ کو ناشتے کے ساتھ اپنے جس خط کو اس تک پہنچانے کی ہدایت کر کے آیا ہوں کم از کم اسے روک دوں۔ آگے کیا کیا جائے یہ بعد میں بھی سوچا جا سکتا تھا لیکن فون سے کئی بار کوشش کے باوجود میں ہوٹل کے نمبر پر کوئیکٹ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کوشش میں ناکام ہو کر میں نے خود لاہور جانے کا فیصلہ کیا۔ پتہ نہیں کیوں لیکن میں چاہتا تھا کہ عائشہ کو اب کوئی اور تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔

اس وقت ٹرین یا جہاز سے جانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ سو میں نے اپنی گاڑی میں بائی روڈ لاہور جانے کا فیصلہ کیا۔ ڈرائیونگ کے دوران وہ مسلسل میرے خیال کے پردے پر اُبھرتی رہی۔ کبھی جولی کے کمرے میں بیٹھ کر اپنی مدھر آواز کا جادو جگاتی تو کبھی میرے غور سے دیکھنے پر جھینپ کر شرماتی۔ میری چند دن کی جدائی پر کتنا خفا ہوئی تھی وہ اور پھر مجھے ہی سینے پر سر رکھ کر اس نے ڈھیروں آنسو بہائے تھے۔ ان آنسوؤں کی نمی آج میں اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔ مجھ پر ایک دم ہی انکشاف ہوا تھا کہ اسے محبت کا دھوکا دیتے دیتے بالآخر میں خود اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ میں گاڑی کی رفتار بڑھاتا گیا۔ لاہور پہنچ کر میں کیا کرتا، مجھے نہیں معلوم تھا لیکن میں پھر بھی جلد از جلد اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔

پورے انہماک سے ڈرائیو کرتے کرتے مجھے احساس ہوا کہ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے لیکن میں نے اپنی حالت کو نظر انداز کر کے ڈرائیونگ جاری رکھی۔ مزید ایک گھنٹہ گزرا

تو مجھ پر شدید کپکپی طاری ہونے لگی۔ مجھے بہت تیز بخار ہو چکا تھا اور اس کی شدت میں اضا
ہی ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر مجھے ہار ماننا ہی پڑی کہ ہائے وے پر مزید ڈرائیو کرنا میرے بس
بات نہیں۔ اس حقیقت کا ادراک ہونے پر میں نے قریبی شہر میں ٹھہرنے کا ارادہ کر کے ا
گاڑی کو آپ کے شہر کی طرف آنے والے راستے پر ڈال دیا لیکن بہت جلد میری ہمت جوا
دے گئی۔ میرا سر اتنی شدت سے چکرا رہا تھا کہ گاڑی کو قابو میں رکھنا میرے بس میں نہ رہا
پھر وہ ایکسیڈنٹ ہو گیا جو مجھے آپ تک لانے کا سبب بنا۔"

وہ ساری داستان سنا کر چپ ہو گیا اور ڈاکٹر ایثار کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں
اس کی پوری بات نہایت خاموشی سے بنا کوئی خلل دیئے بڑی توجہ سے سنی تھی اور اب گ
گہرے تفکر میں مبتلا تھے۔

"میں جانتا ہوں آپ کو یہ جان کر دُکھ ہوا ہوگا کہ میں داؤد رضا نہیں بلکہ ڈ
کلارک ہوں۔ آپ نے مجھے اپنے گھر پناہ دی اور میں اتنے دن مسلسل آپ کو دھوکا دیتا رہا

"تم ڈیوڈ ہو، مجھے بے شک یہ نہیں معلوم تھا لیکن تم داؤد نہیں، میں یہ بات اول
سے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" پشیمانی کا اظہار کرتا ڈیوڈ ڈاکٹر ایثار کی اس بات پر چونکا
ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں ڈاکٹر ہوں تمہارا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے تمہارے زخمی وجود کی رفوگری
ہے۔ تمہارے جسم کا کون سا حصہ مجھ سے پوشیدہ رہا تھا جو میں یہ نہ جان پاتا کہ تم چاہے کچھ
ہو لیکن مسلمان ہرگز نہیں۔" وہ یکدم ہی سمجھ گیا کہ ڈاکٹر ایثار کا اشارہ کس طرف ہے۔

"اور پھر بھی آپ نے مجھے پناہ دی۔" وہ حیران تھا۔

"میں نے شاید پہلے بھی بتایا تھا کہ میرے لئے انسانیت کی اہمیت سب سے
ہے۔"

"آپ جیسے عظیم انسان سے نظر ملانے کے لائق نہیں ہوں میں۔ یقیناً آ
میرے وجود سے نفرت محسوس ہو رہی ہوگی لیکن یقین کریں میں برا شخص نہیں تھا۔ میں تو
ہمیشہ سے "جیو اور جینے دو" پر یقین رکھتا تھا لیکن مائیکل کے ساتھ ہونے والے حادثے

اندر کے حیوان کو جگا دیا۔ انتقام کی راہ پر چلتا میں کیا کچھ کرتا چلا گیا، مجھے معلوم نہ ہو سکا
اور جب احساس ہوا تو تقدیر نے دھوکا دے کر بے بس کر دیا۔" اس کی آنکھوں میں نمی اُمڈ آئی
تھی۔

"میں تمہیں برا سمجھتا ہوں، اس سوچ کو اپنے ذہن سے نکال دو کیونکہ تمہارے اندر
کے اچھے انسان کو میری تجربہ کار آنکھیں بہت پہلے دیکھ چکی ہیں۔ اس اچھے انسان کو تباہ کرنے
کی جو غلطی تم نے کی ہے اگر اس کی تلافی کی کوشش کرو تو شاید اب بھی بہت کچھ بہتر ہو
جائے۔"

"تلافی کی تو ایک ہی صورت ہے کہ کسی طرح عائشہ میرے سامنے آ جائے اور میں
اس سے کئے ہر جھوٹے وعدے کو سچ کر دکھاؤں لیکن میں اسے کیسے ڈھونڈوں.....؟ لاہور جا
کر اسے ڈھونڈنا تو دور کی بات ہے میں تو ابھی اس گھر میں بھی بغیر سہارے اِدھر سے اُدھر نہیں
آ جا سکتا۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"تم مجھے ہوٹل کا نام اور فون نمبر وغیرہ بتاؤ۔ میں اپنے طور پر معلومات حاصل
کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" ڈاکٹر ایثار نے آفر کی۔

"کوئی فائدہ نہیں اس کا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنے ہوش میں آنے کے بعد
آپ سے کہیں فون کرنے کی فرمائش کی تھی۔ وہ کال میں نے اسی ہوٹل میں عائشہ کے بارے
میں معلومات حاصل کرنے کے لئے کی تھی اور مجھے وہاں سے بتایا گیا تھا کہ وہ اسی روز صبح
وہاں سے روانہ ہو گئی تھی جس روز اسے میرا خط پہنچایا گیا تھا۔"

"اس کے گھر رابطہ کر کے دیکھتے ہیں۔ شاید وہ واپس اپنے گھر چلی گئی ہو۔ ماں
باپ کتنے ہی سخت گیر کیوں نہ ہوں اپنی اولاد کو معاف کر ہی دیتے ہیں۔" ڈاکٹر ایثار نے خیال
ظاہر کیا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"مجھے اس کے گھر کا ٹیلی فون نمبر اچھی طرح یاد ہے۔ آپ وہاں بات کر کے دیکھ
لیں۔" اس کا جوش و خروش دیکھتے ہوئے ڈاکٹر ایثار نے فوراً ہی ٹیلی فون سیٹ وہاں منگوا کر اس
کا ہوا نمبر ڈائل کیا۔

"کیا ہوا......؟" کچھ دیر کی گفتگو کے بعد انہوں نے فون بند کیا تو ان کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے دوسری طرف کی بات کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتا وہ فوراً ہی پوچھ بیٹھا۔

"عائشہ وہاں نہیں پہنچی بلکہ اصل بات یہ ہے کہ وہاں اب کچھ بھی نہیں بچا۔ عائشہ کے گھر سے غائب ہونے والے دن اس کے والد کو جو ہارٹ اٹیک ہوا تھا، وہ جان لیوا ثابت ہوا۔ پے در پے صدموں نے عائشہ کی امی کا ذہنی توازن خراب کر دیا۔ آج کل وہ ایک مینٹل ہاسپٹل میں ہیں۔ اپنے گھر ہونے والے اتنے حادثات کی خبر سن کر بھی حدید احسان واپس وطن نہیں لوٹا کیونکہ وہ وہاں شادی کر چکا ہے اور یہاں واپس آ کر کسی بدنامی کا حصہ دار نہیں بننا چاہتا۔ مکان اس نے ایک عزیز کی نگرانی میں دے رکھا ہے، جنہوں نے اسے کرائے پر اٹھا دیا ہے۔ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حدید کی ہدایت پر اس کی والدہ کے علاج معالجے کے لئے مختص کر دی ہے۔ یہ ساری معلومات مجھے جن صاحب سے حاصل ہوئی ہیں، وہ کرایہ دار ہیں۔" جو اس نے چاہا تھا عائشہ کے خاندان کے ساتھ ویسا ہی ہوا تھا لیکن یہ سب جان کر خوش ہونے کے بجائے اس کی اذیت میں اضافہ دو چند ہو گیا تھا۔

☆☆☆

چہرے پر آنسوؤں نے لکھی ہیں کہانیاں
آئینہ دیکھنے کا مجھے حوصلہ نہیں

کچھ کہانیاں انسانی ذہن تخلیق کرتا ہے اور پھر اپنی تخلیق کردہ کہانی پر اپنی مرضی کے کرداروں کو پرفارم کرتا دیکھ کر، اپنی کامیابی کا جشن بھی مناتا ہے لیکن اس وقت ایک بات اسے بھول جاتی ہے، اسے یاد نہیں رہتا کہ اس سے بڑھ کر "وقت" کہانی تخلیق کرنے کا فن جانتا ہے اور جو لوگ وقت کی لکھی کہانی کی زد میں آتے ہیں۔ ان کے اندر آئینہ دیکھنے کا حوصلہ نہیں رہتا۔ مکافاتِ عمل کا مرحلہ بڑا سخت ہوتا ہے۔ ڈیوڈ کی زندگی میں بھی یہ مرحلہ آ چکا تھا۔

"تم لندن کال کر کے اپنی ممی کو اپنی خیریت کی اطلاع دو۔" ڈاکٹر ایثار کو جب پتہ چلا کہ حادثہ کے بعد سے ایک بار بھی اس نے اپنی ممی سے کونٹیکٹ نہیں کیا تو انہوں نے سختی سے ہدایت کی۔

"میں نے اپنے دل میں عہد کر رکھا ہے کہ جب تک عائشہ کو نہ ڈھونڈ نکالوں گا، خود بھی اپنے پیاروں کے لئے تڑپوں گا۔ میں اس کا درد اپنے دل میں اسی شدت سے محسوس کرنا چاہتا ہوں، جس شدت سے میں نے اسے دوچار کیا ہے۔"

"نہایت احمقانہ سوچ ہے، تم سے غلطی ہوئی اور تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہے، یہ کافی ہے۔ غلطی کا احساس ہونے پر غلطی نہیں کی جاتی۔ اپنی ماں کو تکلیف پہنچا کر تم عائشہ کو فائدہ پہنچا سکو گے؟ بہتر ہے کہ تم ان سے رابطہ کرو۔ ماں دُنیا کے جس بھی خطے یا مذہب سے تعلق رکھتی ہو۔ اس کے دل میں اپنی اولاد سے محبت کا جذبہ یکساں ہوتا ہے اور ایک محبت بھرے دل کو دکھانے کی اجازت میں تمہیں ہرگز نہ دوں گا۔" ڈاکٹر ایثار کے سمجھانے پر اس نے لندن کال کی تھی۔

"اوہ ڈیوڈ......! کہاں تھے تم پور بوائے۔ کوئی خبر ہی نہیں دی اپنی۔ سنتھیا کتنا تڑپتی تمہارے لئے۔" آنٹی جینی اس کی آواز سنتے ہی شروع ہو گئی تھیں۔

"ممی کہاں ہیں آنٹی......! میری ان سے بات کرواؤ۔" کسی انہونی کا احساس کر کے وہ چلایا تھا۔

"سوری ڈیوڈ......! تمہیں معلوم ہے کہ سنتھیا مائیکل کی ڈیتھ کے بعد مینٹلی کتنا ڈسٹرب تھی۔ اس پر سے تم اسے یہاں شفٹ کرنے کے بعد خود غائب ہو گئے تو وہ بالکل ہی ہوش و حواس گنوا بیٹھی۔ اسے اکثر غائب دماغی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ اسی کیفیت میں ایک دن وہ گھر سے باہر نکلی تو سڑک کراس کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئی۔ ایکسیڈنٹ اتنا شدید تھا کہ اس نے موقع پر ہی دم توڑ دیا اور ہم اس کے لئے کچھ نہ کر سکے۔ تمہارا کوئی کونٹیکٹ نمبر نہیں تھا۔ اس لئے تمہیں انفارم نہ کیا جا سکا۔" آنٹی جینی اس کی سماعتوں میں دھماکے کر رہی تھی۔

"اور جولی...... جولین کہاں ہے......؟" وہ بہت مشکل سے کچھ اور کہنے کی ہمت کر سکا۔

"وہ تو یہاں آنے کے ایک مہینے بعد ہی اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ چلی گئی

تھی۔ سنتھیا کی ساری رقم اور جیولری بھی اسی کے پاس تھی۔ گھر سے جاتے وقت وہ اُ
اپنے ساتھ لے گئی۔"

ڈیوڈ نے لائن کاٹ دی۔ مزید کچھ اور سننا اس کے بس میں نہیں تھا۔
قدرت نے جدا کیا تھا لیکن جولی..... جولی کی حرکت کو کیا نام دیتا وہ۔ مائیکل کے مر۔
لڑکی نے رو رو کر اپنا حشر کر لیا تھا، وہ اتنی جلدی راہ بدل گئی تھی۔ زندگی ہر بار نئے رُخ
کے سامنے آ رہی تھی۔

☆☆☆

پھر یوں ہوا کہ نکلے کسی کی تلاش میں
پھر یوں ہوا کہ خود کو نہ پائے تمام عمر
پھر یوں ہوا کہ اور کسی کے نہ ہو سکے
پھر یوں ہوا کہ وعدے نبھائے تمام عمر

رضا بوتیکس کے نام سے اس نے لاہور میں اپنا بوتیک کھول لیا تھا۔ شکر تھا
بوتیک اور گھر کی فروخت سے حاصل ہونے والی تمام رقم اس نے ممی کے حوالے نہ کی
یقیناً آج وہ رقم کے معاملے میں بھی بالکل تہی دست رہ جاتا۔

"میں لاہور میں سیٹل ہونا چاہتا ہوں۔ عائشہ اسی شہر کی بھول بھلیوں میں
ہے اور مجھے لگتا ہے میں ایک دن وہیں کہیں اسے پالوں گا۔" مکمل صحت یاب ہو۔
اس نے ڈاکٹر ایثار سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

اور اب تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ عائشہ کی تلاش میں مسلسل ناکامی
وہ مایوس نہیں ہوا تھا، کیونکہ اس نے سیکھ لیا تھا کہ قدرت گناہوں پر صرف سزا نہیں
بلکہ کفارے کا موقع بھی دیتی ہے اور وہ اپنے حصے کا کفارہ ادا کرنے کو تیار تھا۔ اسے
اس رُخ سے متعارف کروانے کا سہرا ڈاکٹر ایثار یوسفی کے سر تھا۔ بے پناہ سرفراز ہو
کی ہمہ جہت شخصیت سے۔ یہاں تک کہ جھوٹ موٹ داؤد رضا کا نام اختیار کر۔
سچ مچ داؤد رضا بن گیا تھا۔

"کاش.....! مائیکل کو بھی آپ جیسا کوئی شخص ملا ہوتا تو وہ بھی میری طرح اسلام کی
حقیقت کو پا جاتا۔ بے عقل اور گمراہ مسلمانوں نے اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو نقش
اس کے ذہن میں بنایا تھا۔ اس نے اس کی جان لے لی۔ اسلام کی حقیقت کو تو تقلید کی اندھی
راہ پر چلتے مسلمان نہیں جانتے، مائیکل کیسے جان پاتا۔ لیکن میں خوش ہوں کہ مجھے آپ کے
طفیل دین حق کو جاننے اور اپنانے کا موقع ملا۔ زندگی نے میرا اتنا کچھ چھین کر مجھے ایمان کی
دولت سے نوازا ہے۔ مجھ سے بڑھ کر شاید ہی کوئی شخص اس نعمت کی قدر کر سکے۔"

وقت رخصت اس نے ڈاکٹر ایثار سے کہا تھا اور ان کے چہرے پر مسرت کی چمکتی
ہوئی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ ان کی دوررس نگاہوں نے اس کے اندر جس اچھے انسان کو
دریافت کیا تھا، اب وہ پوری طرح باہر آ چکا تھا۔ کئی برس پہلے جس چھوٹے سے شہر کے لوگوں
کی فلاح و بہبود کا بیڑا انہوں نے اُٹھایا تھا۔ آج داؤد رضا بھی اس مشن کا حصہ تھا۔ لاہور میں
اگرچہ وہ عائشہ کی خاطر رہائش رکھے ہوئے تھا لیکن ہر ویک اینڈ پر ڈاکٹر ایثار کے پاس جانا
اس نے معمول بنا رکھا تھا۔ اس کی طرف سے مسلسل کی جانے والی مالی معاونت نے ڈاکٹر ایثار
کے مشن میں بڑی مدد دی تھی اب وہ پہلے سے بڑھ کر لوگوں کو طبی سہولتیں فراہم کرنے اور ان
کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنے کے لائق تھے۔

داؤد رضا نے ایک ذمہ داری اور بھی اپنے کاندھوں پر اٹھائی تھی۔ عائشہ احسان کی
ماں کو مینٹل ہاسپٹل سے نکال کر وہ اپنے گھر لے آیا تھا۔ ہاسپٹل میں ان کی حالت بے حد ابتر
تھی۔ حدید احسان نے اپنے جس عزیز کے ذمہ ماں کی دیکھ بھال کا کام لگایا تھا، وہ یقیناً مکان
کے کرائے کی مد میں ملنے والی رقم ان کے بجائے خود اپنے آپ پر خرچ کر رہے تھے۔ جب ہی
تو ہاسپٹل میں مسز نفیسہ احسان کا کوئی پرسانِ حال ہی نہ تھا۔ کوئی اس لاچار اور لاوارث بوڑھی
عورت کا خیال رکھتا بھی تو کیوں۔ جس کی وہ اصل ذمہ داری تھیں وہ تو چند نوٹ ان کے نام
مخصوص کرنے کا احسان کر کے اپنی زندگی کی خوشیوں میں مگن ہو چکا تھا۔

"سر.....! کل میڈم جھرنا کی سیکرٹری کو ان کے ڈریسز کی ڈیلیوری نہیں کی جا سکی
تھی۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ آج میں خود ڈریسز ان کے گھر پہنچا دوں گی لیکن

اتفاق سے آج مجھے گھر جلدی پہنچنا ہے۔ اگر آپ ڈریسز پہنچانے کا کام کسی اور سے کروا دیں تو میرے سر سے بوجھ کم ہو جائے گا۔" ارم جو ابتداء ہی سے داؤد رضا کے ساتھ تھی اور بہت اچھی ڈریس ڈیزائنر تھی اس کے پاس آ کر فکرمندی سے بولی۔

"اوکے......! تم فکر مت کرو۔ میں خود کرلوں گا یہ کام۔ تم مجھے اپنی میڈم جھرنا کے گھر کا ایڈریس دے دو۔" وہ جانتا تھا کہ ارم بہانے باز نہیں۔ اگر اس کو آج گھر جانے کی جلدی ہے تو یقیناً کوئی بہت ضروری کام ہی ہوگا۔

"شام چھ بجے کا وعدہ کیا تھا میں نے۔ ساڑھے پانچ تو ہونے ہی والے ہیں۔ اگر آپ ابھی نکل جائیں تو اچھا ہوگا۔" ایڈریس نوٹ کروانے کے بعد اس نے داؤد رضا کو بتایا تو وہ اسے گھورنے لگا۔

"کبھی کبھی تم بندے کو زچ کر دیتی ہو۔ خیر اب تو بھگتنا ہی پڑے گا۔ چلو ساتھ ہی نکلتے ہیں۔ راستے میں تمہیں بھی ڈراپ کر دوں گا۔"

"یو آر سو نائس......!" ارم ہنسنے لگی اور پھر جب تک وہ اپنی چیزیں وغیرہ سمیٹ کر چلنے کے لئے تیار ہوئی داؤد ڈرائیونگ سیٹ تک پہنچ چکا تھا۔

اس کے ساتھ ہونے والے حادثے نے اس کی ایک ٹانگ میں ہلکی سی لنگڑاہٹ پیدا کر دی تھی اس کے باوجود وہ بہت ایکٹو تھا۔

"تمہاری میڈم جھرنا کافی عرصے سے ہمارے بوتیک سے ڈریسز تیار کروا رہی ہیں لیکن کبھی میرا ان سے سامنا نہیں ہوا۔" گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اس نے ارم سے کہا۔

"سامنا تو کبھی میرا بھی نہیں ہوا۔ ہمیشہ ان کی سیکرٹری ہی آتی ہے۔ ویسے بھی کچھ سنا ہے کہ وہ زیادہ کہیں آتی جاتی نہیں۔ فلموں کے لئے پلے بیک سنگر کے طور پر کام کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی آڈیو اور ویڈیو البمز بھی مارکیٹ میں آتے ہیں۔ لیکن کہیں بھی میڈم جھرنا خود دکھائی نہیں دیتیں۔ ویڈیو میں ہمیشہ ماڈلز سے کام لیا جاتا ہے۔" ارم نے تفصیلات فراہم کیں۔

"ہو سکتا ہے وہ کوئی بدصورت خاتون ہوں۔ اسی لئے کیمرے کا سامنا کرتے گھبراتی ہوں۔"

"ممکن ہے۔ ویسے آواز جتنی خوبصورت ہے، ذہن میں کسی بدصورت ہستی کا خاکہ بنتا نہیں۔" داؤد کی رائے پر ارم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"مجھے کیا معلوم، میں کون سا گانے وغیرہ سنتا ہوں۔" لاپرواہی سے کہتے اس نے گاڑی ارم کے گھر کے قریب روکی۔

"لفٹ کے لئے شکریہ۔" ارم اسے گڈبائے کہتے ہوئے گاڑی سے اُتر گئی تو اس نے اگلی منزل کی طرف سفر شروع کر دیا۔

"میڈم اس وقت ریاض کر رہی ہیں۔ آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا ہوگا۔ آپ بیٹھیں میں نے انہیں اطلاع کر دی ہے۔" اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر جانے والا ملازم کچھ دیر بعد کولڈ ڈرنک اور پیغام پہنچا کر وہاں سے چلا گیا تو داؤد رضا نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں لیکن اگلے پل ہی وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔ ستار کے ساتھ سنائی دیتی مدھر آواز نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ وہ کسی معمول کی طرح اس آواز کے تعاقب میں ڈرائنگ روم سے نکل کر گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھتا گیا۔

سرِ طاقِ جاں نہ چراغ ہے، پسِ بامِ شب نہ سحر کوئی
عجیب ایک عرصۂ دراز ہے، نہ گمان ہے، نہ خبر کوئی
نہیں اب تو کوئی ملال بھی، کسی واپسی کا خیال بھی
غمِ بے کسی نے مٹا دیا، میرے دل میں تھا بھی اگر کوئی
تیری بے رُخی کے دیار میں گھنی تیرگی کے حصار میں
جلے کس طرح چراغِ جاں، کرے کس طرف کو سفر کوئی
کٹے وقت چاہے عذاب میں، کسی خواب میں، یا سراب میں
جو نظر سے دُور نکل گیا، اسے یاد کرتا ہے ہر کوئی

وہ بہت ڈوب کر گا رہی تھی۔ آواز کا ترنم درد کی چاشنی کے ساتھ مل کر کچھ اور بھی بڑھ گیا۔ یہ آواز داؤد رضا کے لئے اجنبی نہ تھی۔ ہاں آواز میں درد کا یہ رچاؤ ضرور نیا تھا۔

"عائشہ......!" کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے دھیرے سے پکارا۔

وہ تڑپ کر مڑی اور اگلا لمحہ دونوں کے لئے ہی قیامت تھا۔

☆☆☆

چل چل کر اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ چلتی جا رہی تھی۔ بے سمت، بے منزل مسافروں کے نصیب میں آبلہ پائی کے سوا لکھا بھی کیا ہوتا ہے۔ آج صبح تک وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے پر آسائش کمرے میں تھی اور اب خاک اُڑاتی سڑکوں پر حواس باختہ چلی جا رہی تھی۔ سیاہ چادر جو ہمیشہ اس کے چہرے کے گرد ہالہ بنائے رکھتی تھی، اس کے دائیں شانے سے لٹکتی زمین تک پہنچ کر خاک آلود ہو رہی تھی۔

"کہاں جاؤں......؟" مسلسل ایک ہی سوال اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ جس کا جواب کہیں نہیں تھا۔

"بابا......! میرے بابا دُنیا سے چلے گئے۔" ایک آہ اس کے سینے سے نکلی لیکن باوجود کوشش کے آنکھ میں آنسو کا ایک قطرہ نہ آسکا۔

آج صبح ہوٹل سے نکلنے کے بعد اس نے پہلا کام اپنے گھر فون کرنے کا کیا تھا لیکن دوسری طرف سے کال ریسیو کئے جانے پر کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکی تھی، لیکن اس کی سماعتوں نے گھر میں گونجتے نوحوں کو سنا تھا۔

"احسان انکل کی ڈیڈ باڈی گھر پہنچنے والی ہے۔" اس کی کسی کزن نے نہ جانے کسے اطلاع فراہم کی تھی لیکن عائشہ احسان کی سماعتیں برف ہو گئی تھیں۔ اس کا باپ رُسوائی کے خوف سے دُنیا چھوڑ گیا تھا اور وہ یہاں ایک اجنبی شہر میں تنہا دربدر پھرتی اس کا ماتم کرنے کے لائق بھی نہیں رہی تھی۔

وہ ایک بار واپس جا کر ان سے معافی مانگنا چاہتی تھی لیکن واپسی کا ہر در بند تھا۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھی۔ جو معمولی رقم اس کے پاس تھی وہ بھی اس کال پر خرچ ہو چکی تھی۔

یوں ہی شہر کے راستوں پر چکراتے بالآخر شام کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ وہ بھی تھک ہار کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔

"حلیم...... گرما گرم حلیم۔" نزدیک کھڑے ایک ٹھیلے والے کی آواز کے ساتھ حلیم

خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو اسے احساس ہوا کہ اس نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا۔

بھوک کے احساس کے ساتھ ہی اسے اپنی سب سے اہم ضرورت کا احساس ہوا۔

رات دن بھر کی طرح سڑکوں پر گھوم کر یا اس درخت کے نیچے بیٹھ کر نہیں گزار سکتی تھی۔ اسے حال میں ایک پناہ گاہ درکار تھی۔

"بیٹی......! یہاں کیوں بیٹھی ہو......؟ اپنے گھر کیوں نہیں جاتیں......؟" بڑی دیر حلیم والے کے پاس بینچ پر بیٹھ کر حلیم روٹی کھاتے ایک سفید ریش بڑے میاں اسے دیکھ رہے تھے۔ اسے اپنی جگہ پر مسلسل جمے دیکھ کر وہ بالآخر صبر نہ کر سکے۔

"گھر کا راستہ ہی تو نہیں مل رہا۔ جب ہی تو اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہوں۔" وہ سادگی سے بولی۔

"کہاں......؟ کس علاقے میں ہے تمہارا گھر......؟ مجھے بتاؤ۔ شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔" وہ بے چینی سے پوچھنے لگے۔

"کہیں نہیں......! اس دُنیا میں کم از کم اب میرے لئے کوئی گھر نہیں رہا۔" وہ غائب دماغی کے عالم میں انہیں جواب دے رہی تھی۔

"گھر سے بھاگ کر آئی ہو......؟" بڑے میاں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ وہ جواب دینے کے بجائے چپ رہی۔

"رات اس درخت کے نیچے بیٹھ کر تو نہیں گزار سکتی ہو تم۔ چلو میرے ساتھ۔ میں تمہیں کسی محفوظ جگہ پہنچا دوں۔" اس آفر پر وہ فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کر ان کے پیچھے چل پڑی تھی۔ بڑے میاں نے اسے اپنے ساتھ رکشہ میں بٹھا کر رکشہ والے کو چلنے کا بتایا تھا وہ سن نہ سکی۔ جلد ہی وہ لوگ تنگ گلیوں والے ایک علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ رکشہ سے اُتر کر بڑے میاں اسے اپنے ساتھ لئے گلیوں سے گزرتے چلے گئے۔ گلیاں تنگ ہونے کے باوجود بہت بارونق تھیں۔ جگہ جگہ پھول فروشوں اور پان والوں کی دکانیں تھیں۔ جہاں لوگ خرید و فروخت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

"یہ میرا گھر ہے۔" ایک دومنزلہ بوسیدہ سے مکان کے سامنے پہنچ کر بڑے میاں

نے اسے بتایا اور پھر کھلے ہوئے دروازے سے ڈیوڑھی میں داخل ہو کر اوپری منزل کی جاتی سیڑھیوں پر اسے لئے چڑھنے لگے۔

''اصغر خان..... یہ کسے لے آیا ہے.....؟'' میک اَپ زدہ چہرے والی ا عورت نے عائشہ کی طرف جانچتی نگاہوں سے دیکھتے بڑے میاں سے پوچھا۔

''کچھ مت پوچھو زہرہ بائی..... ! ہیرا ہے ہیرا۔ سڑکوں پر رُل رہا تھا۔ میں تم پاس لے آیا۔ اس کی تراش خراش کرو۔ بڑا منافع دے گی۔''

عائشہ چکرا کر گر پڑی۔ ایک بار پھر اس کے ساتھ دھوکا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''دیکھ لڑکی..... ! سیدھی طرح لائن پر آ جا ورنہ زہرہ بائی نے بھی کچی گولیاں کھیلیں۔ بڑے بڑوں کو سدھارا ہے میں نے۔ تیری جیسی کل کی چھوکری کی کیا اوقا میرے سامنے۔''

زہرہ بائی نیم جان پڑی عائشہ کے سامنے غصے سے بل کھا رہی تھی۔ چھٹا کلہ لڑکی نے اسے ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ مار پیٹ، دھمکیاں، ہر حربہ ناکام ثابت ہوا وہ کسی طرح قابو میں ہی آ کر نہیں دیتی تھی۔ اب بھی زہرہ بائی کی چیخ پکار پر وہ خاموش آنکھیں موندے پڑی رہی۔ آخر کو زہرہ بائی تھک ہار کر خود ہی وہاں سے ہٹ گئی۔

''کیوں اماں..... ! قابو میں نہیں آئی لڑکی.....؟ تمہارا برسوں کا تجربہ کم پڑ کی ضد کے سامنے۔'' کاجل نے زُلفوں کو سلجھاتے زہرا بائی کو چھیڑا۔

''ارے جس کو جان کی پرواہ نہ ہو اسے اور کس چیز سے ڈرایا جا سکتا ہے۔ پیٹ پر تو بڑے بڑے چیں بول جاتے ہیں لیکن یہ لڑکی ایسی ڈھیٹ ہے کہ ٹس سے مس ہوتی۔ اس سے پہلے بس ایک رانی ہی آئی تھی اڑیل ٹٹو لیکن اسے بھی دو دن کے فا لائن پر لگا دیا تھا۔ لیکن یہ تو پہلے ہی منہ میں روٹی کا ایک نوالہ رکھنے کو تیار نہیں۔ اس کا کروں میں.....؟'' زہرہ بائی سخت جھنجلائی ہوئی تھی۔

''تو ذرا صبر سے کام لو۔ اتنی جلدی کاہے کی ہے۔ رہنا تو اس کو اب یہیں

زندگی بھر۔ لائن بھی پکڑ ہی لے گی۔'' کاجل نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتے لاپرواہی سے کہا۔

''چل چل زیادہ سبق نہ دے۔ مجھے بھی آتے ہیں سارے گر۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ وقت ہی نہیں ہے میرے پاس۔ وہ اصغر خان چوہدری انور کے کان میں پھونک آیا ہے کہ زہرہ بائی کے پاس نیا ہیرا آیا ہے اور تجھے تو پتا ہے چوہدری نئے مال کے نام پر کیسا اتاؤلا ہو جاتا ہے۔ کہلوا رکھا ہے اس نے اس اصغر خان کے ہاتھ کہ آج رات آئے گا۔'' اصغر خان کے نام کے ساتھ ہر بار وہ ایک بڑی سی گالی ٹانک دیتی تھی۔

''اچھا چلو، میں ہی کچھ کرتی ہوں۔ آخر بزنس کا معاملہ ہے۔ تم ایسا کرو ڈاکٹر کو بلوا لو ذرا۔'' کاجل لہراتی ہوئی اس کمرے میں گھس گئی جہاں عائشہ کو رکھا گیا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری.....؟'' عائشہ کے ماتھے پر ہتھیلی رکھتے کاجل نے نرمی سے پکارا۔

''مر جاؤں گی لیکن تم لوگوں کی بات نہیں مانوں گی۔'' ہذیانی انداز میں کہتے اس نے اپنے ماتھے پر سے کاجل کا ہاتھ جھٹکا۔

''یہاں کون خوشی سے مانتا ہے ایسے کاموں کے لئے لیکن زہرہ بائی ایسی ظالم ہے کہ مار مار کر ادھ موا کر دیتی ہے اور مرنے بھی نہیں دیتی۔'' اپنے لہجے میں آزردگی سموئے وہ بڑی عمدہ اداکاری کر رہی تھی۔

''میں بھی تمہاری طرح ان لوگوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ شروع شروع میں بہت ہاتھ پیر مارے پھر آخر کار تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا لیکن آسان نہیں ہوتا ذلت کی اس زندگی کو اپنانا۔ آج بھی دل اذیت محسوس کرتا ہے اپنی معصومیت کے چھن جانے کے پہلے پل کی۔ تمہیں دیکھ کر ایک بار پھر سارے زخم تازہ ہو گئے ہیں۔'' اس کا انداز اتنا اثر انگیز تھا کہ عائشہ اس کی طرف توجہ دینے پر مجبور ہو گئی۔

''تم تو زہرہ بائی کی سگی بیٹی نہیں ہو.....؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں..... ! چار سال پہلے ٹرین کے ایک حادثے میں میری پوری فیملی ہلاک ہو گئی

تھی۔ صرف میں زندہ بچی اور جیسے تمہیں اصغر خان ہمدردی کا جھانسا دے کر یہاں لے آیا مجھے بھی زہرہ بائی کا ایک ہرکارہ لے کر آیا تھا۔'' کاجل کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

''بہت دُکھ بھری داستان ہے تمہاری لیکن افسوس کرنے کے سوا میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں تو خود اپنے لئے بھی کچھ نہیں کر سکتی۔'' اس کے آنسوؤں نے عائشہ کا دل موم کر دیا تھا اور وہ اس کا ہاتھ تھام کر گویا اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''لیکن میں تو تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔''

''کیسے......؟''

''میں تمہیں یہاں سے بھگا دوں گی۔'' کاجل کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

''واقعی......؟'' عائشہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''بالکل......! لیکن اس کے لئے تمہیں میرے مشوروں پر عمل کرنا ہوگا۔''

''میں راضی ہوں۔'' وہ جوش سے بولی۔

''ابھی کچھ دیر بعد یہاں ایک ڈاکٹر آئے گا جو تمہاری مرہم پٹی کرے گا۔ ہو سکتا ہے کچھ دوائیں وغیرہ کھانے کے لئے دے بلکہ میں اس سے کہوں گی تمہیں ڈرپ لگا دے تاکہ تم جلد سے جلد ریکور کر سکو یہاں سے نکل کر سروائیو کرنے کے لئے تمہارا صحت مند ہونا بہت ضروری ہے اور ہاں دیکھو اب زہرہ بائی کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے ضد کرنے کے بجائے آرام سے کھاؤ پیئو اور اپنا حلیہ درست کر کے نارمل طریقے سے رہو تاکہ وہ یہ سمجھے کہ تم نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ وہ مطمئن ہو گی تو تم پر سے پہرے بھی کم ہو جائیں گے اور میں موقع دیکھتے ہی تمہیں یہاں سے نکال دوں گی۔'' کاجل آہستہ آہستہ اسے سمجھا رہی تھی۔

اور پھر عائشہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ پیٹ بھر کر کھانا کھانے، مرہم پٹی اور ڈرپ نے اس پر اچھے اثرات مرتب کئے تھے۔ بہت عرصے بعد وہ سکون سے کئی گھنٹوں تک سوتی رہی تھی۔

''اُٹھ گئیں تم......! اب کیا محسوس کر رہی ہو......؟'' عائشہ کی آنکھ کھلی تو ماحول

در آئی تھی۔

''اُٹھو......! نہا دھو کر فریش ہو جاؤ تو طبیعت اور اچھی ہو جائے گی۔'' ایک جوڑا کے ہاتھ میں تھماتے کاجل نے اسے غسل خانے کی طرف دھکیلا۔

''واؤ......! ونڈرفل......! تم تو بے حد جچ رہی ہو اس سوٹ میں۔'' بلیک ڈبل نیٹ کے ڈیپ گلے اور ہاف آستینوں والے ہلکی سی سنہری بیل کے سوٹ میں واقعی اس کا روپ دمک اٹھا تھا۔

''لاؤ میں تمہارے بال بنا دوں۔'' کاجل نے محبت سے کہتے ڈرائیر سے اس کے بالوں کو سکھانا شروع کر دیا۔ بال سکھا کر اس نے بالوں کو خوبصورت سے اسٹائل میں سیٹ کر دیا

''تمہارا میک اَپ کر کے دیکھوں۔ سادگی میں اتنا غضب ڈھا رہی ہو تو میک اَپ جانے کیسی لگو گی۔'' کاجل نے فرمائش کی۔

''نہیں......! مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔'' عائشہ نے انکار کر دیا۔

''سوری......! بس یونہی تمہیں دیکھ کر اپنی چھوٹی بہن کا خیال آ گیا تھا۔ اکثر کہیں جانے کے لئے میں ہی اسے تیار کرتی تھی۔'' کاجل اُداسی سے کہہ کر جانے لگی تو عائشہ نے ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔

''اگر میرے میک اَپ کروا لینے سے تمہیں خوشی ملتی ہے تو میں راضی ہوں۔'' اور چند ہی منٹ کاجل نے اس کے چہرے پر طبع آزمائی کر کے اسے آئینہ کے سامنے کھڑا وہ اپنا آپ شناخت ہی نہ کر سکی۔ آنکھوں میں کاجل کی پتلی سی لائن کے سوا اس نے میں کبھی کسی قسم کا میک اَپ نہیں کیا تھا اور اب جیسے یکدم ہی تبدیل ہو گئی تھی۔

''تمہاری صورت تو دل چاہ رہا ہے آنکھوں میں بسا لوں لیکن مجبوری ہے اب میں تمہارے پاس نہیں ٹھہر سکتی۔ یہ میرے رقص کی پریکٹس کا وقت ہے۔ ہاں اگر تم دو گھنٹے تک کر سکو تو اپنا حلیہ چینج مت کرنا۔ میں دل بھر کر تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ ویسے بھی تم اب یہاں سے چلی جاؤ۔''

کاجل کی محبت اور لہجے کا درد ہر بار عائشہ کو اس کی بات مان لینے پر مجبور کر
سو اب بھی وہ ہار گئی لیکن جب انتظار کرتے کرتے دو کے بجائے تین گھنٹے گزر گ
شدید کوفت نے آگھیرا۔ کمرے سے باہر نکل کر وہ خود نہیں دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ کم
باہر سنائی دیتی گھنگھروؤں کی چھنک اور موسیقی کی آوازیں باہر کے ماحول کو واضح کر رہ
"اتنی دیر لگا دی۔ میں کب سے تمہاری خاطر سج سنور کر بیٹھی ہوں۔" درو
کی آواز پر وہ کہتی ہوئی تیزی سے پلٹی تو اجنبی صورت نے اسے دم بخود کر دیا۔
"باخدا ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آپ ہمارا اس قدر بے چینی سے انتظار کر
ورنہ کب کے دربار حسن میں حاضر ہو گئے ہوتے۔" پچاس پچپن کی درمیانی عمر
باچھیں پھیلا کر بولا تو پان کے کثرتِ استعمال سے بدنما ہو جانے والے دانت نمایاں
"آپ کون ہیں......؟ جائیں یہاں سے۔ میں کاجل کا انتظار کر رہی ہو
"کاجل ہی نے تو یہاں تک ہماری رہنمائی کی ہے۔ دروازے تک ت
ڈیوٹی تھی اس کی سو وہ اس نے انجام دے دی۔ آگے آپ کی ڈیوٹی ہے ہمیں خوش کر
واللہ مزید نہ تڑپایئے۔" وہ دروازے کی چٹخنی لگا کر آگے بڑھا تو سارا کھیل عائشہ
واضح ہو گیا۔

"تم ہر بار لوگوں کے فریب میں آجاتی ہو عائشہ احسان......! تم سے بڑ
ہی کوئی شخص اس دُنیا میں بے وقوف ہوگا۔"

اپنے آپ کو کوستے وہ کمرے میں نظریں دوڑانے لگی اور فوراً ہی اس
شیشے کا بنا نازک سا سائیڈ لیمپ آگیا۔

"جس چیز کے تم جیسے لالچی اور ہوس پرست لوگ بھوکے ہو میں اس چیز ک
دوں گی۔ میں اپنے حسن کو برباد کر ڈالوں گی۔" جنونی کیفیت میں اس نے لیمپ اٹ
چہرے پر دے مارا۔ بائیں رُخسار پر لگنے والی یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ کانچ کے ٹکڑے
اُترتے چلے گئے اور بھل بھل خون بہنے لگا۔

"زہرہ بائی......! کاجل......! مینا......! دیکھو۔ کیا کر لیا اس پاگل لڑ

انور حواس باختہ ہو کر سب کو آوازیں لگاتا باہر کی طرف دوڑا اور چند لمحوں بعد وہ لوگ
تال کی طرف لے جا رہے تھے۔

☆☆☆

"ایک بات بولوں زہرہ بائی......! لڑکی تمہارے کسی کام کی نہیں۔ ٹھیک ہو کر واپس
آئے گی تو دوبارہ ایسی حرکت نہ کرے اس بات کی کیا ضمانت......؟"

چوہدری انور اگلی صبح زہرہ بائی کے سامنے بیٹھا خیال آرائی کر رہا تھا۔

"سچ کہتے ہیں چوہدری صاحب......! زہرہ بائی کو ایسا گھاٹا زندگی بھر کسی سودے
میں ہوا۔ لڑکی میں تو مانو کسی جن کی روح گھسی ہوئی ہے۔ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آ کر
"

"تو ایسا کرو سودا کر لو مجھ سے اس کا۔"

"لیکن بھلا وہ آپ کے کس کام کی......؟" زہرہ بائی کو حیرت ہوئی۔

"بس دل پر چڑھ گئی ہے۔ ایسی بہادر اور جی دار، عمر گزر گئی پہلے کبھی دیکھنے میں
آئی۔ جان تو بہت دینے کو تیار ہو جاتی ہیں لیکن اتنی حسین لڑکی کو حسن کی قربانی دیتے پہلی
ھا ہے۔"

اور زہرہ بائی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس سودے پر۔ اس کے تو سر سے بلا ٹل رہی

چوہدری انور اسے ہاسپٹل سے اپنے گھر لے گیا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم آپ نے مجھ پر یہ مہربانی کیوں کی لیکن یہ بات لکھ کر رکھ لیں کہ
ناپاک ارادے میں آپ کو کامیاب نہ ہونے دوں گی۔ میرے لئے جان دینا اور لینا
شوار نہیں۔ کیونکہ میں اپنی ساری کشتیاں جلا چکی ہوں۔" وہ غرائی تھی۔

"واہ کیا کوئل کی طرح کوکتی آواز ہے۔ ذرا سر تال پکڑ لے تو قیامت ہی مچا دے
والی بڑی گلوکارائیں تمہارے آگے پانی بھریں گی۔" چوہدری انور بدمزہ ہوئے بغیر اسے
رہا تھا۔

"چالیس سال گزارے ہیں سرتال کی دنیا میں۔ فلم انڈسٹری پر حکمرانی
موسیقار چوہدری انور کی۔ لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ لیتا ہوں۔ تمہیں اسی لئے یہاں ا
کہ تمہاری آواز میرے کام کی ہے۔ تم مجھے اپنی آواز کا مالک بنا دو۔ تمہاری عزت کی س
گارنٹی میں تمہیں دیتا ہوں۔ یوں بھی مجھے عورتوں کی کمی نہیں۔ جہاں ہوں ہر وقت حسن
ارد گرد ہجوم لگائے رکھتا ہے۔ پھر تم سے داغدار حسن سے مجھے کیا غرض۔"

اور عائشہ نے چوہدری انور سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ چوہدری انور باقاعدہ اس
کی تعلیم دے کر میدان میں لایا تھا۔ آدمی چاہے وہ کتنا ہی برا تھا لیکن فنکار سچا تھا۔
آواز اس کے زیر تربیت آ کر نکھرتی چلی گئی اور وہ عائشہ سے جھرنا بن گئی۔

اس کے کام کا سارا معاوضہ چوہدری انور وصول کرتا تھا لیکن اسے پرواہ
تھی۔ اس کے لئے ایک چھت کا آسرا بہت کافی تھا۔ زہرہ بائی اس کے عروج کو دیکھ
تلملائی تھی۔ چوہدری انور بہت چالاکی سے اس کے سونے کے انڈے دینے والی مرغی
تھا لیکن چوہدری انور کے اختیارات کے سامنے زہرہ بائی دم نہیں مار سکتی تھی۔

تین سال تک وہ جھرنا بن کر چوہدری انور کو مالا مال کرتی رہی لیکن چوہدا
اپنا وجود شراب و شباب نے کھوکھلا کر دیا تھا۔ دونوں گردے فیل ہونے کے بعد جب و
میں اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا تو اس نے اپنی ساری جائیداد عائشہ کے نام لکھ دی۔

"فلمی لائن میں آنے کے چکر میں ماں باپ، بہن بھائیوں کو کم عمری میں
کر بھاگ نکلا تھا اور اب ان کا اتا پتا تک نہیں یاد تھا۔ شادی ساری زندگی کی ہی نہیں
رشتے جنم لیتے، سولے وے کر ایک عائشہ ہی رہ جاتی تھی جس سے اس کا تھوڑا بہت
تھا۔ چوہدری انور اس کے لئے کیسی ڈھال تھا، یہ عائشہ کو اس کے مرنے کے بعد پتا
بائی جو اس کی زندگی میں اس گھر میں پر بھی نہیں مار سکتی تھی اب آئے دن اس کے
چکر لگانے لگے تھے۔ وہ تو گھر میں موجود گارڈز اور نوکروں کا سہارا تھا کہ عائشہ ا
کے چنگل میں آنے سے بچی ہوئی تھی۔ لیکن یہ آسرا کوئی آسرا نہ تھا۔ وہ یہ بات
جانتی تھی۔ پیسے کے بل بوتے پر حاصل کی جانے والی وفاداریاں، کب پیسے کے

خرید لے، کچھ معلوم نہیں تھا۔

☆☆☆

"عائشہ.....!" پورے تین سال بعد کسی نے اسے اس نام سے مخاطب کیا تھا لیکن
مخاطب کرنے والے کو دیکھ کر اس کے اعصاب تن گئے تھے۔

یہی تو تھا اس کی زندگی کو تباہ کرنے والا۔

گھر کی چار دیواری سے نکال کر بازار کی رونق بنانے والا۔

اپنے قاتل کے خدوخال بھلا کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔

اور عائشہ کی طرح اس میں کوئی تبدیلی بھی تو نہیں آئی تھی بلکہ وہ تو پہلے سے بڑھ کر
وجیہہ ہو گیا تھا۔

"تم.....! تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے گھر میں قدم رکھنے کی.....؟ برباد تو کر
ڈالا تم نے مجھے اور میرے پورے خاندان کو۔ کیا اب بھی تمہارے انتقام کی آگ سرد نہیں ہوئی
جو ایک بار پھر میرے سامنے چلے آئے ہو۔" آس پاس رکھی چیزیں اُٹھا کر اس نے داؤد رضا
کی طرف پھینکنا شروع کر دی تھیں۔

"عائشہ.....! اللہ کے لئے میری بات سنو۔ میں تین سال سے تمہیں کھوج رہا
ہوں۔ انتقام کے لئے نہیں بلکہ تم سے اپنے جرم کی معافی مانگنے کے لئے۔ اگر معاف کرنے کا
حوصلہ نہ پاؤ اپنے اندر تو بے شک اپنے مجرم کو سزا سنا دینا۔ مجھے تمہاری دی ہوئی ہر سزا منظور
ہوگی۔ لیکن پلیز ایک بار صرف ایک بار میری بات سن لو۔" اس کی پھینکی گئی چیزوں سے بچنے کی
کوشش کرتا وہ اس کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔

"عائشہ نے جتنے دھوکے کھانے تھے وہ کھا چکی۔ اب کسی کے دھوکے میں آنے والی
نہیں ہوں میں۔" وہ زور سے چلائی تھی۔

"کیا ہوا میڈم.....! کیا مسئلہ ہے.....؟" شور سن کر دو تین نوکر اور ایک سیکورٹی
گارڈ وہاں دوڑے چلے آئے تھے۔

"دھکے دے کر باہر نکال دو اس شخص کو اور کبھی یہاں قدم بھی نہ رکھنے دینا اسے۔"

"تم چاہے کتنے ہی دھکے دلواؤ۔ میں یہاں آتا رہوں گا۔ اس وقت تک جب تک تم میری بات سننے کے لئے راضی نہیں ہو جاتیں۔ مجھے ایک بار صفائی کا موقع نہیں دیتیں۔"

سیکورٹی گارڈ اور نوکر اسے پکڑ کر باہر کی طرف دھکیل رہے تھے اور وہ چیخ چیخ کر اپنی بات کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

"شمس الدین.....! پندرہ دن گزر گئے داؤد نہیں آیا۔ لاہور شفٹ ہونے کے بعد سے یہ پہلا موقع ہے کہ وہ بنا بتائے غائب ہو گیا ہے۔" شمس الدین دودھ کا گلاس دینے ان کے بیڈروم میں آیا تو انہوں نے اس سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"یہ بات تو میں خود بھی آپ سے کہنے والا تھا ڈاکٹر صاحب.....! ذرا خیر تو لیں داؤد میاں کی۔ ان کے آنے سے تو اس گھر میں رونق محسوس ہوتی ہے۔ پچھلے دو ہفتے سے نہیں آئے تو جیسے ہمارا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا۔"

"ٹیلی فون تو کیا تھا لاہور لیکن نہ گھر پر ملتا ہے نہ بوتیک پر۔ گھر پر جو نوکر ہے بتا رہا تھا کہ رات گئے گھر آتا ہے اور پھر سویرے ہی نکل پڑتا ہے اور بوتیک تو سرے سے جا ہی نہیں رہا۔"

"اللہ خیر کرے۔ ایسا کیا مسئلہ ہو گیا ان کے ساتھ۔" ڈاکٹر ایثار کی فراہم کردہ معلومات پر شمس الدین کی پریشانی مزید بڑھ گئی۔

"یہ معلوم کرنے تو اب لاہور ہی جانا پڑے گا۔ سوچ رہا ہوں کل صبح سویرے نکل پڑوں۔ تم میرا سامان تیار کر دینا۔" انہوں نے شمس الدین کو ہدایت دی تھی۔

داؤد رضا کے گھر پہنچ کر انہیں گھنٹوں اس کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ آدھی رات کے قریب وہ گھر واپس آیا تھا۔ ڈاکٹر ایثار اس کا حلیہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اُلجھے بال، بڑھی ہوئی شیو، میلے کپڑوں اور بے پناہ تھکن کا شکار یہ شخص داؤد رضا تو کہیں سے نہیں لگ رہا تھا۔

"کیا حال کر لیا ہے اپنا داؤد.....!" وہ اسے اس حال میں دیکھ کر بہت دل گرفتہ ہو گئے تھے۔

"وہ میری بات نہیں سنتی۔ مت معاف کرے مجھے۔ جو دل چاہے سزا سنا دے لیکن ایک بار صرف ایک بار میری بات تو سن لے۔ میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے اس سے کتنا پیار ہے۔ کتنی دُعائیں مانگی ہیں میں نے رات دن اس کی جان اور عزت کی سلامتی کے لئے۔ لیکن وہ سنتی ہی نہیں۔ دُنیا کی ہر عدالت میں مجرم کو سزا سنانے سے پہلے ایک بار تو اسے صفائی کا موقع دیا جاتا ہے لیکن وہ کتنی بے رحم ہو گئی ہے اور یہ سارا میرا قصور ہے۔ میں نے اس کی معصومیت کو چھین کر اسے اتنا سنگ دل بنا دیا ہے۔" اسے جیسے کسی اپنے ہی کا انتظار تھا۔ ڈاکٹر ایثار کو اپنے سامنے پا کر ٹوٹ گیا۔

"ریلیکس داؤد.....! ریلیکس۔ مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا ہے۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔"

بکھرا بکھرا سا داؤد جسے انہوں نے بڑی مشکل سے سمیٹا تھا ایک بار پھر ان کے سامنے تھا۔

"عائشہ.....! عائشہ مل گئی ہے مجھے۔" وہ آنسوؤں کی روانی میں انہیں ہر بات بتاتا چلا گیا۔

☆☆☆

"یہ شخص جس کے کرتی کرتی وجود کو سمیٹ کر میں نے ایک کارآمد انسان بنایا تھا برباد ہو جائے، ایسا میں کسی صورت نہ ہونے دوں گا۔ اپنی زندگی کی جو جنگ لڑتے لڑتے یہ نڈھال ہو گیا ہے، اس جنگ میں میں اس کا بازو بنوں گا۔"

سکون آور ادویات کے زیر اثر سوئے داؤد رضا کے چہرے کی طرف دیکھتے انہوں نے عزم کیا اور گھر سے نکل پڑے۔ جبرنا کے گھر کا پتہ تو بہت سے لوگوں کو معلوم تھا۔ وہ بآسانی اس کے گھر کے گیٹ تک پہنچ گئے اور سیکورٹی کے اہل کار کو اپنا کارڈ دیتے ہوئے جبرنا سے ملاقات کی خواہش کی۔

عائشہ نے ان کے وزیٹنگ کارڈ کو حیرت سے دیکھا۔ اس نام کی کسی شخصیت سے وہ واقف نہیں تھی اور موجودہ حالات نے تو اسے بے حد محتاط کر دیا تھا۔ کل رات ہی تو زہرہ بائی کے غنڈے اس کے گھر کے مین گیٹ پر فائرنگ کر کے گئے تھے۔ اسے ڈرانے کے لئے وہ پاگل اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھی۔ یہ ملاقاتی بھی اسے اسی سلسلے کی کڑی لگا۔ وہ

چاہتی تھی کہ ملاقات سے انکار کردے کہ کارڈ کے پیچھے لکھے جملے پر نظر پڑ گئی۔

''عائشہ.....! میں تمہیں تمہاری ماں کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔'' ا
ایسی بات تھی جس کے لئے وہ ہر احتیاط بالائے طاق رکھ سکتی تھی۔ ماں کے مینٹل ہاسپٹل
پہنچنے کی خبر تو اسے بھی تھی لیکن مینٹل ہاسپٹل سے وہ کہاں غائب ہوگئی تھیں یہ اسے معلوم
سکا تھا۔

''اندر بھیج دو ان صاحب کو۔'' اس نے ملازم کو حکم دیا۔

''کہاں ہیں میری امی.....؟ آپ کیسے جانتے ہیں ان کے بارے میں..
ڈاکٹر ایثار کو دیکھتے ہی اس نے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

''بہتر ہے کہ ہم آرام سے بیٹھ کر بات کریں کیونکہ بات کچھ لمبی ہے۔'' م
لہجے میں کہتے وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

''جی.....! اب بتایئے۔'' عائشہ خود بھی ان کے سامنے بیٹھ گئی تھی لیکن اپنی
پر قابو پانا اس کے بس میں نہ تھا۔

''تمہاری امی کی بات کرنے سے پہلے میں داؤد رضا کی بات کرنا چاہتا ہ
انہوں نے اپنی بات کا عکس اس کے چہرے پر تلاش کیا جہاں فوراً ہی غصے کی لالی پھیل گئی

''داؤد رضا نہیں، ڈیوڈ ہے وہ شخص۔ داؤد رضا کا بہروپ بدل کر وہ لوگوں
دیتا ہے۔''

''ہوسکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میرے لئے اس کا داؤد رضا ہونا اہم
کیونکہ میرے سامنے کلمہ پڑھ کر میرے ہی ہاتھ پر وہ ڈیوڈ سے داؤد رضا بنا ہے۔'' ان کی
کردہ اطلاع نے اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

''یہ..... یہ کیسے ممکن ہوا.....؟''

''ویسے ہی جیسے ربّ کائنات کے ''کن'' کہنے پر اس دُنیا کا وجود ممکن ہوا تھا
''بہرحال جو بھی ہو مجھے اس شخص سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آج چاہے وہ کتنا
ہوگیا ہو میرے لئے تو ہمیشہ میری زندگی کو برباد کرنے والا ہی رہے گا۔'' اس کے

نفرت در آئی تھی۔

''کیا تمہاری بربادی میں اکیلے داؤد کا ہی قصور تھا۔ خود تم نے اپنی بربادی میں کوئی
رول پلے نہیں کیا تھا.....؟'' ڈاکٹر ایثار کے سوال نے اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا۔

داؤد کی باتیں اور فریب کاریاں تو واحد سبب نہ تھیں اس کے گھر چھوڑنے کا۔ وہ خود
بھی تو آزاد پنچھیوں کی طرح اُڑنے کی خواہش مند تھی۔ کتنے شکوے اور بدگمانیاں تھیں اس کے
دل میں اپنے ماں باپ کے خلاف، وہ ان کی طرف سے لگائی جانے والی پابندیوں سے عاجز
تھی اور پابندیوں کے اس جال کو توڑ کر بھاگنا چاہتی تھی۔ جب ہی تو داؤد کی سنہری باتوں کے
جال میں پھنستی چلی گئی۔

''کیوں.....؟ ہوناں تم بھی اس کے ساتھ برابر کی قصوروار.....؟ تو پھر تنہا اس
کے لئے کیوں کر سزا کا فیصلہ سنا سکتی ہو.....؟'' وہ اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے اس کی
اندرونی کیفیت بھانپ رہے تھے۔

''تو کیا کروں.....؟ معاف کر دوں اس شخص کو جس نے میرا سب کچھ تباہ کر
دیا.....؟'' وہ چیخ پڑی تھی۔

''ہاں.....! معاف کردو۔ کیونکہ سزا و جزا کا اختیار صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور
اللہ نے اسے سزا دی ہے جو کچھ تم سے چھینا تھا اس نے وہ اس کے پاس بھی نہیں رہا۔'' وہ ذرا
ٹھہر کے۔

''اور اب یوں بھی اس کی حیثیت بدل چکی ہے۔ اب وہ دین اسلام میں داخل ہو
چکا ہے۔ یہ تو تم بھی جانتی ہوگی کہ اللہ دین اسلام میں داخل ہونے والے شخص کے پچھلے
سارے گناہ معاف کر دیتا ہے تو پھر تم اس اللہ پر ایمان رکھنے والی کیسے سنت اللہ کے خلاف جا
سکتی ہو۔'' وہ اسے بہت سمجھاؤ سے سمجھا رہے تھے۔

''داؤد رضا نے پل پل کفارہ ادا کیا ہے اپنے گناہ کا۔ تم اگر آج محفوظ ہو تو اس کی
وجہ سے۔ کتنا گڑگڑایا ہے وہ اللہ کے حضور تمہاری سلامتی کے لئے۔ میں گواہ ہوں اس
بات کا۔ تمہاری ماں جو ایک جوان بیٹے کے ہوتے مینٹل ہاسپٹل میں بے یار و مددگار پڑی تھی

اسے اپنے گھر میں لا کر اس کی دن رات خدمت کی ہے داؤد رضا نے۔ بے شک وہ ہوش
حواس کی دُنیا میں واپس نہیں لوٹ سکیں لیکن مینٹل ہاسپٹل میں ان کے ساتھ جو جانوروں جیا
سلوک ہوتا تھا۔ اس کے بجائے ایک بیٹے کے گھر جیسا تحفظ تو حاصل ہو گیا ہے انہیں۔ داؤ
رضا کی اس ایک اچھائی پر اگر دل سے دھیان دو گی تو اس کے باقی سارے قصور بھی معاف
نے کا حوصلہ پیدا ہو جائے گا تم میں۔'' وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''سیکورٹی کے انتظامات بہت سخت کر رکھے ہیں تم نے۔ لگتا ہے کافی دُشمن پال
ہیں۔ تنہا کب تک ان دُشمنوں کا مقابلہ کرو گی۔ ایک بار ضرور سوچنا۔'' وہ اسے سوچ کر راہ پ
کر خود باہر نکل گئے تھے۔

☆☆☆

''آپ جا رہی ہیں سسٹر.....!'' ایک معصوم سی چھ سالہ بچی نے اس کے گلے
بانہیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں.....! میری ڈیوٹی کا وقت ختم ہو گیا ہے ناں لیکن پرامس کل پھر آؤں گی
اس نے بچی کو پیار کیا۔

''ضرور آنا۔ میں انجکشن صرف آپ سے ہی لگواؤں گی۔ وہ جو موٹی والی سسٹ
ناں اس کے انجکشن لگانے سے مجھے بہت درد ہوتا ہے۔''

''تم فکر نہ کرو سوئٹی.....!'' اس نے بچی کو دلاسا دیا اور وارڈ سے باہر نکل گئی
بے لوث محبتیں تو تھیں جو اس کے دل کو خوش رکھتی تھیں۔

ڈاکٹر ایثار کے مشورے پر اس نے داؤد رضا کو معاف کرنے کا جو فیصلہ کیا
اس کے لئے کسی بھی طرح نقصان دہ ثابت نہ ہوا تھا۔ اپنی ساری جائیداد بیچ کر وہ داؤ
کے ساتھ اس چھوٹے سے شہر میں اٹھ آئی تھی۔ یہاں آ کر اس نے نرسنگ کا کورس کیا
اب لوگوں کے لئے مسیحا کا رول ادا کرتے خود اس کے اپنے زخم بھی بھرنے لگے تھے۔

لاہور میں داؤد کا بوتیک ارم چلا رہی تھی۔ داؤد خود کبھی کبھار وہاں کا چکر لگا
ورنہ اس کی توجہ کا اصل محور وہ اسکول تھا جو اس نے ڈاکٹر ایثار کی مدد سے تعمیر کیا تھا۔ عائ

اپنی جائیداد کی فروخت سے حاصل ہونے والی تمام رقم ہاسپٹل کے لئے مختص کر دی تھی اور اب اس کے پاس ایسا کچھ نہیں تھا جس کے لئے زہرہ بائی اپنے غنڈے اس کے پیچھے لگاتی۔ سترہ سال کی عمر میں اس کی زندگی میں ایک برا دور آیا تھا۔ تین سال اس بھیانک دور میں گزارنے کے بعد بیس سال کی عمر میں ایک بار پھر اسے زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کا موقع ملا تھا اور اس نے اس موقع کو گنوایا نہیں تھا۔

نئی شروع ہونے والی یہ زندگی جذبات سے زیادہ مقاصد کی خوگر تھی۔

''ماما.....! ماما.....!'' ہاسپٹل کے گیٹ پر حسب معمول داؤد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جبکہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ان کے دو سالہ بیٹے نے اسے دیکھ کر آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔

عائشہ کو آتے دیکھ کر داؤد نے پسنجر سیٹ کے ساتھ والا دروازہ کھول دیا۔

''ماما.....! Bear (بھالو)۔'' داؤد نے ہاسپٹل آنے سے پہلے یقیناً اسے یہ کھلونا دلایا تھا۔ جسے اب وہ ماں کو دکھانے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ عائشہ رُخ موڑ کر پچھلی سیٹ کی طرف جھک گئی تاکہ اس کی بات توجہ سے سن سکے۔ اس طرح کرنے سے اس کے بائیں رُخسار کا زخم داؤد رضا کے سامنے آ گیا تھا۔

اس زخم کے نشان کو دیکھ کر بھلے ہی لوگوں کو عائشہ پر رحم آتا ہو لیکن داؤد رضا کو ''اپنے چانڈ'' کا یہ داغ بھی عزیز تھا۔ یوں بھی جن کو چاہا جائے ان کے ظاہر سے زیادہ باطن پر نظر رکھی جاتی ہے اور عائشہ احسان سے عائشہ داؤد بننے کا سفر اتنا کڑا تھا کہ اس کی ذات کی ساری کثافتیں دُھل گئی تھیں۔

☆☆☆

ہمیں عشق راس نہیں

نیپا چورنگی سے بائیں جانب یونیورسٹی روڈ پر گاڑی موڑتے ہوئے یکدم م
آنکھوں میں دُھندلاہٹ اُترنے لگی۔ دُھند کے اس پار ایک بے اختیاری کی کیفیت میں
اسٹاپ پہ کھڑے لوگوں کے ہجوم میں اس شناسا چہرے کو تلاشنے لگا جواب سے ٹھیک چار سا
دو مہینے اور تین دن پہلے اسی موڑ پر مجھ سے بچھڑا تھا لیکن بچھڑا تھا کہنا شاید ٹھیک نہیں
بچھڑتے تو لوگ انجانے میں ہیں۔ میں نے تو خود اپنی مرضی سے اسے اپنی زندگی سے نکالا
اور وہ جگہ جو ہمارے ملنے کا مقام تھی ہماری جدائی کا موڑ بھی بن گئی۔ روز اسی موڑ سے
اسے یونیورسٹی کے لئے پک کیا کرتا تھا اور ایسا کرتے وقت میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ
ایک دن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے یہاں ڈراپ کر دوں گا۔

وہ اور میں جب ساتھ ہوتے تھے تو وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔
چورنگی سے N.E.D یونیورسٹی کے گیٹ، گیٹ سے ڈپارٹمنٹ، ڈپارٹمنٹ سے لائبریری، کینٹ
اور پھر واپس نیپا چورنگی تک میں اور وہ یوں ساتھ رہتے، جیسے ایک دوسرے کا سایہ ہو
صرف یہی نہیں بلکہ اگر ہمارا موڈ پڑوس میں کراچی یونیورسٹی کی سیر کا ہو، سفاری پارک
سامنے کھڑے ٹھیلے والے سے سکنجبین پینی ہو یا کسی اسائنمنٹ کے سلسلے میں شہر کی سڑکوں
خاک چھاننی ہو ہم ہر لمحہ نیپا چورنگی سے ملنے اور بچھڑنے کے درمیانی وقفے میں ایک دوسر
کے ساتھ رہتے تھے۔

ہر صبح سوا آٹھ بجے ہونے والی ہماری ملاقات سہ پہر اور کبھی کبھی شام تک جاری
تھی۔ یہ نہیں کہ اس دوران ہم ایک دوسرے سے باتیں ہی کرتے رہتے ہوں لیکن ایک
اس تھا ایک دوسرے کے وجود کا جو اپنے کاموں میں بری طرح منہمک ہوتے ہوئے بھی
رہتا تھا۔ روزانہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہوئے جب میں نئی حسن (نارتھ ناظم آباد)
وہ شاہ فیصل کالونی کی طرف روانہ ہوتا تو ہم دونوں کے ذہن میں یہی بات ہوتی تھی کہ
کل صبح پھر ہمیں اسی موڑ پر ملنا ہے۔

☆☆☆

ہارون پاشا اور فاخر محمود این ای ڈی کے وہ دو کردار تھے جو ہر اعتبار سے ایک
رے سے مختلف ہونے کے باوجود یک جان دو قالب کی حیثیت سے جانے جاتے۔ ہماری
ں کے درمیان کوئی متضاد خصوصیت آڑے نہیں آئی۔ میرے پاس دولت تھی تو اس کے پاس
ہ۔ میں بہت واجبی سی شکل وصورت کا مالک تھا اور وہ یونانی دیوتاؤں کی طرح خوبصورت
پروقار۔ میں اگر گاڑی دوڑائے پھرتا تھا تو لوگ میری گاڑی کے پیچھے صرف اس لئے
تے تھے کہ اس میں میرے ساتھ فاخر محمود بیٹھا ہوتا تھا۔ لیکن ان سارے اختلافات کے
و کبھی وہ میری دولت سے مرعوب ہوا نہ میں اس کی شہرت سے حسد کا شکار۔ ہم دونوں تو
دوسرے سے یوں محبت کرتے تھے جیسے گلی میں کھیلنے والے دو معصوم بچے جن کے لئے ہر
ں سے بڑھ کر اہم چیز دوستی اور کھیل ہوتا ہے۔

میں اور فاخر کوئی بہت پرانے دوست نہ تھے۔ ہماری دوستی یونیورسٹی جوائن کرنے
بعد ابتدائی دنوں میں ہی ہوئی تھی۔ وہ بہت جلد پوری کلاس پر چھا گیا تھا۔ اپنی ڈھیر ساری
مات، مدلل بحث کرنے اور ذہانت کے بل بوتے پر جہاں اس نے اساتذہ کی نظروں میں
مقام بنا لیا تھا وہاں ہر وقت دوسروں کی مدد کے لئے تیار رہنے کے جذبے، چٹکلے چھوڑنے
عادت اور اچھے اخلاق کی وجہ سے ساتھی طلباء میں بھی مقبولیت حاصل کر لی۔ وہ ایک ہر
شخص تھا جبکہ میں اس کے مقابلے میں بہت زیادہ خاموش اور کچھ کچھ دوسروں سے الگ
الگ رہنے والا لڑکا تھا۔ میری زیرو میٹر گاڑی، قیمتی لباس اور سنجیدہ مزاج کی وجہ سے میرے

کلاس فیلوز کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ "ہارون پاشا" بہت زیادہ مغرور شخص ہے
پھر فاخر محمود نے مجھے دریافت کرلیا۔ میری خاموشی اور سنجیدگی کی دیواروں میں نقب لگا
شخص جانے کس طرح میرے دل تک جا پہنچا کہ میں اسے اپنی ذات کا ہی ایک حصہ
کرنے لگا۔ میں جو اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہونے کے باوجود ہائی سوسائٹی کے اُصولوں
مطابق ان کی عدم توجہی کا شکار تھا، اس کے اماں ابا اور پانچ عدد بہن بھائیوں میں زندگی
رنگ تلاشنے لگا۔ اماں سے بالوں میں تیل کی مالش کروا کے ان کے پلنگ پر سو جانا
شازیہ سے چائے، شربت کی فرمائش کرنا، ناصر بابر اور عاشر کے ساتھ گلی میں کرکٹ کھیلنا
کے ساتھ مختلف موضوعات پر بات چیت کرنا سب ہی کچھ میرے دل کو بہت بھاتا تھا۔
جیسے علم کا خزانہ تھے۔ کے ڈی اے میں اسسٹنٹ انجینئر کی جاب کرنے والا شخص اتنی
قابلیت کا مالک کیسے ہوسکتا ہے اس بات کا اندازہ ان کی کتابوں سے بھری الماری دیکھ کر
تھا۔ دُنیا جہان کے موضوعات پر ان کے پاس معلومات موجود تھیں۔ انہوں نے بے شک
گھر کو وال ٹو وال کارپٹ، اعلیٰ فرنیچر اور قیمتی ڈیکوریشن پیسز سے نہ سجایا تھا لیکن اپنی او
تراش خراش کچھ اس طرح سے کی تھی کہ ہر ایک اپنی جگہ ایک چمکتا دمکتا ہیرا نظر آتا تھا۔

فاخر محمود اپنے والد محمود احمد کی ذات کا فخر تھا اور بالکل بجا تھا۔ خود میں نے
ہارون پاشا نے اپنی دوستی کے چند سالوں میں اس کے ساتھ رہتے ہوئے بارہا خود پر فخر
کیا تھا۔ ہر سمسٹر میں اس کی کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور بنتی تھی۔ وہ ایک بہترین مقرر،
کمپیئر، مصنف جانے کیا کیا تھا۔ مجھ پر تو ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی شخصیت کے
میں ایک نیا انکشاف ہوتا تھا اور پھر بی ای کے تیسرے سال میں جب اس نے ٹی وی
میں ماڈلنگ شروع کی تو اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ لڑکیاں تو شہد کی مکھیوں کی
اس کے گرد گھومتی ہی تھیں، لڑکے بھی اس سے ملنے اور بات کرنے میں فخر محسوس کرتے۔
اتنی ڈھیر ساری محبتوں، چاہتوں اور تالیوں کے شور نے بھی اس کی گردن میں کلف نہ لگنے
وہ ویسا ہی رہا جیسا روزِ اول سے تھا، پوائنٹ سے دھکے کھاتا نیپا چورنگی تک پہنچنے اور مجھ
لفٹ لے کر این ای ڈی تک جانے والا "فاخر محمود"۔

نیپا چورنگی پر پوائنٹ سے اُترنے اور چڑھنے کی ریت بھی اسی نے ڈالی تھی۔ اپنے
اور میرے ساتھ کو طویل کرنے کے لئے ورنہ وہ ڈائریکٹ گھر سے یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے
گھر بھی جا سکتا تھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے جنونی محبت کرتے تھے۔ بقول ہمارے
کلاس فیلو رضا کے ہم نے سسی پنوں، سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں سب ہی کو پیچھے چھوڑ
دیا تھا۔

اور شاید یہ سب کچھ ایسے ہی جاری رہتا، جو ہماری زندگیوں میں ساحرہ جمال داخل
نہیں ہوتی۔ وہ ایک بہت خوشگوار، چمکیلا سا دن تھا۔ فاخر محمود اور میں کراچی یونیورسٹی میں
ہونے والے ایک مباحثے میں شریک ہونے وہاں پہنچے تھے۔ فاخر تو لازمی سی بات ہے وہاں
N.E.D کی نمائندگی کر رہا تھا جبکہ میں اس کے ڈھیر سارے سپورٹرز میں سے ایک تھا۔ یہ اور
بات کہ اسے کسی سپورٹر کی ضرورت کبھی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے لفظوں کی بنت، لہجے کے اُتار
چڑھاؤ، بہترین دلائل اور خوبصورت گمبھیر آواز کے سہارے اپنے مخالفین کو بھی اپنے لئے
تالیاں بجانے پر مجبور کر دیتا تھا۔

اس دن بھی میں اسے روسٹرم کے پیچھے کھڑے بولتا دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہر لفظ،
اسٹائل اور پنڈال سے مسلسل بلند ہوتی تالیوں کی گونج بتا رہی تھی کہ آج بھی فرسٹ پرائز اسے
ہی ملے گا۔ اس کی طرف دیکھتے دیکھتے بس لمحہ بھر کو ہی میری نظر بھٹک کے اپنے برابر والی رو
میں بیٹھی لڑکیوں کی طرف گئی تھی لیکن پھر پلٹ نہ سکی۔ کاسنی رنگ کے سفید کڑھائی والے
کرتے، سفید کاٹن کی شلوار اور آرگنڈی کا بڑا سا دوپٹہ لاپرواہی سے ایک کاندھے پر ڈالے وہ
بھی اپنے پورے گروپ کے ساتھ فاخر کی طرف متوجہ تھی۔ میری نگاہوں کے مسلسل ارتکاز نے
شاید لڑکیوں کی فطری جبلت کے مطابق اسے چونکایا تھا۔ اس نے ایک لمحہ کو گردن موڑ کر میری
طرف دیکھا اور پھر بے نیازی سے دوبارہ فاخر کی طرف متوجہ ہوگئی جو شاید اب اپنی تقریر کا
اختتام کرتے ہوئے کوئی شعر پڑھ رہا تھا۔ اس پل زندگی میں پہلی بار میرے دل میں فاخر محمود
کے لئے حسد کا جذبہ پیدا ہوا لیکن آدھے گھنٹے بعد ہی جب ججوں کے فیصلے کے مطابق پہلا
پرائز جیت کر وہ اسٹیج سے سیدھا میری طرف آیا تو اس سے گلے ملتے ہوئے میں نے دل میں

خود پر ہزار بار نفرین بھیجی۔

"چل یار......! چلنا نہیں ہے کیا......؟" میں جانے کتنی دیر سے اس کا ہاتھ پکڑے کھڑا رہا۔ اس کی آواز پر چونک کر اس سے الگ ہوا۔ بے اختیار ہی میری نگاہ ایک بار پھر اس طرف اُٹھی جہاں وہ پری پیکر بیٹھی تھی۔ لیکن اس بار مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ پوری رو خالی پڑی تھی۔ شاید وہ اور اس کی سہیلیاں اس دوران جب میں فاخر سے بغل گیر تھا، اُٹھ کر جا چکی تھیں۔ اپنی مایوس نگاہ کو میں واپس پلٹانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی چیئر پر رکھی بلیک ڈائری دکھائی دے گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب میں اس کی دید میں معروف تھا تو یہ ڈائری میں نے اس کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ سیاہ رنگ کی ڈائری اس کے ہاتھوں کی سفیدی اور خوبصورتی کو بہت نمایاں کر رہی تھی۔ میں لپک کر اس طرف بڑھا اور ڈائری اپنے قبضے میں لے لی۔

"کس کی ہے یہ ڈائری......؟" فاخر بھی میرے پیچھے چلا آیا تھا۔

"یہاں کچھ لڑکیاں بیٹھی تھیں، ان ہی میں سے شاید کسی کی ہے۔ اس میں سے نام وغیرہ دیکھ کر اس تک پہنچا دیں گے ابھی تو یہاں سے نکلنے کی کرو۔ بہت شدید بھوک لگی ہے۔" میں نے یکدم ہی ہڑبونگ مچا کر بات کا موضوع بدل دیا تھا۔ وہ بھی میرے اس انداز پر مزید کوئی سوال جواب کئے بغیر پنڈال سے باہر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اور جیسے ساحرہ جمال کی وجہ سے اس دن میں نے زندگی میں پہلی بار فاخر محمود سے حسد محسوس کیا تھا۔ اسی طرح بہت کچھ اس کی خاطر پہلی بار اور پھر بار بار کرتا چلا گیا۔ پہلی بار میں فاخر کو بتائے بغیر اسے رضا کے ساتھ باتوں میں معروف چھوڑ کر اکیلا ہی کراچی یونیورسٹی جا پہنچا۔ کیونکہ پہلی بار ہی میرے دل میں خیال آیا تھا کہ فاخر کی شخصیت کے سامنے میری شخصیت کچھ دب جاتی ہے۔ میں پہلی بار اس کی بے شمار خصوصیات سے مرصع شخصیت سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ کہیں ہر لڑکی کی طرح ساحرہ جمال بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہو جائے، اس ڈر سے میں تنہا ہی اسے تلاش کرتا آرٹس لابی میں آئی آر ڈیپارٹمنٹ تک جا پہنچا۔

وہ ڈیپارٹمنٹ کے سامنے بنے لان میں گھاس پر بیٹھی تھی۔ اس کی دو تین سہیلیاں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ سبز گھاس پر کھلتے سرخ رنگ کا لباس پہنے بیٹھی وہ کوئی بیر بہوٹی لگ

رہی تھی یا گلاب کی کلی، میں فیصلہ نہ کر سکا۔ بات کرتے کرتے اس نے اپنے سنہرے بالوں کو ایک ادا سے جھٹکا تو میرے لئے دل کی دھڑکنیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ بلاشبہ وہ سونے کے تار کسی بھی شخص کو خود میں اُلجھا کر ہمیشہ کے لئے قید کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ آج بھی شاید میری نگاہ کے ارتکاز نے اسے مڑ کر میری طرف دیکھنے پر مجبور کیا تھا لیکن کل کی طرح بے زاری سے گردن موڑنے کی بجائے وہ دھیرے سے مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی مسکراہٹ نے میرے اندر بھی حوصلہ پیدا کیا اور میں نے اس کی جانب قدم اُٹھائے۔

"مس ساحرہ جمال......!" سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتا میں اس سے مخاطب ہوا۔

"جی میں ہی ہوں ساحرہ جمال۔ فرمایئے......!" اس کی مسکراہٹ کی طرح آواز بھی بہت خوبصورت تھی۔ سماعتوں میں رَس گھولتی، گنگناتی ہوئی۔

"وہ......کل آپ اپنی ڈائری وہاں پنڈال میں چھوڑ آئی تھیں۔" اس کی ڈائری تھماتے ہوئے میں کچھ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ رُعب حسن ہی اتنا شدید تھا کہ میرے لئے حواس قائم رکھنا مشکل ہوا جا رہا تھا۔

"چھوڑ کر نہیں آئی تھی، رہ گئی تھی۔" میرے ہاتھ ڈائری لیتی وہ کچھ جتانے والے انداز میں کہہ کر کھلکھلائی تھی۔

میرے اردگرد جیسے کوئی رقاصہ گھنگھرو باندھ کر تھرکنے لگی۔ اس کی ہنسی کی آواز نے فضا میں ہر طرف جلترنگ سے بجا دیئے تھے۔

"بہرحال شکریہ مسٹر......!"

"ہارون......! ہارون پاشا......!" میں نے جلدی سے تعارف کروایا۔

اور پھر تعارف کے مراحل سے گزرتی ہماری گفتگو ایک گھنٹے کی طوالت پر پھیل گئی۔ اس دوران اس کی ساتھی لڑکیاں لائبریری جانے کا کہہ کر وہاں سے روانہ ہو چکی تھیں۔ میں جانے کتنی دیر اس کی نیلگوں سبز آنکھوں اور یاقوتی لبوں کے سحر میں جکڑا رہتا جو میرے موبائل پہ نہ بج اُٹھتی۔ دوسری طرف حسب توقع فاخر محمود تھا۔ میرے لئے پریشان ہوتا، میری

خیریت کی طرف سے مشکوک، اس کے لہجے میں اپنے لئے فکر مندی محسوس کر کے میں اند
اندر شرمندہ ہوگیا۔ میرا یوں اچانک بتائے بغیر غائب ہو جانا یقیناً اس کے لئے باعث تشو
تھا۔ اسے اپنی طرف سے مطمئن کر کے میں نے فوراً ہی ساحرہ جمال سے رخصت چاہی۔

''خیریت......؟ کوئی ایمرجنسی ہے کیا......؟'' میرے عجلت بھرے انداز پر اس
استفسار کیا۔

''نہیں......! وہ میرا دوست ہے فاخر۔ میں اسے بتائے بغیر یہاں آ گیا تھا
لئے پریشان ہو رہا ہے۔''

''بہت گہری دوستی لگتی ہے......؟'' وہ مسکرائی۔

''جی ہاں......! بہت زیادہ۔ اچھا بس اب اجازت دیجئے ورنہ وہ میری تلاش
کنوؤں میں بانس ڈلوا دے گا۔''

میں اب صرف فاخر کی پریشانی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ویسے نام رکھنے
نے اس کا نام واقعی بہت سوچ سمجھ کر رکھا تھا۔ وہ حسن و جمال کے ہتھیاروں سے آراستہ
ایسی ساحرہ تھی جو کسی بھی راہ چلتے شخص کو اپنے حسن کے جادو سے پتھر کا بنا سکتی تھی۔

اس روز تو میں نے فاخر کو مطمئن کر دیا لیکن پھر ہر دوسرے دن اپنے گھنٹے دو
کے عدم موجودگی کا سبب بتانے کے لئے میرے پاس کوئی بہانہ نہ بچا اور ایک دن اس
جھنجھلانے پر میں نے اسے حقیقت کہہ سنائی۔

''تو اس میں چھپانے کی کیا بات تھی......؟ بلکہ تجھے سب سے پہلے اس سے
ملاقات کروانی چاہئے تھی۔ اب تو میری مرضی کے بغیر تو میرے لئے بھابی لانے سے رہا
اس کے یکدم پرجوش ہو جانے پر میں شرمندہ ہو گیا۔ نہ اس نے کوئی گلہ کیا نہ
سیدھے سیدھے ایک اچھے دوست کی طرح میری پسند سے ملاقات کرنے کی خواہش کر
لگا۔

اور اس دن پہلی بار میں اسے ساحرہ جمال سے ملوانے لے گیا۔ جتنی عزت
کے ساتھ اس نے ساحرہ سے گفتگو کی اتنے ہی پرجوش انداز میں ساحرہ نے بھی اس کی

کی۔ اپنی زندگی میں شامل دو اہم لوگوں کی یہ ملاقات جو میرے حوالے سے تھی مجھے مطمئن کر
گئی۔ اگر جو وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند نہ کرتے تو میرے لئے بڑی مشکل ہو جاتی۔ کیونکہ
ساحرہ کو چھوڑنے کا تصور ہی اب میرے لئے سوہانِ روح تھا۔ میں جواب تک اس ڈر سے
فاخر کو ساحرہ سے نہ ملواتا تھا کہ کہیں اس کے سامنے میری ذات پس منظر میں نہ چلی جائے،
اب بے تحاشا خوش تھا۔ وہ دونوں کبھی مجھے نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ بلکہ فاخر تو اس سے گفتگو
کرتا ہی میرے حوالے سے تھا۔ اب مجھے اسے اپنی غیر حاضری اور غائب ہو جانے کا سبب
نہیں بتانا پڑتا تھا بلکہ وہ خود ہی سمجھ جاتا تھا کہ میں اس کے ساتھ نہیں ہوں تو پھر ساحرہ کے
پاس موجود ہوں گا بلکہ اکثر میرے کراچی یونیورسٹی جانے اور وہاں سے واپس آنے پر وہ مجھے
''منڈا سسرال جا رہا ہے یا بھابی کے میکے سے ہو کر آ رہا ہے'' جیسے جملے کہہ کر چھیڑا کرتا تھا۔
کراچی یونیورسٹی کو اس نے از خود میری سسرال اور ساحرہ کے میکے کا نام دے رکھا تھا۔

میری اور ساحرہ کی ملاقات کا دورانیہ اب صرف گھنٹے دو گھنٹے تک محدود نہ رہا تھا۔
ہم یونیورسٹی میں تو ایک دوسرے سے ملا ہی کرتے تھے لیکن اب اکثر اوقات ہماری شامیں بھی
ساتھ گزرنے لگی تھیں۔ اس کے ساتھ ہوٹلنگ کرنا، شاپنگ پر جانا سب ہی کچھ مجھے بہت بھاتا
تھا۔ میرے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی سو میں آنکھیں بند کئے اس پر لٹاتا رہا۔ میرے
لائے کے لباس اور جیولری سے خود کو مزین کئے وہ جب بھی میرے سامنے آتی میں اسے دیکھتا
رہ جاتا۔ اس کے دلکش وجود کے سامنے تو قیمتی سے قیمتی لباس اور زیور کی حیثیت ماند پڑ جاتی
تھی۔ ان چیزوں کو پہننے سے اس کی نہیں بلکہ چیزوں کی شان بڑھ جاتی تھی۔ اس کا ہر روپ
بے مثال تھا۔ اس روپ کی دھوپ سے لطف اندوز ہوتا میں ہر روز پہلے سے زیادہ اس کے سحر
میں جکڑتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی پڑھائی، رزلٹ، گھر غرض کسی چیز سے کوئی مطلب نہیں رہا
تھا۔ یہاں تک کہ میں جو ہر ہفتے فاخر کے گھر کا چکر لگاتا تھا اب ہفتوں نہ جا پاتا۔

''اماں تمہیں بہت زیادہ یاد کر رہی ہیں۔'' ایک دن اس نے مجھے اپنی پینٹنگ پر کام
کرتے ہوئے اطلاع دی تو میں جھینپ گیا۔

''بس یار......! تجھے تو پتہ ہے آج کل میری مصروفیت کا۔ وقت ہی نہیں نکال پاتا

میں کہیں آنے جانے کے لئے۔ لیکن اماں سے کہنا انشاء اللہ کل پرسوں ضرور چکر لگاؤں گا

''ہارون.....! تجھے نہیں لگتا کہ تو کچھ غلط کر رہا ہے اپنے ساتھ.....؟'' ا

روک کے اب وہ پوری طرح میری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''کیا مطلب.....؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''مطلب صاف ظاہر ہے میرے بھائی.....! میں دیکھ رہا ہوں کہ تو آج کل کچھ بھلائے بس ساحرہ میں مصروف ہے۔ یونیورسٹی میں تیرا ریکارڈ اتنا خراب چل رہا ڈر ہے کہ کہیں اٹینڈنس کی کمی کی وجہ سے تجھے اس سمسٹر میں شریک ہونے سے نہ روک جائے اور اگر تو نے ایگزام دیا بھی تو کلیئر کیسے کرے گا، جبکہ تو نے کچھ پڑھا ہی نہیں یار.....! عشق دشق تو زندگی کے ساتھ چلتا ہی رہتا ہے لیکن پہلے تو اس ٹارگٹ کو پا کے لئے یہاں آیا ہے۔ پھر جو چاہے کرتے رہنا اور اگر تیرے لئے ساحرہ کے بغیر رہنا مشکل ہو رہا ہے تو سیدھے طریقے سے اپنے پیرنٹس کو اس کے گھر بھیج کر بات طے کر یوں سارا دن شہر کی سڑکوں پر مارے مارے پھرنا کچھ مناسب نہیں لگتا۔'' اس کے اہم سنجیدگی تھی اور مجھے فاخر محمود کی ساری گفتگو میں سے اپنے مطلب کی بات ایک ہی لگی پیرنٹس کو راضی کر کے ساحرہ کے گھر بھیجنا، لیکن اس مرحلے سے پہلے میں ساحرہ کی را چاہتا تھا سو اسی شام جب ہم دونوں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہ تھے، میں نے اسے ہارون کی گفتگو سے آگاہ کرتے ہوئے اس کی رائے لینی چاہی۔

''پلیز ابھی نہیں۔ ابھی مجھے پڑھنا ہے۔'' میری توقع کے خلاف اس نے انکار کر دیا۔

''لیکن کیوں ساحرہ.....! جب ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو تعلق کی ڈور سے بندھنے میں کیا حرج ہے.....؟'' میں نے اسے چاہا۔

''میرے حالات مجھے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ میرے فادر کا تمہیں بتا چکی ہوں کہ ڈیتھ ہو چکی ہے۔ اب میں اور ماہرہ ہی ہیں جو ماما کی زندگی کا

میری خواہش ہے کہ میں پڑھ لکھ کر کسی قابل ہو جاؤں تاکہ اپنی فیملی کو سپورٹ کر سکوں۔''

''تو تم خود کو مجھ سے الگ کیوں سمجھتی ہو.....؟ تم چاہو تو میں تمہاری فیملی کے لئے سب کچھ کرنے کو راضی ہوں۔'' میں نے اسے آفر کی۔

''تم صرف مالی طور پر سپورٹ کر سکتے ہو لیکن میرا پہلا مسئلہ ماہرہ ہے۔ وہ مجھ سے بڑی ہے، جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی میں اپنے لئے کچھ نہیں سوچ سکتی۔'' اس نے مجھے دوٹوک جواب دے ڈالا۔

اس دن کے بعد میں نے کبھی ساحرہ پر اس سلسلے میں دباؤ نہیں ڈالا۔ اپنے مسائل کو وہ خود بہتر طور پر جان سکتی تھی۔ اس سے بحث کرنا یا بہت زیادہ اصرار کرنا اسے اُلجھا دیتا اور میں کسی طور بھی اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ابھی اس نے اپنی والدہ یا بہن کو میرے متعلق آگاہ نہیں کیا تھا۔ بقول اس کے وہ لوگ اس پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے اور یہ سب جان کر انہیں دُکھ پہنچ سکتا تھا۔

فاخر کو بھی میں نے اس کی مجبوریاں بتا کر مطمئن کر دیا تھا اور وہ بھی اس وعدے پر کہ میں اپنی اسٹڈیز پر مکمل توجہ دوں گا، چپ ہو گیا تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد میں نے نوٹ کرنا شروع کیا کہ فاخر کے انداز میں ساحرہ کے لئے وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی۔ پہلے وہ اس سے میرے حوالے سے بہت اچھی طرح ملا کرتا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کے رویے میں تبدیلی آتی چلی گئی۔ اول تو وہ اس سے ملاقات کے لئے راضی ہی نہیں ہوتا تھا اور جو کبھی میرے بہت اصرار پر اس سے مل بھی لیتا تو اس کے انداز میں وہ پہلی سی گرم جوشی نہ ہوتی۔ اس کے برعکس ساحرہ اس سے بہت اچھی طرح ملا کرتی تھی۔ وہ اگر میرے لئے اہم تھا تو ساحرہ بھی اسے پر اہمیت دیتی تھی، لیکن نہ جانے اس کے ذہن میں کون سی گرہ لگ گئی تھی جو وہ دن بدن تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ آخر میں نے ایک دن اس سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یونیورسٹی سے واپسی میں حسب معمول وہ میرے ساتھ ہی موجود تھا۔ اپنی تمام تر ایکٹیویٹیز کے باوجود میں نے اپنا یہ معمول چھوڑا نہیں تھا۔

''کیا بات ہے فاخر.....! تو ساحرہ سے کچھ کھچا کھچا سا رہنے لگا ہے۔''

"کیا تمہیں پتہ ہے ہارون......! ساحرہ ایک ایڈ میں کام کرنے والی ہے......؟"
میرے سوال کے جواب میں اس نے مجھ سے جو سوال کیا اس نے مجھے حیران کر ڈالا۔

"تجھے کیسے معلوم ہوا......؟" میں نے احمقوں کی طرح پوچھا تو وہ مسکرا دیا پھر بولا۔

"میں خود اس فیلڈ میں ہوں۔ بھلا مجھے ایسی کسی بات کا پتہ چل جانا کون سی بڑ بات ہے......؟"

"تو پھر......؟" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"تو پھر کیا......؟ تم نے مجھ سے پوچھا تھا میں ساحرہ سے کھچا کھچا کیوں رہتا ہو میں نے تمہیں سب بتا دیا۔" اس نے بے نیازی سے کندھے اُچکائے۔

"تمہیں یہ بات اتنی بری کیوں لگ رہی ہے جبکہ تم خود بھی کام کرتے ہو......؟" میں نے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

"میں یہ کام اپنی ذات کے لئے یا اپنے گھر والوں کے لئے نہیں کرتا، اس با سے تم بھی واقف ہو۔" اس نے جیسے اپنی صفائی پیش کی۔

"کسی نہ کسی وجہ سے تو کرتے ہو ناں۔ اسی طرح ساحرہ کے پاس بھی کوئی نہ کو وجہ ہوگی......؟" میں پوری طرح سے اس کی وکالت کر رہا تھا۔

"اس جیسی لڑکی کے لئے کوئی بھی کام کرنے کی سب سے بڑی وجہ صرف ہے۔ چاہے وہ اسے ماڈلنگ سے حاصل ہو چاہے تمہارے ساتھ محبت کا ناٹک کر کے۔" کے انداز میں حد درجہ تلخی تھی۔

"تم بے عزتی کر رہے ہو ساحرہ کی۔" میں اس کا الزام برداشت نہ کر سکا اور اُٹھا۔

"بے عزتی اس کی کی جاتی ہے جس کی کوئی عزت ہو۔ میں اس کو سرے سے لائق ہی نہیں سمجھتا۔"

"تم دوستی کی حدود سے تجاوز کر رہے ہو فاخر......!" میں نے اسے تنبیہ جتائی۔

"دوستی کی کوئی حد ہوتی ہی نہیں ہے اور اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو میرے خیال میں تمہیں تی اور اپنی نام نہاد محبت میں سے کسی ایک شے کو منتخب کر لینا چاہئے۔" ہم نیا چورنگی تک پہنچ تھے۔ میں نے گاڑی کو زوردار بریک لگائے۔ فضا میں ٹائرز کی چرچراہٹ بہت زور سے د ہوئی۔ میں بنا اس کی طرف دیکھے ڈرائیونگ سیٹ پر ساکت بیٹھا رہا۔ جو فیصلہ ہو چکا تھا سے سمجھنے میں اس نے چند لمحوں کا توقف کیا اور پھر ایک جھٹکے سے دروازے کا لاک کھول کر گاڑی سے باہر نکل گیا۔

اور پھر یوں فاخر محمود، ہارون پاشا کی زندگی سے بھی باہر نکل گیا۔ میں جو خود کو اس کے بغیر کچھ نہیں سمجھتا تھا، واقعی کچھ نہ رہا۔ یہاں تک کہ وہ ساحرہ جمال جس کی خاطر میں نے اسے اپنی زندگی سے نکالا تھا، وہ بھی میری زندگی میں شامل نہ رہی۔ روز بروز گلیمر کی دُنیا میں لیت حاصل کرتی وہ میرے لئے نایاب ہوتی چلی گئی۔ اس کی تلاش میں دربدر بھٹکتے مجھے ی شے کا خیال نہ رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ہمارے فائنل ائیر کے ایگزام بھی ہو گئے۔ فاخر نے بار بھی سیکنڈ پوزیشن لی تھی جبکہ میں تو سرے سے ایگزام دے ہی نہیں سکا تھا۔ میری بکھری ری شخصیت جسے فاخر کے ساتھ نے سنوار دیا تھا ایک بار پھر مکمل طور پر بکھر چکی تھی۔ فاخر کی ائی اور ساحرہ کی بے گانگی نے مجھے ہوش وحواس سے بیگانہ کر دیا تھا اور شاید میں کبھی اس الم جنون سے واپس نہ آتا جو ساحرہ مجھے اس دن فون نہ کرتی۔

"تم مجھے بھول جاؤ ہارون......! اس لئے کہ میں اب کبھی تمہاری جانب لوٹ کر یں آؤں گی۔ تم اور تم جیسا کوئی دوسرا شخص میرے لئے رستے میں آنے والے کسی پڑاؤ سے ہ کر حیثیت نہیں رکھتا اور محبت کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ محبت تو مجھے اس ے سے بھی نہیں ہے جس سے کل رات میرا خفیہ نکاح ہوا ہے۔ محبت جیسے مقدس جذبے لئے ہم جیسی لڑکیوں کو منتخب کرتے ہوئے قدرت بھی شاید ہچکچاہٹ کا شکار ہو جاتی ہو۔"
یہ بولتے اس کی آواز کانپی تھی اور پھر یکدم ہی اس نے لائن کاٹ دی۔

یوں ہارون پاشا دُنیا میں محبت اور دوستی دونوں ہی رشتوں سے محروم ہو گیا۔ لیکن انگیز طور پر زندگی کے اس موڑ پر جب کوئی مجھے سہارا دینے والا نہیں تھا میں نے خود اپنی

ذات کو سمیٹ لیا۔ اپنے ضائع ہو جانے والے وقت کے ازالے کی کوشش کرتے ہوئے پاپا کے بزنس کو بھی سنبھال رہا تھا اور پاپا جو میرے بی اے کرنے کے فیصلے سے زیادہ خوش تھے، مطمئن ہو گئے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا پھیلا ہوا بزنس جس کا میں واحد وارث تھا، توجہ اور لگن سے مزید پھلنے پھولنے لگا۔ لیکن خود میرے اندر "ہارون پاشا" کا وجود روز مرجھا رہا تھا۔ کبھی کبھی مجھے گمان گزرتا کہ شاید میں مر چکا ہوں۔ ایک ایسی موت جس میں اپنا وجود ہی میری روح کا قبرستان بن گیا تھا۔ لیکن کل رات میری اندھیری قبر میں ایک کھلا تھا۔ ایک پارٹی کے دوران ملنے والا وہ خط جس میں ٹائپ شدہ الفاظ میں فاخر محمود کا درج تھا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے صبح گیارہ بجے یونیورسٹی میں ملاقات کی دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں ایک بار پھر دوستی کی ڈور سے بندھ جائیں۔ پرانے شکوے بھلا کر، ماضی کی کسی تلخ یاد کو دہرائے بغیر۔ اس کے پیغام کو پڑھ کر فرطِ جذبات مجھے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ برسوں بعد میرے اندر زندگی کی رمق جاگی۔ کتنا اعلیٰ ظرف تھا میرا دوست جو میری غلطی کو جتائے بغیر خود سے میری طرف دوبارہ دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ ورنہ ان گزرے ماہ و سال میں خواہش کے باوجود میں اپنے اندر اس کے سامنے جانے کی ہمت پیدا نہیں کر سکا تھا۔ حالانکہ کسی ٹی وی شو میں اسے کمپیئرنگ کرتے اور کسی ماڈلنگ کرتے دیکھ کر میرا دل ہمک ہمک کر اس سے ملنے کے لئے مچلتا تھا اور اب جب چار سال، دو ماہ اور تین دن بعد میں اس سے ملنے کے لئے جانی پہچانی راہوں پر گاڑی تھا تو آنکھوں میں اُترتی دُھند کے باوجود میں اس کے چہرے کو خود سے قریب تر ہوتا محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

جس کی محبت آپ کی رَگوں میں خون کی طرح گردش کرتی ہو وہ یوں پلٹ کر دامن جھٹک کر آگے بڑھ جائے تو دل پر کیا گزرتی ہے۔ یہ شاید مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں جان سکتا۔ جب میں نے ہارون پاشا سے فاخر محمود اور ساحرہ جمال میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کو کہا تھا تو میرے دل میں دُور دُور تک یہ گمان نہ تھا کہ اس کا انتخاب میں نہیں ہوں گا۔

میں بہت خاموشی سے اس کی زندگی سے نکل گیا تھا لیکن میرے اندر ایک شخص تھا جو دن رات اس کی جدائی میں تڑپتا رہتا تھا۔ میں کہیں بھی، کسی کے ساتھ رہوں اس کی یاد میرا دامن چھوڑ کر جانے کو راضی نہ ہوتی تھی۔ وہ میرے وجود کا سایہ تھا۔ سایہ جس کے نہ ہونے سے کام کوئی نہیں رُکتا لیکن جس کا نہ ہونا زندگی میں ان دیکھا، انجانا سا خلا پیدا کر دیتا ہے۔ انسان کو اپنی ذات اُدھوری لگنے لگتی ہے۔ میری زندگی میں بھی کچھ نہیں رُکا تھا، اس کے بغیر بھی میں قدم، ترقی اور شہرت کی وہ سیڑھیاں طے کرتا رہا جن کو کبھی میں نے اپنے لئے ہدف مقرر کیا تھا لیکن پھر بھی مجھے لگتا تھا کہ میری زندگی رُک سی گئی ہے۔ میں ہر بار، اپنی ہر کامیابی پر ٹھٹک کر کچھ دیر رُکتا ضرور تھا کہ شاید اب وہ مجھے پکار لے، یکدم سامنے سے آ کر گلے لگ جائے لیکن یہ انتظار، انتظار ہی رہا۔ اگر چاہتا تو میں خود بھی اس کی طرف رجوع کر سکتا تھا لیکن میری اَنا ایسا کرنے نہیں دیتی تھی۔ یہ دُکھ کہ ہارون پاشا نے مجھے اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا ہے مجھے سکون نہ لینے دیتا تھا۔ میرے بہت چاہنے اور دل کے ہزار سمجھانے پر بھی اس نے مجھے اجازت نہ دی کہ میں پلٹ کر اپنے دوست کو پکار سکوں اور یوں ہمارے رستے جدا ہوتے چلے گئے۔ اس وقت جب وہ ساحرہ جمال کی بے وفائی کا دُکھ سہہ رہا تھا، جذبۂ دوستی نے بارہا میری اَنا کو جھنجھوڑا لیکن ہر بار میری اَنا میرے دل سے جیت گئی۔

ساحرہ کے بارے میں جو کچھ میں جان چکا تھا، اس کے بعد اسے ہارون کی زندگی میں دیکھنا میرے لئے ناقابلِ قبول تھا۔ وہ میرے دل میں ہارون کے لئے محبت اور خلوص کا ہی جذبہ ہی تھا کہ میں اس کی دلی کیفیت کو پوری طرح سمجھے بغیر خود کو ساحرہ کے مدمقابل لے آیا اور میں جو ہمیشہ، ہر جگہ وکٹری اسٹینڈ پر کھڑے ہونے کا عادی تھا، دوستی کے میدان میں ہار گیا۔

میں خود ایک ماڈل تھا اور مجھے ساحرہ کی ماڈلنگ پر واقعی کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن جو کچھ میں نے اس کے بارے میں جانا اس کے بعد اسے برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔

وہ ہارون سے محبت کرتی ہے، اس بات کا یقین اس سے کئی بار ملنے کے باوجود بھی

میں نہیں کر سکا تھا۔ حالانکہ وہ اپنی اداکاری میں بہت پرفیکٹ تھی۔ ہر وقت ہارون کے فکرمند رہنا، اس کا ذکر کرنا، اس کی بات ماننا، اس کی وہ ادائیں تھیں جن میں ہارون اُلجھ لیکن میں اس کی تمام تر پرفیکشن کے باوجود اس بات کو تسلیم نہیں کر سکا تھا۔ مجھے اس کی آ اور چہرے پر کبھی وہ رنگ دکھائی ہی نہیں دیئے تھے جو کسی کی محبت میں دھڑکتا دل رکھ لڑکی کے چہرے پر ہونے چاہئیں۔

اس کی محبت پر شک کرنے کی ایک وجہ شاید وہ منظر بھی تھا جو میں نے یونیورسٹی میں ہونے والے مباحثے کے روز ہارون کے گلے لگتے ہوئے دیکھا تھا خوبصورت سیاہ جلد والی ڈائری قصداً اس نے چیئر پر چھوڑ دی تھی اور اس کے جانے جس طرح ہارون اس طرف متوجہ ہوا تھا، اس چیز نے مجھے چونکا دیا۔ پھر یہ چونکنا بار زندگی کا حصہ بنتا گیا۔ ہارون میں ہونے والی تبدیلیاں اتنی زیادہ اچانک اور غیر معمولی میں اسے ٹوکے بغیر نہ رہ سکا اور میرے ٹوکنے پر ہی وہ مجھے ساحرہ جمال سے ملوانے ساحرہ جمال جو حسن و ادا کے تمام تر لوازمات سے آراستہ تھی، اسے صرف اپنے شک کی ریجیکٹ کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ چنانچہ نہ چاہتے ہوئے بھی صرف ہارون کی خاطر میں اسے برداشت کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ مجھے لگا کہ ہارون مجھ سے دُور ہو ہے۔ ساحرہ کی خاطر اس نے اپنی تعلیم تک داؤ پر لگا رکھی تھی۔ بے شک یہ ڈگری مجبوری یا ضرورت نہیں تھی کہ اس کے والد بہت بڑے بزنس مین تھے، لیکن اس نے بہ سے ان کی تمام تر مخالفت کے باوجود اپنے لئے انجینئرنگ کا انتخاب کیا تھا سو میں اسے بغیر نہ رہ سکا اور میرا خیال تھا کہ اس کے بعد وہ سنبھل جائے گا لیکن وہ نہیں سنبھلا بلکہ نے اپنی مجبوریوں کی داستان سنا کر اسے مزید موم کر دیا۔ ان ہی دنوں مجھ پر انکشاف اپنی دولت بھی بے تحاشا ساحرہ پر لٹا رہا ہے۔ اسے ساحرہ کے ساتھ بڑے بڑے شاپنگ میں، جیولرز کی شاپس اور ہوٹلز میں لنچ اور ڈنر کرتے کئی لوگوں نے دیکھا اور مجھے اطلاع لیکن خود ہارون نے مجھے کچھ نہ بتایا۔ ہماری دوستی میں اس سے پہلے ایک دوسرے بات چھپانے کا موقع کبھی نہیں آیا تھا لیکن اب ہارون مجھ سے بہت سی باتیں چھپانے

ں سب کی واحد وجہ ساحرہ جمال تھی۔ ساحرہ جمال جس کا کردار کچھ کچھ اب میری سمجھ میں نے لگا تھا۔ یقیناً وہ ہارون کی محبت میں نہیں بلکہ اس کی دولت کی چاہت میں اس کے قریب ئی تھی۔ جوں جوں میں اس کی حقیقت کو سمجھتا گیا میرے انداز میں اس کے لئے کھچاؤ کی یت پیدا ہوتی گئی۔

اور اس دن تو میرے دل میں اس کے لئے آخری گنجائش بھی ختم ہو گئی جب میں نے اسے ایک عجیب و غریب میک اَپ سے لپا چہرہ لئے، موٹی سی عورت کے ساتھ شہزاد صاحب کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں دیکھا۔ میرے پوچھنے پر شہزاد صاحب نے اس عورت اور ساحرہ جمال کا جو تعارف میرے سامنے پیش کیا، وہ شاکڈ کر دینے والا تھا۔ شہزاد صاحب کے مطابق وہ عورت ہیرا منڈی کی مشہور طوائف الماس، جبکہ ساحرہ جمال اس کی بیٹی تھی۔ الماس اپنی بیٹیوں ماہرہ اور ساحرہ کے ساتھ دو سال پہلے لاہور سے کراچی شفٹ ہوئی تھی۔ یہاں اس نے ذرا مختلف انداز میں اپنا سیٹ اَپ جمایا تھا۔ وہ خود کو الماس کے بجائے مسز جمال کے نام سے متعارف کرواتی تھی لیکن اس سے اس کی اصلیت تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ فرق صرف کوٹھے کوٹھی میں اُٹھ آنے کا تھا، ورنہ دھندا وہی پرانا تھا جسے ذرا نئے انداز میں انجام دیا جا رہا تھا۔ اس کی بڑی بیٹی ماہرہ کئی غیر ملکی رسائل کے لئے نہایت بے باک قسم کے فوٹو سیشن کروا چکی تھی جبکہ ساحرہ بھی اب اس فیلڈ میں آنے کے لئے پر تول رہی تھی۔ گھر میں معززین شہر کے لئے انجام دی جانے والی خدمات بھی اپنی جگہ بڑی اہم اور سنسنی خیز تھیں۔

''ہارون کو یہ سب میں کس طرح بتاؤں.....؟'' ابھی میں اس پر غور کر ہی رہا تھا کہ وہ طوفان مجھے اس موضوع پر چھیڑ بیٹھا اور میں جو نہ جانے کس طرح اپنے اندر یہ سب دبائے بیٹھا تھا، پھٹ پڑا۔ لیکن ہارون اس کے خلاف کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھا۔ یوں ہماری بے لوث دوستی ایک مکار عورت کی چالبازیوں کا شکار ہو کر ٹوٹ گئی۔

ہارون سے جدا ہونے سے لے کر کل رات تک کا پورا عرصہ میں نے بہت زیادہ بے چینی کے عالم میں گزارا تھا۔ اس دوران ساحرہ نے ماڈلنگ کی دُنیا سے چھوٹی اسکرین اور پھر بڑی اسکرین تک کا سفر بہت تیزی سے طے کیا تھا۔ میں بھی ایک کنسٹرکشن کمپنی میں جاب

کے ساتھ گلیمر کی دُنیا سے اپنا رابطہ قائم رکھے ہوئے تھا۔ میرا سول انجینئر کی حیثیت سے مقام حاصل کرنا ابا کا خواب تھا جسے میں نے ہر ممکن طریقے سے پورا کیا۔ جبکہ گلیمر کی دُ میں نے اپنا تعلق صرف اس چھوٹی سی فلاحی تنظیم کو چلانے کے لئے جوڑے رکھا تھا جسے دَ تعلیم ہی میرے چند دوستوں نے غریب لوگوں کی امداد کے لئے قائم کیا تھا۔

کل اسی تنظیم کے دفتر میں مجھے وہ خط موصول ہوا جس نے میرے تن مردہ میں سرے سے روح پھونک دی۔ ہارون پاشا اپنی غلطی پر شرمندہ تھا اور اب دوبارہ مجھ سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ ماضی کی کسی بات کو دہرائے بغیر۔ یہ وہ پکار تھی جس کا میں گزشتہ چار دو ماہ اور تین دن سے انتظار کر رہا تھا سو فوراً ہی لبیک کہہ اُٹھا اور اب میں N.E.D کی طرف محو سفر ہوں، چند لمحوں بعد وہ میرا جگری دوست میرے سامنے ہوگا اور میں نے لیا ہے کہ میں بغیر شکوہ کئے اسے اپنے گلے سے لگا لوں گا۔ اماں ابا اور بہن بھائیوں کو میں اسپیشل مہمان کی آمد کی اطلاع دے کر آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سب لوگ جو اسے سے اس کی غیر موجودگی پر اُداس ہیں اور میرے کوئی وجہ نہ بتانے بلکہ اس سے رابطہ قائم کی صورت میں خود سے تعلق توڑ لینے کی میری دھمکی پر کچھ کچھ مجھ سے خفا، جب اسے ساتھ دیکھیں گے تو ایک بار پھر ہمارے گھرانے میں خوشی کی لہر دوڑ جائے گی۔

☆☆☆

اور میں ساحرہ جمال ہوں۔ جو یہ بھی نہیں جانتی کہ میرے نام کے ساتھ جڑا احمد کا نام حقیقت میں میرے باپ کا ہے یا پھر ہم فریب کی نگری میں رہنے والوں کا ایک فریب۔

میں نے آنکھ اس ماحول میں کھولی جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ جہ فضاؤں میں طبلے کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار رچی ہوتی ہے۔ جہاں کی ہر ادا، ہر قد کام کے پیچھے صرف ایک مقصد چھپا ہوتا ہے "پیسے کا حصول" محبت، دل، دل کی لگی ہماری زبانوں سے ادا تو بہت کثرت سے ہوتے ہیں لیکن ہم خود ان کے مفہوم کو سمجھنے کی نہیں کرتے اور سچ تو یہ ہے کہ جب بھی ہمارے محلے کی کسی لڑکی نے ان لفظوں کو

کوشش کی شرفاء نے اسے ان کے لئے ممنوع قرار دے دیا۔

میں خود ایسی کئی لڑکیوں کے حال سے واقف ہوں جنہوں نے شریف معاشرے میں ایک باعزت زندگی کا خواب دیکھا لیکن کبھی اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ کسی نے اگر اپنے خواب کی تعبیر پائی بھی تو چند ماہ یا چند سال سے زیادہ اس کا خواب قائم نہ رہ سکا اور وہ لوٹ کر بالآخر ان ہی تاریک گلیوں میں آ گئی۔ جس نے حقیقت کو تسلیم کیا وہ پھر سے گھنگھروؤں کی جھنکار میں اپنا غم بھلانے لگی اور جس نے ایسا نہیں کیا اسے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا پڑا۔ میری ماں نے مجھے اور میری بڑی بہن ماہرہ کو ان لڑکیوں کے عبرت ناک انجام کی کہانیاں اتنی بار سنائی تھیں کہ ہم نے کبھی اس زندگی سے اختلاف کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ ہمیں بڑے گھروں کے صاحبان کے سامنے، ان کی ذہنی سطح کے مطابق پیش آنے کے طور طریقے سکھانے کے لئے تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ کیا گیا۔ لیکن اس تعلیم کا مقصد ہماری ذہنی نشوونما یا روح کی بالیدگی نہیں تھا بلکہ مختلف چیزوں کی طرح یہ بھی ہماری تربیت کا ایک حصہ تھا۔ اپنی ماں کی اور ماحول کی دی ہوئی تربیت کے مطابق میں بھی اپنی بڑی بہن کی طرح ان تمام مراحل سے بخیر وخوبی گزر رہی تھی کہ کراچی یونیورسٹی میں ہونے والے ایک مباحثے میں مجھے وہ نظر آ گیا۔ وہ جسے دیکھ کر میں سب کچھ بھول گئی، اپنی ماں کی نصیحتیں، شرفاء کی نگری میں برباد ہو جانے والی لڑکیوں کے قصے اور خود اپنی حقیقت۔ لوگ مجھے ساحرہ کہتے ہے لیکن میں خود اس کی شخصیت کے سحر میں جکڑ گئی۔ جب وہ اسٹیج پر کھڑا بول رہا تھا تو دل چاہتا تھا کہ اس کے چہرے اور اس کی آواز کے سوا دُنیا سے ہر شے کا وجود ختم ہو جائے صرف وہ ہو سامنے اور میں بیٹھی اسے دیکھتی رہوں، اسے سنتی رہوں۔

مقابلے میں فرسٹ پرائز جیت کر وہ اسٹیج سے سیدھا اس لڑکے کی طرف آیا تھا جس کی نظریں میں نے کئی بار خود پر مرکوز دیکھی تھیں اور پھر جب وہ اس سے گلے مل رہا تھا تو میں جان بوجھ کر اپنی ڈائری وہیں چھوڑ کر اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ وہاں سے نکل گئی تھی۔ نجانے کیوں میرے دل کو یقین تھا کہ اس طرح میں اس سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی اور میرا یقین کسی حد تک ٹھیک ہی نکلا۔ دوسرے ہی دن اس کا دوست میری ڈائری لئے میرے

پاس چلا آیا۔ اس تک پہنچنے کی لگن میں میں اس کے دوست سے تعلقات استوار کرتی چ
اور آخر کار میرے دل کی مراد بر آئی۔ ہارون پاشا خود اسے مجھ سے ملوانے میرے ڈیار
لایا تھا لیکن یہ ملاقات بس اس حد تک ہی کامیاب تھی کہ وہ سحر انگیز شخص مجھ سے متاثر
ورنہ اس کا اصل موضوع تو ہارون پاشا ہی تھا جس کے حوالے سے وہ مجھ سے ملنے آیا تھا
کی نظر میں میری خوبصورتی یا اسمارٹنس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بلکہ میرے خیال میں اگر ہ
پاشا کا حوالہ میرے پاس نہ ہوتا تو وہ مجھ سے بات کرنا گوارا بھی نہیں کرتا۔ یوں صرف
سے ملتے رہنے کی خاطر میں ہارون پاشا کے معاملے کو طول دیتی گئی اور ہارون پاشا مج
زیادہ سے زیادہ انوالو ہوتا چلا گیا۔ اس کی مجھ میں انوالومنٹ میری ماں سے چھپی نہیں
تھی۔ پتہ نہیں اس نے میرے گرد اپنے کتنے جاسوس پھیلا رکھے تھے جو اسے میرے ہر
خبر دیتے رہتے تھے۔ ماں کو مطمئن کرنے کے لئے ہارون پاشا جسے میں فاخر محمود تک
پل سمجھتی تھی، میرا شکار بن گیا۔ جیسے جیسے میں اس سے مال بٹور کر ماں تک پہنچاتی رہ
میری طرف سے مطمئن ہوتی چلی گئی لیکن فاخر تک جانے کا راستہ دشوار ہوتا چلا گیا
اچانک ہی ماں نے مجھے ماڈلنگ کی دنیا میں لانے کا فیصلہ سنا دیا۔ ماں میرے لئے اس
تھی جس کا خوف بچپن ہی سے میرے ذہن پر بری طرح چھایا ہوا تھا سو میں اس کے حکم
انکار نہ کر سکی۔ فوٹو سیشنز اور مختلف شوٹس کے لئے ہمیں اکثر شہزاد صاحب تھے۔ یوں تو
کراچی میں لوگوں سے اپنی حقیقت کو چھپا رکھا تھا لیکن جو اس میدان کے پرانے کھلاڑ
ان کے لئے ہمیں پہچاننا اور پھر ہمارے بارے میں سب کچھ جان لینا کچھ مشکل نہیں تھا

اس دن جب میں نے شہزاد صاحب کے کمرے میں فاخر کو دیکھا اور ان کی
لئے فاخر سے کی گئی گفتگو سنی تو جان لیا کہ اب کچھ باقی نہیں بچا، اب چاہے میں کتنی ہی
کر لوں اس تک پہنچنے کی راہیں ہموار نہ ہو سکیں گی۔ اس طرح میں پوری طرح مای
اشاروں پر چلنے کے لئے تیار ہو گئی اور آہستہ آہستہ ہارون پاشا کی زندگی سے بھی نکلتی چ
ہارون جو مجھے بتا چکا تھا کہ وہ میری خاطر فاخر کو چھوڑ چکا ہے میرے اس بدلتے
برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن میں مجبور تھی مجھے اس کی زندگی سے ہر حال میں نکلنا

اسے پہلے ہی محبت کے نام پر بہت زیادہ لوٹ چکی تھی اب اس کھیل کو مزید جاری رکھنا میرے
ضمیر کو گوارا نہ تھا۔ بہر حال مجھ میں کچھ نہ کچھ انسانیت کی رمق موجود تھی یا پھر یوں تھا کہ محبت کا
جذبہ میرے دل کو چھوتا ہوا گزر گیا تھا یہ تھوڑی بہت انسانیت اسی کی دین تھی جو میں نے
ہارون پاشا اور اس کی دولت کو بخش دیا۔ ویسے بھی شوبز کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد میرے
پاس نئے نئے شکاروں کی کمی نہ تھی۔ جلد ہی میں نے ایک بہت دولتمند وڈیرے سے خفیہ نکاح
کر لیا اور یوں مکمل طور پر ہارون پاشا کی زندگی سے نکل گئی۔ وڈیرے سے میری یہ خفیہ شادی
تقریباً ڈھائی سال چلی پھر ایک بڑی رقم، کوٹھی اور کار کے ساتھ طلاق کا تحفہ دے کر اس نے
مجھ سے اپنی جان چھڑالی۔ مجھے اس طلاق کا کوئی غم نہیں تھا۔ میرے لئے تو ابھی بہت جہان
کھلے تھے جنہیں مجھے تسخیر کرنا تھا اور جنہیں میں یکے بعد دیگرے تسخیر کرتی چلی گئی۔ میں اپنی
زندگی بالکل ویسے ہی گزار رہی تھی جیسی میری ماں کی خواہش تھی اور جس کے لئے میں نے اس
سے وعدہ کیا تھا۔ میری زندگی کی واحد خلش فاخر محمود تھا جسے میں نے اپنے دل کے سب سے
خفیہ خانے میں چھپا رکھا تھا۔ شوبز کی دنیا میں موجود ہوتے ہوئے بھی کبھی اس کا اور میرا سامنا
نہ ہو سکا اور ایسا میری دانستہ کوشش کا نتیجہ تھا۔ ہر وہ پروگرام جہاں اس کی موجودگی کا امکان
ہوتا، میں اٹینڈ کرنے سے انکار کر دیتی۔

مجھے جھٹکا تو اس وقت لگا تھا جب میں نے ایک رسالے میں فاخر محمود کا انٹرویو
پڑھا۔ اپنی زندگی کے سب سے بڑے دکھ کے بارے میں پوچھنے پر اس نے کہا تھا۔

"مجھے اس بات کا سب سے زیادہ صدمہ ہے کہ میرا دوست ایک بری ہستی کے
لئے مجھے چھوڑ گیا۔ میں اپنے دوست سے بہت زیادہ پیار کرتا تھا اور آج بھی اس کی جدائی میں
غمزدہ رہتا ہوں۔"

فاخر محمود اور ہارون پاشا آج تک ایک دوسرے سے جدا تھے، وہ بھی میری وجہ سے،
یہ جان کر مجھے بہت دکھ پہنچا۔ وہ دونوں تو درحقیقت ایک دوسرے کے لئے دل اور دھڑکن
جیسی حیثیت رکھتے تھے۔ بنا دھڑکن کے دل کیسے رہ سکتا ہے یہ میں خوب سمجھتی تھی سو میں نے
فاخر کی زندگی کے سب سے بڑے دکھ کو دور کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ہارون اور فاخر

دونوں ہی شہر کی ممتاز شخصیات تھیں اس لئے ان کے بارے میں تمام تفصیلات جاننے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ میری ہی تیار کردہ پلاننگ کے مطابق دو ٹائپ شدہ خطوط ان دونوا ارسال کئے گئے۔ فاخر کو ہارون کی طرف سے اور ہارون کو فاخر کی طرف سے۔

اور آج جب میں اپنی سیاہ شیشوں والی گاڑی میں بیٹھی N.E.D کے گیٹ سامنے ان دونوں کو ایک دوسرے سے گلے ملتے دیکھ رہی ہوں تو مجھے لگتا ہے مجھ جیسی بری نے کچھ نہ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ وہ دو بہت اچھے انسان جو ایک دوسر سے بہت زیادہ محبت کرنے کے باوجود اپنی اپنی انا کے دائرے میں قید تھے اب یقیناً دوسرے سے جدا نہ ہوں گے کیونکہ اب کوئی ساحرہ جمال ان کے درمیان موجود نہیں۔ ساحرہ جمال تو اپنے دل میں جلتی محبت کی ایک ننھی سی شمع کو چھپائے دھیرے دھیرے دد اور گناہوں کی دلدل میں دفن ہوتی جا رہی ہے اور نجانے مزید کتنی ساحراؤں کو ابھی اس دا کا شکار ہونا ہے۔

☆☆☆

لمحوں کے سراب

”تم نے کس سے پوچھ کر فاطمہ کو اکیلے باہر جانے کی اجازت دی......؟ جوان ہوئیں پارکوں، میدانوں میں ٹہلتی پھریں، ہمارے گھر میں ایسا کوئی رواج نہیں۔ اگر تمہاری بڑی کا دل گھر میں ٹکنے کو نہیں چاہتا تو تم خود اس کے ساتھ جایا کرو۔ اس کے یہ للّے تللّے پورے کرنے، لیکن یوں شترِ بے مہار گھومنے کی اجازت میں ہرگز بھی نہیں دے سکتی۔“

نفیسہ بیگم کی غصیلی آواز نے کمن سے انداز میں سیڑھیاں چڑھتی فاطمہ کی ٹانگوں میں کپکپاہٹ پیدا کر دی تھی۔ اپنی اکلوتی تائی اماں جو کہ پچھلے چار ماہ سے اس کی ساس کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھیں، کے مزاج کا جلالی پن اسے یوں ہی ہولا دیا کرتا تھا۔ اب بھی بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ اپنی نند عالیہ کی فرمائش پر ادیب سے اجازت لے کر قریبی پارک میں واک کے لئے چلی گئی تھی۔ اچھی خاصی اسمارٹ اور ڈبلی پتلی سی عالیہ کو پچھلے پندرہ دن سے اپنے موٹا ہونے کا وہم ستانے لگا تھا اور اپنے اس غیر مرئی موٹاپے کو کم کرنے کے لئے وہ مغرب کے بعد بڑی باقاعدگی سے عباسی صاحب کی بیٹیوں کے ساتھ واک پر جایا کرتی تھی۔ لیکن اب دو چار دن سے یہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ واک پر جاتے ہوئے عالیہ کو ساتھ لے جانا بھول جاتی تھیں۔

نتیجتاً عالیہ یہ کہہ کر کہ پارک پہنچنے پر تو ان لوگوں سے ملاقات ہو ہی جائے گی اکیلی گھر سے نکل جاتی تھی۔ لیکن آج عباسی صاحب کی دوسرے نمبر کی بیٹی مینا نے خاص طور پر ان کے گھر آ کر ادیب کے سامنے اطلاع دی کہ ان کے گھر کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ اس لئے

وہ بہنیں آج واک کے لئے نہیں جائیں گے۔ مینا کی اس اطلاع پر عالیہ پہلے تو خوب جز
ہوئی اور پھر بعد میں فاطمہ سے اپنے ساتھ چلنے کی فرمائش کر ڈالی۔

تائی اماں اس وقت کسی عزیز کی عیادت کے لئے گئی ہوئی تھیں۔ اس لیے فاطمہ کو عا
کی بات ماننے میں کچھ تامل تھا۔ وہ اس کا گھر سے نکلنا پسند نہیں کرتی ہیں۔ یہ بات ان چار
میں وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ لیکن جب ادیب نے بھی اسے عالیہ کے ساتھ جانے کے لئے
تو وہ اس کی بات رد نہ کر سکی۔ مگر اب تائی اماں کی تیز آواز سے اپنی غلطی کا احساس دلا رہی تھی۔
یقیناً ان لوگوں کی عدم موجودگی میں واپس آ چکی تھیں اور اب ادیب سے باز پرس جاری تھی۔

''اماں...... فاطمہ اکیلی باہر نہیں گئی تھی اور نہ ہی اپنے شوق سے گئی تھی وہ تو عا
نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو میں نے اجازت دے دی ورنہ فاطمہ تو منع ہی کر رہی تھی
ادیب اس کی جانب سے وکیل صفائی کا رول ادا کر رہے تھے۔

''عالیہ کے ساتھ کی خوب کہی تم نے میاں...... عالیہ خود بھی بچی ہے، اسے کہا
اس بات کی سمجھ کہ جوان بھابی کے چال چلن پر نظر رکھ سکے۔'' تائی اماں کے لہجے میں جو الز
اور چبھن تھی اس نے فاطمہ کے پیروں کی رہی سہی جان بھی نکال دی۔ ان کی ایسی ہی با
کے خوف سے تو اس نے دروازے سے باہر جھانکنا تک ترک کر دیا تھا اب بھی وہ عالیہ
زبردستی مجبور کر کے صرف پندرہ منٹ میں واپس آ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ زیر عتاب آنے
بچ نہ سکی تھی اور عالیہ جس کی خاطر وہ اتنی باتیں سننے پر مجبور تھی گھر آتے ہی ٹیلی فون کے سا
چپک گئی تھی، پتا نہیں اس کے کون سے کارخانے اور ملیں چل رہی تھیں جہاں کا نظام
کرنے کے لئے ہر دو گھڑی بعد اسے کوئی نہ کوئی اہم فون کرنا ضروری ہوتا تھا۔

''جوان بہو کے چال چلن کی آپ کو اتنی فکر ہے اور جوان بیٹی کی کوئی پرواہ
آخر عالیہ بھی تو روزانہ گھر سے باہر جاتی ہے لیکن آپ کو اس پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا۔''

ادیب بہت دنوں سے اپنی ماں کا فاطمہ کے ساتھ سلوک دیکھنے کے باوجود
تھے لیکن اب جبکہ بات اس کے کردار کی طرف آنے لگی تو خود پر قابو نہ رکھ سکے۔ ان کے
طرح اپنے دفاع میں بولنے پر فاطمہ کی بے جان ٹانگوں میں زندگی کی رمق پیدا کر دی

خود کو گھسیٹتی باقی ماندہ سیڑھیاں طے کر گئی۔

''شرم نہیں آتی بیوی کے خاطر معصوم بہن پر الزام لگاتے۔ یقیناً اس کلموہی نے تمہارے کان بھرے ہوں گے جب ہی اتنی بڑی بات تمہاری زبان سے نکلی ہے۔'' فاطمہ کی طرفداری پر تائی اماں واویلا کرنے لگی تھیں۔

''میں عالیہ پر الزام نہیں لگا رہا ہوں اماں...... اور نہ ہی کبھی لگا سکتا ہوں۔ میری بات کا صرف اتنا سا مطلب ہے کہ عالیہ کی طرح فاطمہ بھی اس گھر کی فرد ہے۔ لہٰذا جتنے حقوق اور آزادی عالیہ کو حاصل ہے اتنے ہی فاطمہ کو بھی ہونے چاہئیں۔'' ادیب کو تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ وہ اپنا غصہ بھول بھال اب بڑے رسان سے انہیں سمجھا رہے تھے۔

''میں بھی کوئی بہو کی دشمن نہیں ہوں بیٹا...... لیکن جب کسی نئے فرد کو اپنے گھر کا حصہ بناتے ہیں تو اس پر اندھا بھروسہ نہیں کر لیتے۔ اچھی طرح ٹھونک بجا کر پرکھنے کے بعد ہی کسی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ اب فاطمہ بے شک تمہارے چچا کی بیٹی ہے لیکن ہم نے، تم نے اسے جانا ہی کتنا ہے۔ تمہارے ابا کے انتقال کے بعد دو چار دفعہ ہی اس سے ملاقات ہوئی ہے وہ بھی اتنی سرسری کہ بندہ ٹھیک طرح سے کچھ جان نہ پائے۔ بہو تو خاندان کی عزت ہوتی ہے، اگر اس کا کوئی قدم ذرا اِدھر سے اُدھر پڑ گیا تو سمجھو ہمارے خاندان کی ساری عزت ملیا میٹ ہو جائے گی۔ رہی عالیہ کو آزادی دینے کی بات تو عالیہ میری بیٹی ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت میں نے کی ہے۔ لہٰذا اس سے کوئی بھول چوک ہو جائے اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فاطمہ بھی ذرا دو چار برس میرے زیر تربیت گزار لے۔ ہمارے ماحول میں ڈھل جائے تو پھر تم دیکھنا کہ اس پر کوئی پابندی نہیں رہے گی۔''

بیٹے کا لہجہ نرم پڑتے ہی تائی اماں کے انداز نے بھی بڑی تیزی سے رنگ بدلا تھا۔ اب وہ نہایت بردبار اور سمجھدار ماں کے روپ میں ڈھلی فاطمہ کے ساتھ روا رکھے جانے والے ناروا سلوک کو اپنے دلائل سے مصلحت اور دور اندیشی قرار دینے میں مصروف تھیں۔ ان کے لہجے میں اپنی تربیت کے بہترین ہونے کا زعم بول رہا تھا۔

☆☆☆

وہ اور اس کی دو چھوٹی بہنیں آمنہ اور خدیجہ امی اور بابا کے ساتھ اسلام آباد پرسکون علاقے میں پھولوں سے ڈھکے چھوٹے سے گھر میں بڑی پیاری اور خوشیوں سے بھ زندگی گزار رہی تھیں۔ ان کے گھر کے ساتھ والے گھر میں رہنے والی خالہ امی کی فیملی ال بھرپور زندگیوں کا لطف مزید دوبالا کر دیا کرتی تھی۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ ان کا کوئی بھا تھا اور خالہ امی کی کوئی بیٹی نہ تھی۔ جہاں خالہ امی کے بیٹے فراز بھائی اور شیراز ان کے بھائیوں کا کردار ادا کرتے، وہیں خالہ امی ان بہنوں کے وجود سے بیٹی کی کمی کو پورا کرتے دونوں گھروں میں پائی جانے والی ایک کمی نے انہیں باہم جوڑ دیا تھا کہ نئے ملنے والوں لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ کون کس کی اولاد ہے۔

فاطمہ کا سارا ددھیال کراچی میں رہائش پذیر تھا لیکن اس سارے ددھیال زیادہ تر دور پرے کے عزیز تھے۔ واحد قریبی رشتہ تایا ابا کی فیملی سے تھا اور وہ بھی برسوں تایا ابا کے انتقال کر جانے کی وجہ سے اتنا مضبوط نہ رہا تھا۔ کبھی کبھار بابا ان کی خیر خیریت وہاں چلے جاتے تھے۔ ایک آدھ دفعہ وہ فیملی کے ساتھ بھی وہاں گئے لیکن تائی اماں کا رسپا اتنا گرم جوش یا معقول نہ تھا کہ وہ لوگ بار بار وہاں جانے کی خواہش کرتے۔ یوں تنہا قریبی رشتہ ہونے کے باوجود بھی تعلقات میں کوئی خاص گرم جوشی نہیں تھی۔ وہ تو پچھلے ادیب اور عالیہ کو اسلام آباد، مری وغیرہ کی سیر کا خیال آیا تو تائی اماں نے ان کے گھر قدم فرمایا۔ اب بھلا کون اچھی بھلی سہولتوں سے آراستہ اور کوئیک سروس والی مفت رہائش کو چھو ہوٹل کے اخراجات میں اپنا روپیہ برباد کرتا۔

لیکن روپے کی یہ تھوڑی سی بچت تائی اماں کو بڑی مہنگی پڑی۔ سب کی خدمت م بستہ، دوڑ دوڑ کر کام کرتی، دھیمے لہجے اور سج سج کر قدم رکھنے والی کامنی سی فاطمہ، ادیب دل کو اس بری طرح سے بھائی کہ واپس کراچی پہنچنے تک اس نے فاطمہ کو اپنانے کا عزم صمیم لیا۔ تائی اماں نے بہت زور مارا کہ کسی طرح ادیب کو اس کی اس خواہش سے دستبردار ہونے مجبور کر سکیں لیکن وہ ذرہ بھر بھی اپنے فیصلے سے ہٹنے کو تیار نہیں ہوا۔

دوسرے نفیسہ بیگم نے خود جب ٹھنڈے دل سے اس رشتے پر غور کیا تو انہیں

سراسر اپنا ہی فائدہ نظر آیا۔ اتنی سیدھی سادی اور باہنر بہو ڈھونڈنے کے لئے تو یقیناً انہیں ور کی خاک چھاننی پڑتی تو ہی جا کر ایسا گوہر مقصود حاصل ہوتا، پھر دیور کا اولادِ نرینہ سے روم ہونا بھی کافی سودمند تھا۔ بیٹے کے نہ ہونے کی صورت میں یقیناً بیٹیوں ہی کو سب کچھ ملنا اور ادیب کی پسند پر فاطمہ کو بہو بنا کر انہیں ادیب پر احسان جتانے اور اس کی بیوی کو دبا کر رکھنے کا جو نادر موقع مل رہا تھا، بھلا وہ اس سے کیوں محروم رہتیں۔ سو جھٹ دیور کو فون کر کے اطمہ کا رشتہ دے ڈالا۔

ادھر فاطمہ یہ سن کر ہکا بکا رہ گئی۔

اپنے قیام کے دوران تائی اماں اسے جن نظروں سے گھورا کرتی تھیں، اس کی مدنظر رکھتے ہوئے تو وہ کبھی بھی اس رشتے کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔ ان کی نظروں میں پوشیدہ طنز کی اٹ اسے بار بار بوکھلا جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ خصوصاً فراز بھائی اور شیراز کو اس سے باتیں کرتا دیکھ کر تو وہ اپنی گول گول آنکھوں کو اتنی معنی خیزی کے ساتھ گھما گھما کر اس کی طرف دیکھتیں کہ اس کے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگتا۔ ایسی صورت میں ان کا اپنے بیٹے کے لئے طلب دینا حیران کن ہی نہیں، پریشان کن بھی تھا لیکن وہ اپنے ان احساسات اور مشاہدات کی بنا بابا کے سامنے انکار نہیں کر سکتی تھی جو اس رشتے پر بے انتہا خوش تھے۔

ایک تو ادیب ان کے مرحوم بھائی کا بیٹا تھا، دوسرے تعلیم یافتہ، خوش اخلاق اور قول شکل بھی۔ سو اسے بھی ہاں کرتے ہی بنی۔ خوش مزاج سے ادیب کا تصور خود اس کے دل کو بھی بار بار دھڑک جانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ ان کی طرف سے "ہاں" میں جواب سن کر تائی اماں نے بجائے منگنی وغیرہ کے چکر میں پڑنے کے براہ راست فون پر ہی شادی کی تاریخ طے کرا لی اور یوں وہ اچانک ہی اسلام آباد سے کراچی شفٹ ہو گئی۔ شادی کے بعد ادیب کی وارفتگی میں کئے گئے جذبۂ محبت کے اعتراف نے اس پر یہ حقیقت بھی عیاں کر ڈالی کہ وہ یہاں صرف ادیب کی پسند بن کر آئی ہے، ورنہ تائی اماں کو خاص دلچسپی نہیں تھی۔ تائی اماں کے علاوہ اس کا دوسرا سسرالی رشتہ عالیہ سے تھا۔

عالیہ اپنی دُنیا میں مگن رہنے والی عجیب اکھڑ اور بداخلاق سی لڑکی تھی۔ کبھی مطلب

ہوتا تو فاطمہ سے اچھے طریقے سے بات کر لیتی ورنہ ''تم کون؟ ہم کون؟'' کی عملی تفسیر بنی رہتی تھی۔ تائی اماں کا رویہ اس سے بھی زیادہ عجیب اور پراسرار تھا۔ زبان سے چاہے وہ اسے آپ لفظ نہ کہیں لیکن ان کی نگاہیں ہر وقت اس کو اپنے حصار میں لئے رکھتیں۔ ان کی عجیب نظروں سے گھبرا کر اس کے اچھے بھلے کام بگڑ جاتے۔ باوجود سادہ مزاج ہونے کے وہ جواعتماد سا اس کی شخصیت میں تھا، سسرال میں قدم رکھتے ہی رخصت ہونے لگا۔ اب تو اور بھی اس کو ٹوکنے لگے تھے کہ وہ جس طرح میکے میں دکھائی دیتی تھی، سسرال میں نظر نہیں آتی جواباً وہ اس سے کوئی شکوہ کرتی بھی تو کیسے۔ صرف نگاہوں کے تیر تو وہ اسے دکھا نہیں سکتی تھی پھر ایسے جملے جو تائی اماں اس کی عدم موجودگی میں اس کے بارے میں ادا کیا کرتی تھیں کسی طرح اس کے کانوں میں پڑ جاتے تھے، ان کی بنیاد بنا کر کوئی جھگڑا کھڑا کرنا کم از کم جیسی صلح جو لڑکی کے لئے ممکن نہیں تھا۔

انہیں اس کا گھر سے نکلنا پسند نہیں، اس بات کا اندازہ بھی اس نے ان کے چہرے کی رویوں کو دیکھتے ہوئے لگایا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ ادیب کے ساتھ کسی عزیز سے ملنے یا گھومنے پھرنے کے لئے جانے والی ہوتی کہ اچانک ہی تائی اماں کی طبیعت شدید خراب ہونے لگتی۔ ماں کو تکلیف کی حالت میں چھوڑ کر تو ادیب بہرحال کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ ایک دفعہ یوں بھی ہوا کہ وہ اور ادیب رات میں اگلے دن کہیں گھومنے جانے کا پروگرام سیٹ کر رہے اور دوسرے ہی دن تائی اماں کو پڑوس میں رہنے والی اپنی عزیز سہیلی راشدہ بیگم کے ساتھ آج کل کی لڑکیوں کے دیدہ ہوائی، آوارہ مزاج اور میاں کو مٹھی میں لے کر پھرنے موضوعات پر تبادلۂ خیال کرنے کا خیال آ جاتا۔ ساتھ ہی وہ اپنے گھرانے اور فاطمہ کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتیں جس نے کبھی گھر کے دروازے سے باہر جھانکا تک نہ تھا اور جس میں اتنا سکون اور آرام تھا کہ بہو کو باہر کی دنیا سے رابطہ کرنے کا خیال ہی نہیں گزرتا تھا۔ چاہے فاطمہ، لاکھ ان کی دوغلی پالیسی کو سمجھتی تھی لیکن وہ ان کے اصولوں سے ہٹ کر کچھ کرنے کی ہمت خود میں نہ پاتی تھی۔ چنانچہ ادیب کو کسی نہ کسی طرح قائل کر کے شام کا پروگرام کینسل کروا لیتی۔

یہ تو اس نے اب جانا تھا کہ وہ اس کے گھر سے باہر نکلنے کے حق میں کیوں نہ تھیں۔ دراصل انہیں تو اس پر اعتبار ہی نہ تھا۔ اسے بے اختیار اپنی شادی کے ایک ماہ بعد پیش آنے والا ایک واقعہ یاد آ گیا۔

اس دن مسز عباسی اپنی بیٹیوں کے ساتھ ان کے گھر آئی ہوئی تھیں۔ ڈرائنگ روم سے آتی آوازوں پر وہ اچانک ہی وہاں چلی گئی۔ مسز عباسی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور سلام دعا کے بعد کہنے لگیں۔

''اچھا ہوا بیٹا.....! تم آ گئیں، ہم لوگ تم سے ملنے ہی آج یہاں آئے تھے۔ بچیاں کہہ رہی تھیں کہ ولیمے کے بعد سے بھابی کی جھلک تک نہیں دیکھی، اسی لئے آج میں خود انہیں لے کر تم سے ملنے آ گئی۔ پر تمہاری ساس نے بتایا کہ تم آرام کر رہی ہو اور انہیں تمہیں ڈسٹرب کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ماشاء اللہ بہت اچھی اور خیال رکھنے والی ہیں تمہاری ساس۔ ان کی قدر کیا کرو۔''

اور بھی مسز عباسی اس سے کچھ کہہ رہی تھیں مگر اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ چائے لانے کا بہانہ کرتی وہاں سے اُٹھ گئی۔ اسے تائی اماں کے جھوٹ پر حیرت تھی کیونکہ انہیں کسی طرح معلوم تھا کہ وہ اس وقت آرام نہیں کر رہی تھی بلکہ ادیب کے کپڑے پریس کر رہی تھی۔ خود وہ اپنے بھی کئی سوٹ اسے پریس کرنے کے لئے دے گئی تھیں۔ ایسے میں ان کا مسز عباسی کے سامنے اس کے آرام کرنے کا بہانہ بنانا ناقابل فہم تھا۔

''نفیسہ بھابی.....! کسی دن اپنی بہو کو لے کر ہمارے گھر آئیں ناں، ہمیں بھی اچھا لگے گا اور یقیناً بچی کا دل بھی بہلے گا۔ نئی نئی شادی ہو کر آئی ہے، ابھی کہاں یہاں کے ماحول سے مانوس ہوئی ہوگی۔''

وہ چائے اور دیگر لوازمات ٹیبل پر سجا کر ڈرائنگ روم سے نکلنے لگی تو مسز عباسی نے تائی اماں سے کہا۔ فاطمہ جو مسز عباسی سے اپنے نہ ملوائے جانے کو تائی اماں کی کوئی مصلحت سمجھ رہی تھی، غیر ارادی طور پر ان کا جواب سننے کے لئے دروازے کے باہر رُک گئی۔

''ہمارے گھر بہوؤں کا محلے کے گھروں میں اِدھر سے اُدھر ڈولتے پھرنا اور ربط

ضبط بڑھانا پسند نہیں کیا جاتا۔ ابھی تو وہ یہاں آئی ہے اور آنے کے ساتھ ہی آس پاس جھانکی شروع کردے، یہ مجھے گوارا نہیں۔"

تائی اماں کے لہجے میں اتنی رعونت اور اکھڑ پن تھا کہ جہاں مسز عباسی اپنی جگہ سی ہو کر رہ گئیں، وہیں فاطمہ کے دل پر بھی گھونسا سا پڑا۔ اسے خود کب اِدھر اُدھر ڈو۔ تاکنے جھانکنے کی عادت تھی۔ البتہ عالیہ خوب اس فن میں ماہر تھی۔ چاہتی تو چھت پر گھنٹوں رہتی، ورنہ کبھی کسی دوست یا محلے دار کے گھر چلی جاتی۔

فاطمہ کی بری کی شاپنگ تک سنا تھا کہ تن تنہا عالیہ نے کی تھی۔ جس گھر میں اتنی آزادی ہو، وہاں بہو پر اس قدر پابندی۔ بھلا کیا معنی رکھتی تھی۔ اس کے اپنے میکے میں حال تھا کہ اگر لڑکیاں اکیلی کہیں جانا چاہیں تو امی فوراً فائزہ بھابی (فراز کی بیگم) کو ان ساتھ کر دیتیں۔ ان کے خیال میں بیاہتا عورت کا ایک اپنا رُعب داب اور سمجھ بوجھ ہوتی جو کہ کنواری لڑکیوں میں نہیں پائی جاتی مگر یہاں تو گنگا ہی اُلٹی بہتی تھی۔ بیٹی سارے میں تنہا مڑگشت کرتی پھرتی تھی اور بہو کے گھر سے باہر جھانک لینے پر بھی عزت پر حرف تھی۔ وجہ تو اس کی سمجھ میں اب آنا شروع ہوئی تھی۔ اس بدگمانی اور شک کی وجہ یقیناً اد فاطمہ کے لئے اظہار پسندیدگی تھا۔ تائی اماں کبھی مر کر بھی تسلیم نہیں کر سکتی تھیں کہ ان کی کبھی ان کے حکم سے روگردانی کر سکتی ہے۔ ادیب، فاطمہ کے معاملے میں ان کے سا بڑھ چڑھ کر بولے تھے تو ان کے خیال میں اس میں سارا قصور فاطمہ کا تھا جس نے نہ کیسے ان کی نظروں کے سامنے ہی سامنے ان کے بیٹے کو اپنے دام میں پھنسا لیا کہ خود ان خبر نہیں ہو سکی۔

☆☆☆

"فاطمہ......! ذرا فون تو ریسیو کرو۔"

کچن سے نکل کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف آتی فاطمہ کو ادیب نے آواز دی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی۔ آج چھٹی کا دن تھا، کل آفس سے آتے ہوئے ادیب فائلز اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ لہٰذا آج سارا دن انہوں نے کامن روم میں بیٹھ

ں سر کھپاتے گزارا تھا۔ اس بے تحاشا مصروفیت کے دوران بار بار بجنے والی فون کی گھنٹی نے ں کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس پر سے کال کرنے والا ہر بار ادیب کی آواز سن کر بنا کچھ لائن کاٹ دیتا تھا۔ فون پر سی ایل آئی کی سہولت ہونے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کہ کال ہر کسی پبلک بوتھ سے کی گئی تھی۔ اس سارے ڈرامے کو دہراتے دہراتے دوپہر سے رات گئی تھی اور اب وہ لوگ رات کا کھانا کھانے ڈائننگ ٹیبل پر جمع تھے کہ ایک بار پھر بج اُٹھنے الی فون کی گھنٹی پر خود فون اُٹھانے کے بجائے ادیب نے اس کام کے لئے فاطمہ کو آواز دے الی۔

"شیراز......! کیسے ہو تم۔ امی، بابا کا کیا حال ہے......؟ سچ بڑی یاد آ رہی ہے تم ب کی۔"

فون اٹھانے پر دوسری طرف سے آتی شیراز کی آواز پر فاطمہ کی آواز جوش اور خوشی کافی بلند ہو گئی تھی۔ نفیسہ بیگم نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں گھماتے ہوئے اس کی رف دیکھا۔

"پاگل ہوئے ہو کیا......؟ یہ کیسے سوچ لیا کہ شادی کے بعد میں تمہیں بھول گئی ہں۔ وہ تو بس موقع نہیں مل پاتا فون کرنے کا ورنہ اسلام آباد میں گزارے وہ اتنے رت دن میری یادداشت سے نکل جائیں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" دوسری طرف سے راز نے شاید کوئی شکوہ کیا تھا جو اپنی محبتوں کی یقین دہانی کروا رہی تھی۔

"ادیب ٹھیک ہیں، گھر میں ہی ہیں۔ رکو، بات کرواتی ہوں میں ان سے تمہاری۔"

شیراز سے کہتے ہوئے اس نے ادیب کو پکارا تھا اور ان کے اُٹھ کر نزدیک آنے پر ر ان کے ہاتھ میں تھما کر خود ڈائننگ ٹیبل پر آ گئی تھی۔

"شیراز کا فون تھا، کہہ رہا تھا کافی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں، لیکن لائن نہیں مل رہی۔" کئی دنوں بعد کسی اپنے سے بات کرنے کی خوشی اتنی بھرپور تھی کہ اس کا بے ساختہ اظہار تے ہوئے اسے بالکل خیال نہیں رہا کہ وہ خود اپنی مصیبت کو آواز دے رہی ہے۔

"لائن ملتی بھی تو کیسے......؟ بہو کی آواز سنے بغیر تو وہ صاحب بھی منہ سے کچھ

پھوٹنے والے نہیں تھے۔" تائی اماں کے طنز نے اسے سن کر ڈالا جبکہ تائی اماں اپنی بات
کے بعد پورے اطمینان سے کھانے کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ عالیہ پہلے ہی ماحول سے
نیاز اپنی پلیٹ میں موجود چاول کے چند لقموں سے کھیلنے میں مصروف تھی۔

"بڑا ہنس مکھ لڑکا ہے یہ شیراز، ذرا سی دیر بات کرنے سے میری تو دن بھر کی
غائب ہو گئی۔" واپس اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے ادیب نے نہایت خوشگوار لہجے میں اسے
کیا لیکن اس کی سفید پڑتی رنگت اور ساکت وجود کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

"کیا ہوا فاطمہ......! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔ چلو چل کر کمرے میں آرا
کھانا تو تم ویسے بھی نہیں کھا رہیں۔ دودھ پی لینا۔" ادیب نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھڑ

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تو ٹھیک تھیں تم۔ یہ اچانک ہی کیا ہو گیا۔" اس کے ہاتھ
ٹھنڈک اور جسم کی لرزش وہ پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

"بہو کو میکے والوں کی یاد ستا رہی ہے، اسلام آباد کا ایک چکر لگوا دو طبیعت
سیٹ ہو جائے گی۔" تائی اماں کی سرد آواز نے اس کے جسم کی لرزش کو کچھ اور بڑھا دیا
ادیب کے سہارے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف جاتے اس
فون کی گھنٹی پر مڑ کر دیکھا، عالیہ بڑی برق رفتاری سے فون کی طرف لپک رہی تھی۔

☆☆☆

"آخر تمہیں ہوا کیا ہے فاطمہ......! وہ لڑکی جسے میں اسلام آباد سے ا
لے کر آیا تھا، یہاں آ کر کہیں کھو گئی ہے۔ نہ تمہارے رخساروں پر دہکتے گلاب نظر آ
ہی تمہاری ہنسی کی وہ کھنک باقی ہے جس نے میرے دل کو اپنا اسیر کیا تھا۔ سچ کہوں تو
ہے کہ میرے ساتھ نے تمہاری شخصیت کا ہر رنگ چھین لیا ہے۔ مجھے ڈھونڈنے پر بھی
فاطمہ نظر نہیں آتی جسے میں نے اپنی چچا زاد کے روپ میں دیکھا تھا۔

"نن...... نہیں......! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ تو بس آج کل میری طبیعت
زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے وہ بمشکل ادھوری وضاحت دینے میں کا
سکی تھی۔ ورنہ اس وقت ادیب کی زبان سے ادا ہونے والے شکوے نے اس کے

تماشا خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ ڈر کہ تائی اماں کی زبان سے نکلنے والے طنزیہ جملوں اور
شک بھرے خیالات نے کہیں ادیب کے دل میں کوئی بدگمانی پیدا نہ کر دی ہو۔ اس کی تمام تر
انائیاں سلب کئے دے رہا تھا۔

"کیا نہیں......! ذرا حالت دیکھو اپنی۔ ایک ذرا سی بات کی ہے میں نے اور تم یوں
لٹھے سے سفید پڑ گئی ہو۔ جیسے خدانخواستہ میں تم پر کوئی الزام لگا رہا ہوں۔ کہاں چلا گیا ہے
تمہاری شخصیت کا اعتماد......؟ کیوں تم اپنے سائے تک سے ڈرنے لگی ہو۔"

ادیب اس کے ڈرے ڈرے انداز پر جھنجلا کر چیخ پڑا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کو
اپنے آپ پر قابو پانا پڑا۔ وہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے سسک سسک کر رو رہی تھی۔

"ایسا مت کرو فاطمہ......! ایسا مت کرو۔ تمہارے ہونٹوں سے جدا ہو جانے والی
مسکراہٹ اور تمہارے بہتے آنسو میرے دل کو بے انتہا تکلیف دیتے ہیں۔" اسے اپنی بانہوں
کے حصار میں لئے وہ اس کی اشک شوئی میں مصروف تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے ادیب......! تائی اماں کا رویہ اور طنزیہ جملے مجھے سکون سے جینے
نہیں دیتے۔ وہ مجھے جتنا دل چاہے برا بھلا کہہ لیں۔ میرے کاموں میں کیڑے نکال لیں میں
اف تک نہیں کروں گی۔ لیکن وہ...... وہ تو میرے کردار پر کیچڑ اچھالتی ہیں۔ پتا نہیں کیسا شک
سمایا ہے ان کے دل میں میرے خلاف کہ وہ مجھ پر رتی بھر بھی اعتبار کرنے کو راضی نہیں اور ان
کی یہ بے اعتباری میری روح کو زخمی کر رہی ہے۔ پھر بھلا میں کیسے آپ کو اپنے پرانے رنگ
میں نظر آ سکتی ہوں۔"

ادیب کی ذرا سی ہمدردی پاتے ہی اس کا سارا غبار باہر نکل آیا تھا۔ آج یوں بھی اس کا
دل بہت دکھا ہوا تھا۔ سہ پہر کو وہ دھلے ہوئے کپڑے پھیلانے چھت پر گئی تو تائی اماں حسب
معمول اس کی نگرانی پر کمر بستہ اس کے پیچھے پیچھے ہی چھت پر چلی آئی تھیں اور پھر نہ جانے کیسے
انہوں نے پچھلی گلی میں واقع کسی گھر کی چھت پر ایک لڑکا دریافت کر لیا تھا۔ پھر جو انہوں نے
اس پر الزام تراشیاں کیں اسے سننے کے بعد وہ اب بھی حیرت میں مبتلا تھی کہ اس کا دل دھڑکنا
کیوں نہیں بھولا۔ تائی اماں کو جواب دینے یا ان سے کوئی گستاخی کرنے کی نہ تو اس میں ہمت تھی

اور نہ ہی یہ سب اس کی تربیت میں شامل تھا۔ چنانچہ باقی کا سارا دن رو رو کر اپنی ہی ج
رہی۔ نتیجتاً رات کو اس کا اُترا اُترا چہرہ دیکھ کر ادیب اس سے باز پرس کرنے پر مجبور ہو گیا

"اماں کا سلوک تمہارے ساتھ اچھا نہیں، اس بات کو محسوس میں بھی کرتا ہ
مداخلت اس لئے نہیں کرتا کہ عورتوں کے معاملات میں مجھے اپنی دخل اندازی اچھی نہ
ایک طرف تم ہو تو دوسری طرف ماں ہے۔ دونوں میں سے ایک کی بھی سائیڈ لوں گا تو
کے دل میں میرے خلاف شکوہ پیدا ہو جائے گا اور یہ میں ہرگز نہیں چاہتا۔ خصوصاً اماں
لئے بھی کچھ کہنے سے پرہیز کرتا ہوں کہ تم سے شادی کے سلسلے میں پہلے ہی ان کی حد
نافرمانی کر چکا ہوں۔ اب اگر تمہاری خود میں کچھ کہوں گا تو یہ تمہارے حق میں اچھا ثابت
کے بجائے مزید برا ہوگا۔ وہ یہی سمجھیں گی کہ تم نے مجھے ان کے خلاف ورغلایا ہے۔ بس
تھوڑی ہمت اور برداشت سے کام لو۔ وہ جو کچھ کہتی ہیں اسے دل پر لینے کے بجائے
سے سن کر دوسرے سے نکال دو۔ تم دیکھنا ایک دن تمہارا صبر ضرور رنگ لائے گا۔ وہ آ
سے بدگمان ہیں ہمیشہ نہیں رہیں گی۔ لیکن بس ایک ذرا انتظار، اور پھر میں ہوں نا
ساتھ۔ مجھ سے بڑھ کر تمہارے کردار اور پاکیزگی کی گواہی دینے والا دوسرا کوئی ہو سکتا
اگر ساری دُنیا مل کر بھی تم پر الزام لگائے تو میں صرف اپنے دل پر یقین کروں گا
تمہاری تصویر میں تقدس و محبت کے سوا کسی دوسرے رنگ کی گنجائش نہیں۔"

اس کے نرم الفاظ اور تسلیاں فاطمہ کے جلتے بلتے دل پر مرہم کا پھایا رکھ رہی

"فٹافٹ.....! پانچ منٹ کے اندر تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس
ہوں۔" ادیب کے الفاظ نے فاطمہ کو چونکایا۔

"ڈاکٹر کے پاس.....؟ لیکن کیوں.....؟ میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"جی ہاں.....! درست فرمایا آپ نے کہ آپ ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن آپ
پر جو حرارت کی منتقلی مجھ میں ہونا شروع ہو چکی ہے اس سے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آ
تیز بخار ہو رہا ہے اور اگر صورتِ حال یہی رہی تو رات بھر میں آپ اس کمرے کے ٹ
اور جیکب آباد کے ماحول کا عکاس بنا دیں گی۔"

ادیب کی مبالغہ کی حد تک کی گئی پیش گوئی پر اسے یکدم ہنسی آ گئی۔ ٹھنڈ میں کپڑے
ہونے اور پھر کئی گھنٹوں تک رونے سے واقعی اسے بخار ہو گیا تھا۔ لیکن اتنا شدید نہیں جتنا
ادیب فکرمند تھے۔ بہرحال وہ ان کے حکم پر تیار ہو کر نیچے آ گئی۔ ادیب اس سے پہلے ہی
کمرے سے نکل چکے تھے۔ ان کے ساتھ گھر سے نکلتے ہوئے آخری لمحے تک اس کا دل کانپتا
رہا کہ اب تائی اماں کی طرف سے کوئی اعتراض آئے گا لیکن خیریت گزری کہ ایسا کچھ نہیں
ہوا۔ شاید ادیب اس کی عدم موجودگی میں ان سے اجازت لے چکے تھے۔

☆☆☆

"ارے بھابی آپ.....! چشمِ بدور! کہیں آج سورج مغرب کی طرف سے تو نہیں
نکلا تھا جو اتنا بڑا انقلاب آ گیا۔ آپ اور اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر کہیں دکھائی دے رہی
ہیں از حد حیرت کا مقام ہے۔"

یہ مسز عباسی کی دوسرے نمبر کی بیٹی مینا تھی جو کلینک کے ویٹنگ روم میں اسے پا کر
بڑی بے تکلفی سے حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔ فاطمہ اس کے انداز پر تھوڑا سا جھینپ گئی وہ تو
شکر تھا کہ ادیب باہر ہی اپنے کسی جاننے والے سے بات کرنے رُک گئے تھے، ورنہ مینا کی
بات سن کر سوچتے کہ شاید فاطمہ نے محلے بھر کو اپنی مظلومیت کی داستانیں سنا رکھی ہیں۔

"تم کیسی ہو مینا.....! یہاں کس کے ساتھ آئی ہو.....؟" نرمی سے پوچھتے اس نے
مینا کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے ان کا چیک اَپ
کروانے آئی تھی۔ اندر روم میں ہیں وہ۔"

"خیریت.....؟ کیا طبیعت خراب ہے ان کی.....؟"

"بس کافی دنوں سے جوڑوں میں درد ہو رہا ہے۔ تکلیف کی شدت سے بخار بھی ہو
جاتا ہے۔ آج کل ہم لوگ ان کی وجہ سے کافی پریشان ہیں۔" مینا نے اُداسی سے بتایا۔

"اچھا.....! جب ہی تم لوگ آج کل واک پر بھی نہیں جا رہیں۔ عالیہ کو بھی اکیلے
کی وجہ سے تائی اماں جانے کی اجازت نہیں دیتیں۔" اس نے نتیجہ اخذ کیا تھا۔

''واک پر تو ہم لوگ روزانہ ہی جاتے ہیں بھابی......! لیکن عالیہ کو جان بوجھ کر بتاتے۔''

''لیکن کیوں......؟'' مینا کے جواب نے اسے اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔

''عالیہ کی وجہ سے ہماری ریپوٹیشن خراب ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہمیں د لوگ ہماری طرف سے بھی مشکوک ہو سکتے ہیں۔'' وہ نہ جانے کون سی پہیلیاں بجوا رہ فاطمہ کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو مینا......! ذرا صاف الفاظ میں بتاؤ۔'' اس کا لہجہ خود بخ تھوڑا سا سخت اور کھردرا ہو گیا تھا۔

''سوری بھابی......! شاید آپ کو سن کر برا لگے لیکن سچ یہی ہے کہ عالیہ وا صرف بہانا بناتی ہے ورنہ اصل مقصد وہاں پارک میں آنے والے کسی لڑکے سے ملاقا ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم نے اسے اپنے ساتھ لے جانا چھوڑ دیا ہے کل کلاں کو کچھ ہوا تو خوا ہمارے سر بھی الزام آئے گا۔''

مینا کی بات اتنی واضح اور غیر مبہم تھی کہ وہ چاہنے کے باوجود اسے جھٹلا نہ سکی۔ بہانے سے گھر سے نکلنا، سارا دن ٹیلی فون سے چپکے رہنا اور بار بار خاموش کالز کا آنا ہر بات کی تصدیق کر رہا تھا۔ اس کے سر میں دھماکے ہونے لگے۔ واپسی پر ادیب نے حد سے بڑھی ہوئی خاموشی پر اسے کریدنا بھی چاہا تو وہ محض اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ گئی۔ کسی شخص کو اس کی بہن کی بے راہ روی کی اطلاع دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اس میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ سارا سارا دن وہ اسی ادھیڑ بن میں رہتی کہ کس طرح اُ سلجھائے۔ کئی بار اس نے تائی اماں کو مطلع کرنے کے بارے میں سوچا لیکن پھر یہ سو گئی کہ وہ اُلٹا اسی کو موردِ الزام ٹھہرا دیں گی۔ عالیہ کو کچھ سمجھانا بھی بے کار ہی تھا کہ ا لڑکی نے اس کی کوئی بات ماننا تو درکنار سننا بھی گوارا نہیں کرنا تھا۔ اس کا دل اندیشوں کا شکار تھا اور ایک دن یہ اندیشے حقیقت کا روپ دھار کر ان کے گھر چلے آ بڑی مونچھوں اور سرخ آنکھوں والا وہ شخص اپنے بھائی کے لئے عالیہ کا سوالی بنا تائی

سامنے موجود تھا۔

''میاں تمہارے گھر کوئی بڑا بزرگ یا خواتین نہیں ہیں جو اس کام کو انجام دیتے۔ لڑکیوں کے رشتے کی بات یوں تو نہیں کی جاتی۔''

اکیلے مرد کا منہ اُٹھا کر عالیہ کے لئے چلے آنا تائی اماں کو سخت ناگوار گزرا تھا۔ لہٰذا بیٹی کی ماں ہونے کے ناطے خود کو بہت روکتے روکتے بھی اعتراض کرنے سے چوک نہ سکیں۔

''بزرگ بھی ہیں اور ماں بہنیں بھی۔ لیکن کوئی بھی یہاں آنے کے لئے راضی نہیں۔ وہ تو سجاد نے خودکشی کی دھمکی دے کر مجبور کیا تو میں اس کی محبت میں یہاں تک چلا آیا۔ پتہ نہیں کیسے وہ آپ کی بیٹی کے جال میں پھنس گیا ہے کہ گھر والوں کی کوئی بات سننے کے لئے تیار ہی نہیں۔ یہاں تک کہ اسے آپ کے اور ہمارے درمیان مسلک کا فرق بھی دکھائی نہیں دے رہا۔'' وہ جو کوئی بھی تھا اس کی صاف گوئی تائی اماں سے بھی کئی گنا زیادہ تھی۔

''میری بیٹی ایسی نہیں۔ بہتر ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں اور آئندہ یہاں آنے کی زحمت نہ کریں۔ اپنے بھائی کی آوارہ مزاجی اور بدنظری کا الزام میری معصوم بچی کے سر رکھتے آپ کو شرم آنی چاہئے تھی۔'' تائی اماں کے الفاظ تو اگرچہ عالیہ کا دفاع کر رہے تھے لیکن ان کے لہجے کی کمزوری پوری طرح محسوس کی جا سکتی تھی۔

''اچھی طرح سوچ لیجئے خاتون......! ہم نے تو خیر اپنی طرف سے فرض پورا کر دیا لیکن اگر کل کلاں کو کچھ ہو جاتا ہے تو آپ ہمیں الزام نہ دیجئے گا۔'' نکلتے نکلتے وہ نہایت تمسخرانہ انداز میں کہہ کر گیا تھا۔

اس کے جاتے ہی تائی اماں جھپٹ کر عالیہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ فاطمہ باہر لرزتی ان کی باز پرس اور جواباً عالیہ کے چیخ چیخ کر اعتراف کرنے کی آوازیں سنتی رہی۔ اس کے اعتراف نے تائی اماں کو جنونی کر دیا تھا۔ وہ بری طرح اسے زد و کوب کرنے لگی تھیں۔ کچھ دیر تو فاطمہ سب برداشت کرتی رہی لیکن جب دیکھا کہ ان کا جنون حد سے گزرنے لگا ہے تو اسے ہی بمشکل انہیں قابو کرنا پڑا۔

''کیا کر رہی ہیں تائی اماں......! آوازیں باہر تک جا رہی ہوں گی۔ اگر آس پڑوس

والے سن کر یہاں چلے آئے تو ہم انہیں کیا جواب دیں گے......؟'' اس کے سمجھانے
ہاتھ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر گیا تھا۔

''اس دن کے لئے تو جنم نہیں دیا تھا اسے کہ یہ بڑھاپے میں میرے سر مٹی
ڈالنے بیٹھ جائے۔'' وہ تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گئی تھیں۔

''تم ادیب سے کچھ مت کہنا فاطمہ......! اسے پتا لگ گیا تو اچھا نہیں ہوگا۔
ان کے لہجے میں خوف تھا۔ فاطمہ کو ان پر ترس آنے لگا۔

''میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی تائی اماں......! آپ فکر مت کریں۔'' اس
دی۔

''کہاں کمی رہ گئی تھی میری تربیت میں جو اس لڑکی نے مجھے اتنا دھوکا دیا......؟ میر
اولاد میری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی اور میں اپنی تربیت پر نازاں اس کے ہاتھو
وقوف بنتی رہی۔'' وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھیں اور فاطمہ سوچ رہی تھی کہ کمی تربیت میں
نیت میں بھی ہوتی ہے۔

وہ جو انسان اپنے آپ کو سب سے ارفع و اعلیٰ سمجھنے لگتا ہے اللہ اسے یوں
دے کر اسے اس کی حقیقت یاد دلا دیتا ہے۔

تائی اماں اپنی تربیت اور اپنے خون کے زعم میں مبتلا اپنی بیٹی پر تو اندھا اعتما
رہیں، لیکن انہوں نے بہو کو اس لائق نہیں جانا اور آج وہ اسی بہو کے آگے جھکے سر کے
موجود تھیں۔

اللہ کتنی جلدی انصاف کرنے والا ہے۔ فاطمہ پر لگایا گیا ہر الزام آسمان کی
پھینکے گئے پتھر کی طرح آج واپس پلٹ کر ان کی طرف آیا تھا۔

انسان کو ہمیشہ بڑے بول اور غرور سے پرہیز کرنا چاہئے۔ خصوصاً بیٹیوں کی ما
کیونکہ کسی دوسرے کی بیٹی کو دی گئی بددعا، اس پر لگایا گیا کوئی الزام بہت جلد پلٹ کر
کی طرف آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

اِس پرچم کے سائے تلے

''واپسی کب تک ہوگی آپ کی......؟'' سبز بارڈر والی سفید شفون کی ساڑھی کا ناقدانہ نظروں سے جائزہ لیتی رہنما نے سمیع جمال سے پوچھا۔

''رات کے دس ساڑھے دس تو ہو ہی جائیں گے۔ صبح پرچم کشائی کی تقریب میں شرکت کے بعد اچھا خاصا وقت تو چیدہ چیدہ شخصیات سے ملاقات میں ہی گزر جائے گا۔ اس کے علاوہ کل شام کی چائے پر باجوہ صاحب نے اپنے گھر انوائٹ کر رکھا ہے، ان سے کچھ اہم معاملات پر بات چیت کرنی ہے۔ لہٰذا وہاں بھی کافی ٹائم لگ سکتا ہے۔'' بریف کیس میں ضروری چیزیں سیٹ کرتے ہوئے سمیع جمال نے جواب دیا۔ اب سے کچھ دیر بعد انہیں اسلام آباد جانے والی فلائٹ میں سوار ہونے کے لئے ائیر پورٹ روانہ ہونا تھا۔

''یعنی صبح اسکول کی ساری مصروفیات نمٹانے کے علاوہ مجھے رات مسٹر افتخار کے گھر ہونے والا فنکشن بھی اکیلے اٹینڈ کرنا ہوگا۔'' وہ تھوڑا سا جھنجھلائی۔

''تو یہ کون سا تمہارے لئے کچھ نیا ہے جو تم اتنا ڈپریسڈ ہو رہی ہو۔ ویسے بھی کل تمہارے اسکول کے فنکشن کا سارا کام تو وہ تمہاری انچارج مسز قیوم سنبھال لیں گی، اسپیچ کے سلسلے میں چاہو تو میری سیکرٹری سے بات کر لو۔ تمہیں اس کے پاس سے بہت اچھا میٹریل مل جائے گا۔'' بریف کیس کی سیٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد اب سمیع جمال اپنی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کر رہا تھا۔ البتہ ساتھ ساتھ بیوی کو نمٹانے کا فریضہ بھی انجام دیا جا رہا تھا۔

''اسپیچ کی تو خیر مجھے کوئی فکر نہیں۔ آپ کی سیکرٹری سے ہزار گنا اچھا لکھ سکتی ہ
میں۔''

''اوہ......! میں تو بھول ہی جاتا ہوں کہ یہ حب الوطنی، اتحاد، تنظیم، یقین دوسرے ایسے ہی بے شمار ٹاپکس پر لیکچرز سن سن کر ہی تو تمہاری پرورش ہوئی ہے۔ تمہیں و اس سلسلے میں کسی سے ہیلپ لینے کی کیا ضرورت......؟ اور اگر ضرورت ہو بھی تو تم اپنے ا گرامی سے مدد لے سکتی ہو۔'' وہ طنزاً ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''اوہو......! بابا کو فون کرنا تو یاد ہی نہیں رہا۔ کل کے فنکشن میں اگر ان کی شرکت بھی ہو جائے تو خوب رہے گا۔ یوں بھی آج کل ان کی ستوط ڈھاکہ پر لکھی جانے والی کتا کافی مشہور ہو رہی ہے۔'' سمیع کے طنزیہ الفاظ پر اسے بابا کا خیال آیا تو وہ انہیں فون کر کے لئے ٹیلی فون کی طرف بڑھ گئی۔ لیکن نمبر ڈائل کرنے سے پہلے ہی دروازے پر دستک متوجہ کیا۔

''یس......! کم آن......!'' اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

''بیگم صاحبہ......! ڈرائیور آ گیا ہے ٹیلر کے پاس سے۔ لیکن آپ کا بلاؤز نہیں لا کہتا ہے ٹیلر ماسٹر کی ماں ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے اس لئے وہ آپ کا بلاؤز سی نہیں سکا۔ آپ اجازت دیں تو وہ اپنے کسی کاریگر سے سلوا کر بھیج دے......؟'' گھریلو ملازمہ مؤد کھڑی اس سے کہہ رہی تھی۔

''اس ٹیلر ماسٹر کو کہلوا دو کہ مجھے ابھی دو گھنٹے کے اندر اندر اپنا بلاؤز چاہئے وہ ب صرف اسی کے ہاتھ کا سلا ہوا۔ اتنے ڈھیروں روپے میں اس لئے نہیں دیتی کہ اس کے نا شاگردوں کے ہاتھ کے سلے کپڑے پہنوں اور ہاں اس سے کہنا کہ آئندہ اس قسم کے بہان بنائے تو ایک کپڑا بھی اسے نہیں دوں گی سینے کے لئے۔ شہر میں کوئی کمی نہیں ہے اچھے ٹیل کی۔'' اسے معلوم تھا کہ ٹیلر ماسٹر کے اوپر اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوگا کیونکہ وہ ہر ہزاروں روپے صرف رعنا کے کپڑوں کی سلائی سے ہی حاصل کرتا تھا۔

''ماں ہاسپٹل میں ہے تو وہ اسٹوپڈ کیا ڈاکٹر ہے جو اسے ٹریٹمنٹ دینے کے

وہاں موجود ہے۔ یہ نہیں کہ اپنا کام دھندا کرے۔ ماں کو سنبھالنا ڈاکٹروں کا کام ہے وہ سنبھال لیں گے۔'' بڑبڑاتے ہوئے وہ ایک بار پھر فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

لکڑی کا سبز روغن والا دروازہ وا کرتے ہی مٹی کی سوندھی خوشبو ان کے نتھنوں سے ٹکرائی اور وہ دل میں اُٹھتی خوشی اور انبساط کی لہروں کو محسوس کرتے ہوئے کھل کر مسکرا دیئے۔ گزشتہ چھپن برس کی طرح آج بھی یوم آزادی کی صبح خالق کائنات کی رحمتوں بھری برسات سے ہوئی تھی اور اب ہر سو ایک مسحور کن خوشبو کا راج تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ اتنی دلفریب خوشبو صرف پانی اور کچی مٹی کے ملاپ سے نہیں پھیلی۔ اس خوشبو میں کچھ اور بھی شامل ہے۔ وطن کی بنیادوں میں موجود شہیدوں کے خون کی خوشبو اور دراصل یہی خوشبو تو تھی جو سید عزیز بن مظفر کو تازہ دم رکھتی تھی۔ ماضی کے غم، حال کی زبوں حالی اور مستقبل کا کوئی اندیشہ انہیں اس وطن کی طرف سے مایوس نہ ہونے دیتا تھا۔

آزادی کی معطر فضا میں گہرے سانس لیتے ہوئے انہوں نے چوکھٹ سے باہر قدم رکھا۔ اسی دم ان کی اُنگلی تھامے ایک معصوم بچی بھی ان کے ہمراہ چل پڑی تھی۔ مضبوطی سے قدم اُٹھاتے ہوئے وہ اس بچی کی ہمراہی میں بے انتہا خوش تھے۔ اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور کوئی شے ان کے پیروں سے ٹکرائی۔ انہوں نے جھک کر اس شے کو دیکھا اور اذیت کی ایک لکیر سی ان کے چہرے پر کھنچتی چلی گئی مگر یہ کیفیت بس پل بھر کے لئے ہی جاگی تھی۔ اب وہ آنکھوں میں ایک نیا عزم سجائے اپنے قدموں کی طرف جھک رہے تھے۔ انہوں نے قدموں میں پڑی شے کو اُٹھا کر اپنی اُنگلیوں کی مدد سے اس پر لگی مٹی کو صاف کیا۔ سبز کاغذ کے مستطیل ٹکڑے پر مٹی سے چھپ جانے والا تارہ نئے سرے سے چمک اُٹھا۔

''بابا......! یہ کیوں اُٹھایا آپ نے......؟ دیکھیں آپ کے سارے ہاتھ گندے ہو گئے۔'' ان کی اُنگلی تھام کر چلتی بچی نے انہیں ٹوکا۔

''نہ بیٹی......! ہاتھ گندے نہیں ہوئے۔ بھلا اپنے وطن کی مٹی بھی ہاتھ گندے کرتی ہے۔ یہ تو آدمی کا فخر ہوتی ہے۔ اس مٹی کا بادٔ تو سونے سے بھی بڑھ کر ہے اور پھر تو یہ بھی تو

دیکھ کہ میں نے ہاتھ کسی معمولی شے کو اُٹھانے کے لئے مٹی میں نہیں ڈالے بلکہ اپنے پرچم قدموں تلے آنے سے بچانے کے لئے ڈالے ہیں۔ یہ جو سبز ہلالی پرچم ہے ناں بیٹا......! ہمارا سب کچھ ہے۔ اگر ہم اسے قدموں تلے روند کر گزر گئے تو ہمارے لئے اس دُنیا میں بھی نہ بچے گا۔" ان کا گلا رُندھنے لگا تھا لیکن جلد ہی انہوں نے خود پر قابو پالیا۔

"چل بیٹا......! تجھے اسکول تک چھوڑ دوں۔ راستے میں جتنی جھنڈیاں گری ملیں گی، دونوں باپ بیٹی مل کر سمیٹ لیں گے۔" جگہ جگہ بارش اور ہوا کے زور سے گر کر بکھر جانے والی جھنڈیوں کو چنتے وہ اپنے مخصوص راستوں پر آگے بڑھ رہے تھے۔ لیکن ان کی اُنگلی تھام چلتی معصوم بچی اب ان کے ہم قدم نہیں تھی۔ اب سے نہیں برسوں سے وہ اس کے بغیر ہی راہوں پر چل رہے تھے۔ جانے کب اس نے ان کی اُنگلی چھوڑ کر اپنے قدموں کو ان راہوں سے جدا کر لیا تھا۔ لیکن وہ خود اپنی راہ نہیں بدل سکتے تھے۔ بچپن، جوانی، ادھیڑ عمر سب ہی کچھ تو اس راہ پر چلتے ہوئے بتائے تھے پھر اب آخری عمر میں بھلا کیونکر راستہ بدلتے

بہت اچھی طرح یاد تھا انہیں جب پاکستان بنا تو وہ صرف آٹھ سال کے تھے آزادی کی اصل اہمیت سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اپنے بڑے بھائی اور ... کے ساتھ آزادی کے نعرے لگائے تھے اور اپنے ماں باپ اور تین گبھرو جوان بھائیوں شہادت کی صورت آزادی کی قیمت بھی چکائی تھی۔ انہیں اب تک وہ آٹھ سال کا بچہ بھولا تھا جو گندم کی بوریوں کے پیچھے چھپا اپنے گھر والوں کے خون سے کھیلا جانے والا خونی کھیل بے بس اور ساکت نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے خود پر ٹوٹنے والے غم کے اس پہاڑ نے وقت اس بری طرح ہراساں کیا تھا کہ وہ بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ پھر ماما ظہور تھے جنہوں نے اس کے ریزہ ریزہ وجود کو سمیٹا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ مشرقی پاکستان لے گئے تھے۔

ماما ظہور اس کے اکلوتے ماموں تھے۔ اسی کی طرح ان کا پورا گھرانہ بھی فسادات آگ کی لپیٹ میں آ کر ختم ہو گیا تھا لیکن اس آگ سے بھی وہ اپنا عزم، اپنی ہمت اور حب الوطنی کو بالکل صحیح سالم نکال لانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اسی عزم و ہمت کو زادِ راہ بنا کر انہوں نے سید عزیز بن مظفر کی پرورش کی تھی۔ محبِ وطن، جوشیلا اور پرعزم صحافی...

ایک نوآموز نوجوان، عزیز ان کے ہر خواب کی تعبیر تھا۔ انہوں نے عزیز کی شادی اپنے ایک دوست کی بیٹی سے کر دی تھی۔ ان کا گھرانہ امن، محبت اور خوشحالی کا ایک عمدہ نمونہ تھا۔ جس کے در و دیوار ننھی رعنا کی قلقاریوں سے گونجتے تھے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ پنپتی سازش نے ایک خوفناک طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ بنگالی، بہاری کے جدا جدا ناموں نے ان سے ان کی مشترکہ شناخت "مسلمان" کو چھین لیا اور وہ سارے خونی منظر جو 47ء میں پاکستان بناتے ہوئے دیکھنے کو ملے تھے ایک بار پھر جاگ اُٹھے۔ ایک بار پھر سید عزیز بن مظفر کو اس آٹھ سالہ لڑکے کے دُکھ سے گزرنا پڑا۔ بس اب مقامات بدل گئے تھے۔ ماما ظہور کی جگہ وہ خود آ گئے تھے اور اس آٹھ سالہ لڑکے کی جگہ ان کی آٹھ ماہ کی بچی نے لے لی تھی۔ ماما ظہور اور اپنی پیاری بیوی کی خون آلود لاشوں کو چھوڑ کر انہوں نے ایک بار پھر ہجرت کے دُکھ کو سہا تھا۔ اس دوسری ہجرت نے انہیں پہلے سے زیادہ زخم زخم کیا تھا کیونکہ پہلی ہجرت کچھ پانے کے لئے کی گئی تھی، لیکن اس دوسری ہجرت نے ان سے ان کا آدھا وطن چھین لیا تھا۔ ان کے دل کو دولخت کر دیا تھا لیکن وہ پھر بھی ہارے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی تمام تر ہمتیں طوفان کی زد سے بچ جانے والے اپنے باقی ماندہ آشیانے کی حفاظت میں صرف کر دی تھیں۔

وہ صحافت کے ساتھ ساتھ تدریس کے شعبے سے بھی منسلک ہو گئے تھے۔ رعنا کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے بہت سے بچوں کے دل و دماغ میں بھی حب الوطنی کا جذبہ نقش کر دینا چاہتے تھے لیکن ابھی ان کی راہ کی کٹھنائیاں کچھ اور بھی باقی تھیں۔ ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود رعنا وہ نہ بن سکی جو وہ اسے بنانا چاہتے تھے۔ ذہین و فطین رعنا، تعلیم، تحریر، تقریر ہر میدان میں ان کی جانشین تھی لیکن وہ دیپ جو سید عزیز بن مظفر کے دل میں جلتا تھا رعنا کے دل کے ایوانوں کو منور نہ کر سکا۔ وہ سب کچھ بنی لیکن وہ نہ بن سکی جو وہ اسے بنانا چاہتے تھے۔ اس کے قومی اسمبلی کے ایک رُکن کے بیٹے سمیع جمال سے شادی کے فیصلے نے انہیں اندر سے بالکل ہی توڑ دیا تھا۔ سمیع جمال کا باپ ایک انتہائی کرپٹ سیاست دان تھا۔ سمیع جمال ان کا ... تھا لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی رعنا کو اس کے فیصلے سے باز نہ رکھ پائے۔ شہرت، دولت، عہدہ جب ایک ساتھ ہاتھ باندھے سامنے کھڑے نظر آئیں تو ان کی طرف جانے والوں کو

روکا نہیں جا سکتا۔ ان کے خدشوں کے عین مطابق رعنا اپنے سسرال کے ماحول میں مکمل طو
ڈھل گئی تھی۔

پچھلے سال اس نے پوش علاقے میں ایک نہایت عمدہ انگلش میڈیم اسکول کھولا
اس کا اسکول ہائی سوسائٹی کے تمام تر تقاضوں کو پورا کرتا تھا لہٰذا ایک سال کی مختصر مدت میں
اس کا یہ بزنس بے حد کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔

''اوہ.....! مجھے تو رعنا کے اسکول جانا تھا۔ نہیں گیا تو وہ ناراض ہوگی۔'' اسکو
خیال آنے پر انہیں کل رات آنے والی رعنا کی کال یاد آئی۔ وہ ان کی تمام تر عذرا تراش
کے باوجود ان کے فنکشن میں شرکت کے لئے بضد تھی۔ اس کی زندگی کے سیٹ اَپ سے
ترین اختلاف رکھنے کے باوجود وہ اکثر اس کی محبت سے ہار جاتے تھے۔ فنکشن میں جا
ارادہ کرتے ہوئے وہ تیز تیز قدموں سے واپس گھر کی طرف لوٹ گئے۔

☆☆☆

اس پرچم کے سائے تلے.....

ہم ایک ہیں.....

ہم ایک ہیں.....

سانجھی اپنی خوشیاں.....

سانجھی اپنی خوشیاں اور غم ایک ہیں.....

ہم ایک ہیں.....

اس پرچم کے سائے تلے.....

اسٹیج پر موجود بچوں کا گروپ پورے انہماک سے ملی نغمے کے بول پر پرفا
دے رہا تھا۔ تمام بچوں نے سفید شلوار قمیص زیب تن کر رکھی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں
سائز کے پرچم موجود تھے۔ جنہیں وہ پورے جوش و خروش سے لہرا رہے تھے۔ البتہ بچ
اس گروپ کی قیادت کرنے والے بچے نے بڑا سا جھنڈا تھام رکھا تھا جس نے حقیقتاً
کو اپنے سائے تلے لے رکھا تھا۔

بڑی دیر سے کوفت زدہ انداز میں اُلٹے سیدھے آئٹم دیکھتے ہوئے سید عزیز بن مظفر
کے ہونٹوں پر دلفریب سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ان کی نگاہوں کا خصوصی مرکز گروپ لیڈر ہی تھا
ارکیوں نہ ہوتا آخر کو وہ ان کا اکلوتا نواسا تھا۔ ان کی تجربہ کار نگاہیں اس ننھے مجاہد میں وہ جذبہ
ار سرشاری دیکھ رہی تھیں جو وہ ہزار چاہنے کے باوجود رعنا کے اندر پیدا نہیں کر سکے تھے۔

بچوں کی پرفارمنس کے بعد رعنا اسٹیج پر آئی تھی اور پھر اس نے ہمیشہ کی طرح سحر انگیز
انداز میں سماں سا باندھ دیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''14 اگست کے اہم دن کے حوالے سے اگر میں کچھ کہنا چاہوں تو میرے پاس
سے الفاظ ہیں کہ میں گھنٹوں بولوں تو بھی ختم نہ ہوگا۔ لیکن آج میں خود اپنے کہنے سے زیادہ
اپنے معزز مہمانانِ گرامی کو زحمت دینا پسند کروں گی۔ البتہ میری خواہش ہے کہ آج کے اس
اہم موقع پر میں آپ کو اپنے اسکول کی کارکردگی اور طریقہ تعلیم سے متعلق چند اہم باتیں بتاتی
چلوں۔'' اس کی تقریر کے اگلے 15 منٹ صرف اسی موضوع پر تھے۔ سید عزیز بن مظفر بے
دلی سے پہلو بدلنے لگے۔

''اور آخر میں آپ سب بچوں کو ایک نصیحت کرنا چاہوں گی جو میرے بابا بچپن سے
کرتے آ رہے ہیں۔'' مائیک میں اس کی گونجتی آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

''ہمارا پرچم ہماری قومی عظمت کا نشان ہے۔ اس کی عظمت کو برقرار رکھنا ہم سب کا
فرض ہے۔ اس پرچم کے سائے تلے ہم سب متحد ہیں۔ یہ پرچم کبھی ہمارے قدموں تلے روندا
نہیں جانا چاہئے۔ اس لئے آپ سب بچے آج کے دن مجھ سے وعدہ کریں کہ راہ میں آئی کسی
رکاوٹ کو یونہی چھوڑ کر آگے نہیں بڑھیں گے۔ بلکہ اسے احترام سے اُٹھا کر اپنی آنکھوں سے
لگائیں گے۔'' تالیوں کی گونج اور بچوں کے جوشیلے نعروں میں وہ اسٹیج سے نیچے اُتری تھی۔ سید
عزیز بن مظفر دُکھ سے مسکرا دیئے۔

''کاش بیٹی.....! تم نے ان لفظوں کے ساتھ ساتھ ان جذبات کو بھی اپنی
ذات میں زندہ رکھا ہوتا جو میں نے ان لفظوں کے ساتھ گوندھ کر تم تک پہنچائے تھے۔''

☆☆☆

"بابا.....! آپ خود سے گھر مت جایئے گا۔ میں آپ کو ڈراپ کر دوں گی۔"
چند خاص مہمانوں کے ساتھ پرنسپل روم کی طرف جاتی رہنما نے انہیں ہدایت کی تھی۔ وہ
میں سر ہلاتے مجاہد کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہیں اپنے نواسے سے بے حد محبت تھی لیکن
ملاقات کے مواقع بہت کم میسر آتے تھے۔ رعنا ایک تو خود ہی بہت کم میکے آتی تھی اور
بھی عموماً مجاہد اس کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ اس چھوٹے سے بچے کا شیڈول اتنا مصروف
اکثر عدیم الفرصت ہی ہوتا تھا۔

"آج آپ نے بہت اچھا پرفارم کیا بیٹا.....! کس نے تیاری کروائی تھی
نے.....؟" اس سے پوچھتے ہوئے انہوں نے خود ہی اندازہ لگایا۔

"اوں ہوں.....! ماما کے پاس تو ٹائم ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو ہماری سوشل اسٹ
ٹیچر ہیں مس صائمہ.....! انہوں نے ہی ہم سب اسٹوڈنٹ کی ہیلپ کی تھی۔" مجاہد
بناتے ہوئے انہیں جواب دیا۔

"اوہو.....! اس کا مطلب ہے کہ ماما نے اسکول میں بڑی اچھی اچھی ٹیچ
ہوا ہے۔ پھر تو خوب دل لگتا ہوگا یہاں پڑھائی میں۔" وہ اس کی باتوں سے لطف
رہے تھے۔

"دل تو خیر لگتا ہے نانا ابو.....! لیکن ماما کہتی ہیں یہ ٹیچرز کچھ خاص اچھ
انہیں فیشن کرنے اور انگلش بولنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ نالج وغیرہ بھی زیادہ نہیں ہے
ہی مجھے کسی فارن کنٹری بھیج دیں گی۔ یہاں تو وہ کسی دوسرے اسکول میں میرا ایڈمیشن
سکتیں۔ ورنہ ان کے اپنے اسکول کی ریپوٹیشن خراب ہو جائے گی۔" وہ اپنی معصوم
انہیں بہت کچھ بتاتا جا رہا تھا۔ سید عزیز بن مظفر کا دل رعنا کے اس دوغلے پن کو محسوس
نئے سرے سے کڑھنے لگا۔

"نانا ابو.....! ایک بات پوچھوں آپ سے.....؟"

"جی بیٹا.....! ضرور پوچھو.....!"

"آپ اکیلے کیسے رہتے ہیں.....؟ آپ کو ڈر نہیں لگتا.....؟"

"اپنے گھر میں ڈر کیسا بیٹا.....!" وہ مسکرائے۔

"اور اگر کوئی چور آ جائے تو.....؟"

"تو کیا.....؟ میرے گھر میں چرانے کے لئے ہے ہی کیا.....؟ سوائے چند خوابوں
کے۔"

"کیسے خواب نانا.....؟" وہ حیران ہوا۔

"اپنے وطن کی ترقی اور خوشحالی کے، یہاں علم کی شمع جلانے کے۔ میں ایک ایسا
اسکول بنانے کا خواب دیکھتا ہوں بیٹا.....! جس کی عمارت تمہارے اسکول کی عمارت کی طرح
عظیم الشان نہیں ہوگی لیکن وہاں پڑھنے والوں کو بڑے بڑے مقاصد اور عزائم سونپے جائیں
گے۔ میرا اسکول ہمارے بچوں کو ان اقدار سے روشناس کروائے گا جن سے امریکہ اور لندن
کے اعلیٰ اداروں میں پڑھنے والے کبھی واقف نہیں ہو سکتے۔ ہم صرف نام کے نہیں بلکہ عملی
مجاہدین بنائیں گے۔ ایسا مجاہد جو میدانِ جنگ میں ہی نہیں اپنی زندگی کے ہر عمل میں مجاہد
ثابت ہوگا۔ اسے اپنے مذہب، وطن، رہنماؤں اور قومی پرچم کی حرمت کا پاس ہوگا اور یہ خواب
انشاء اللہ بہت جلد تعبیر کو پہنچے گا۔" وہ اس بات سے بے خبر کہ وہ چھوٹا سا بچہ ان کی بات سمجھ سکتا
ہے یا نہیں اس سے اپنے خواب شیئر کر رہے تھے۔

"آپ اپنے اسکول میں مجھے ایڈمیشن دیں گے نانا ابو.....!" اس نے اشتیاق سے
پوچھا۔

"لیکن آپ کو تو ماما فارن کنٹری بھیجنے والی ہیں۔" انہوں نے یاد دہانی کروائی۔

"اوہ یس.....!" اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور مایوسی سے بولا۔

"یعنی میں آپ کے اسکول کے بچوں کی طرح ایک اچھا مجاہد نہیں بن سکوں گا۔"

"کیوں نہیں بن سکو گے.....؟ اگر اچھی باتیں یاد رکھو گے تو ضرور بنو گے۔ جیسے آج
ائیرپورٹ میں ماما نے آپ سب بچوں کو جو نصیحت کی تھی اس کو یاد رکھ کر اس پر عمل کرنا۔" ان
نے اس کی مایوسی دیکھی نہیں گئی سو بہلانے لگے۔

"چلیں بابا.....! گھر ڈراپ کر دوں آپ کو۔" نانا نواسا ایک دوسرے کی باتوں

میں مگن تھے کہ رعنا کی آواز نے انہیں چونکایا۔

''فارغ ہو گئیں بیٹی......! اپنے مہمانوں سے......؟'' اپنی جگہ سے اُٹھ کر ا
ساتھ چلتے انہوں نے پوچھا۔

''جی بابا......! بڑی مشکل سے جان چھڑائی ہے۔ اتنی باتونی عورتیں ہیں
طرح ان کے قصے ختم ہی ہو کر نہیں دیتے۔'' کچھ دیر پہلے کی خوش اخلاقی کی جگہ اب ر
لہجے میں بیزاری جھلک رہی تھی۔

''تو چھوڑ دو ناں یہ سب دھندے۔''

''مجبوری ہے بابا......! سرکل میں اِن رہنے کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے
ایک ساتھ چلتے ہوئے اسکول کی عمارت سے باہر نکل آئے تھے۔ گاڑی کے نزدیک
ڈرائیور رعنا کو دیکھ کر مستعد ہو گیا تھا۔

''مجاہد بیٹا......! آپ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔'' انہیں اندر بیٹھنے کا اشارہ کر
نے بیٹے کو ہدایت کی۔

''یس ماما......!'' وہ تابعداری سے کہتا فرنٹ سیٹ کی طرف بڑھا لیکن ا
کے بجائے اچانک ہی وہ آگے کی طرف دوڑ پڑا۔

''مجاہد......! مجاہد کہاں جا رہے ہو......؟'' رعنا کا سوال گاڑی کی تیز چ
میں دَب گیا تھا۔ یہ ایک سیاہ لینڈ کروزر تھی جو بڑی برق رفتاری سے ننھے مجاہد سے ٹکر
آگے بڑھ گئی تھی۔

ڈرائیور سمیت وہ تینوں بہت تیزی سے مجاہد کی طرف دوڑ پڑے۔

''میرا بیٹا......! میرا بچہ......!'' رعنا اس کے بیہوش ہوتے وجود کو بانہوں م
بلبلا رہی تھی۔ سید عزیز بن مظفر نے بچے کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کی بند مٹھی کو کھولا۔
سے پہلے انہوں نے اسے سڑک پر جھک کر کچھ اُٹھاتے دیکھا تھا۔ مجاہد کی مٹھی سے بر
والے کاغذ کے سبز ہلالی پرچم کو دیکھ کر ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

وہ الفاظ جو برسوں تک وہ اپنی بیٹی کو سکھاتے رہے تھے آج معتبر ہو گئے۔

رف یہ تھا کہ ان کی بیٹی نے صرف لفظوں کو یاد رکھا تھا اور ان کا نواسا ان کی اصل روح کو پا
لیا تھا۔ 47ء کا جذبہ آج کی نسل میں جگانا مشکل نہیں بلکہ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ
اس جذبے کو پوری توانائیوں کے ساتھ نئی نسل میں منتقل کیا جائے اور یہ کام بہرحال پرانی نسل
کے لوگوں ہی کو کرنا ہے۔

''آنسوؤں کو روک لو بیٹی......! تمہارے بیٹے نے اپنے پرچم کی حرمت کی خاطر
اس نے اپنے نام کی لاج رکھی ہے۔ دیکھو......! اس نے پرچم کی حفاظت کے لئے اپنی جان کی
بھی پرواہ نہیں کی۔ لیکن اللہ اس کی حفاظت کرے گا۔ اُٹھو بیٹی......! اس کے جسم پر لگے زخم
جلدی بھر جائیں گے، یہ پرچم کی حفاظت اپنے اسی مضبوط ارادوں کے ساتھ کرے گا۔'' انہوں
نے ایک عزم اور ارادے سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور زخمی مجاہد کو لے کر اسپتال کی طرف
چل دیئے۔

☆☆☆

کس کے لئے

تھکے تھکے قدموں سے ماربل کی چمچماتی چار پانچ سیڑھیاں طے کرتے اس نے شدت سے خواہش کی کہ کاش وہ اپنی پشت پر موجود اس مشہور و معروف بلڈنگ میں کبھی آیا ہوتا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ حقیقت تب بھی وہی رہتی، جو یہاں آنے سے پہلے تھی۔ حقائق کبھی نہیں بدلتے یہ ہر شخص جانتا ہے لیکن حقائق سے منہ چھپانے، اس کا سامنا نہ کرنے کی شعوری یا لاشعوری کوشش سب ہی کرتے ہیں۔ اس کی زندگی کی سب سے تلخ حقیقت اس کے سامنے آچکی تھی، وہ اس حقیقت سے بھاگ نہیں سکتا تھا لیکن بھاگ جانا چاہتا تھا۔ شاید اسی کوشش میں اس نے سامنے پارکنگ میں موجود اپنی نئے ماڈل کی لشکارے مارتی گاڑی کو نظر انداز کیا اور یونہی پیدل چلتا پارکنگ کے سامنے سے گزر گیا۔ اس کے بے سمت قدم اسے کہاں لے جا رہے ہیں وہ نہیں جانتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسے کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ماؤف ہوگئی ہے۔ مگر پھر یہ کون سا خیال تھا، کس کی آواز تھی جو بار بار اس کے ذہن کے دریچوں پر دستک دے رہی تھی۔

”میں ایسی سسکتی ہوئی زندگی نہیں گزار سکتا جس میں ہر لمحے ہر چیز کے لئے ترستے رہو۔“ اسے ماضی کے دُھندلکوں میں چھپی اپنی ہی آواز سنائی دی تو وہ چونک سا گیا۔

”ترسنا“ کسی چیز کے لئے ترسنا کیا ہوتا ہے آج وقت نے اسے صحیح معنوں میں اس لفظ کا مفہوم سکھایا تھا۔ اسے اپنے وجود میں بے پناہ تھکن اترتی محسوس ہونے لگی۔

”کوئی جائے پناہ، کوئی پرسکون گوشہ۔“ اس کے دل نے تمنا کی اور قدم اسے ساتھ سامنے موجود ایک چھوٹے سے پارک میں لے گئے۔ پارک میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھی بنچوں میں سے ایک پر وہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ اس کی ویران نظریں کھیلتے بچوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مختلف عمروں، رنگوں اور حیثیتوں کے بچے جن میں ایک قدر مشترک تھی اور وہ یہ کہ وہ بچے تھے۔ دُنیا کے چمن میں لہلہاتے، کھلکھلاتے دُنیا کے سب سے حسین پھول۔ وہ بچے مختلف کھیل کھیل رہے تھے، کرکٹ، پکڑم پکڑائی، آنکھ مچولی، لیکن اس کی نظروں میں جس بچے کو دیکھ کر کرب اترا وہ ایک چھ سات سالہ گول مٹول تتلیوں کا تعاقب کرتا بچہ تھا۔ اس نے خود کو اس بچے کی جگہ محسوس کیا۔ وہ بھی تو خواہش کی تتلی کے پیچھے یونہی دیوانہ وار دوڑا تھا اور جب وہ تتلی اس کے ہاتھ آئی تو جانا اس کے پنکھ کتنے کچے ہیں۔

”اسد......! کیا ہوا جو ہمارے پاس بہت سی دولت نہیں۔ ہمارے پاس محبت تو ہماری ہے ناں......! ہم اس محبت کے سہارے زندگی گزار لیں گے۔“

کسی کا آنسوؤں میں ڈوبا التجائیہ لہجہ اس کی سماعتوں میں اترا اور اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے اس بھیگی التجا کے جواب میں دیا گیا اپنا کٹھور جواب بہت اچھی طرح یاد تھا۔

”مجھے بھی تم سے بہت محبت ہے آسیہ......! لیکن محبت پیٹ نہیں بھرتی۔ دولت کے بغیر زندگی گزارنے کا دعویٰ کرنے اور زندگی گزارنے میں بہت فرق ہے۔ تمہاری خاطر میں زندگی گزارنے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن ایسی روتی بلکتی زندگی نہیں۔“ اور یہاں سے وہ عزم لے کر چلا تھا۔ اس عزم کی راہ میں نہ تو اس سے بچپن سے منسوب اس کی عم زاد آسیہ کی سسکیوں نے رکاوٹ ڈالی تھی اور نہ اپنے قول کے پکے ابا جان کے، قول ہارنے بننے۔ وہ ترقی کی راہوں پر دوڑ رہا تھا اس کی ذہانت، وجاہت اور محنت اس راہ پر اس کی ہم قدم تھیں۔ آسیہ نے اس سے مایوس ہو کر تنویر شہزاد کی زندگی کو رونق بخشی تو اسے اپنے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی محسوس تو ہوئی لیکن حرا صلاح الدین کی صورت وہ اپنی زندگی میں آنے

والی دولت کی جو آہٹیں سن رہا تھا، انہوں نے اسے پچھتانے کا موقع نہیں دیا۔

"دل ٹھہر ہی جائے گا، بھلا یوں ذرا سے دل کی خاطر میں خودغرض کیسے بن
ہوں، میری یہ ذرا سی تکلیف میرے....." ایک سوچ نے اس کے پرملال چہرے پر خوشی
چڑھا دی تھی۔

حرا صلاح الدین اس کے باس کی نازک اندام، اکلوتی، لاڈلی بیٹی جس کے
اسد مرزا اتنا بھایا کہ وہ اپنے کروڑ پتی باپ سے اسے مانگ بیٹھی اور کون تھا جو اس کی خو
کی راہ میں رکاوٹ بنتا۔ اگر سیٹھ صلاح الدین کی زندگی کا مقصد اپنی نازوں پلی بٹ
خواہشوں اور خوشیوں کو پورا کرنا تھا تو اسد مرزا نے بھی حرا صلاح الدین کے دل میں اپ
جگانے کی دن رات تگ و دو کی تھی۔ قابلیت، ذہانت، دیانت ہر حربہ آزمایا گیا تھا، حرا
الدین کے سامنے۔ وہ لڑکی آخر زیر نہ ہوتی تو کیونکر۔

"سی....." یکدم ہی اُنگلی پر ہونے والی تکلیف نے اسے حال میں واپس کھینچ
کوئی چیونٹا تھا جو اس کی غفلت کا فائدہ اُٹھا کر اس کی اُنگلی سے چمٹ گیا تھا۔ اُنگلی سے
چیونٹے کو جدا کرتے اس کی نظر اپنے ہاتھ میں موجود خاکی لفافے پر پڑی وہ حقیقت جس سے
وہ بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ خاکی لفافے میں بند بھیانک عفریت کی طرح اس کے ساتھ
تھی۔ وہ عفریت جو اسے ماضی کے ریگزاروں کی طرف دھکیلتی، اسے اس کے ہی
دعوے کی تپش میں جھلسا رہی تھی۔

"میرے باپ نے مجھے زندگی کی کوئی سہولت نہیں دی۔ ان کی بے عملی نے
اسی گز کے اس چونا جھڑی دیواروں والے گھر کا قیدی بنا دیا لیکن میں ہرگز بھی ایسی
اپنے....." اور یہاں ہی آ کر ایک طمانچہ اس کے منہ پر پڑا تھا اور اسے بے ساختہ ہی وہ
آسیہ مرزا یاد آئی تھی جو محبت کے سہارے زندگی گزار دینے کی باتیں کرتی تھی۔ کتنا فرق تھا
لڑکی اور اسد مرزا کے معیارِ زندگی میں مگر آج وہ جس نظر سے دیکھ رہا تھا اس فرق میں
اس کے اپنے ہی حصے میں زیادہ تھا۔ ہاں ہو سکتا ہے وہ آج بھی موسم کا ہر پھل اپنے گھر
کی استطاعت نہ رکھتی ہو لیکن وہ خود تو بے ثمر نہیں تھی۔

"تمہاری خاطر میں سسکتی بلبلاتی زندگی گزارنے کی کوشش کر سکتا ہوں لیکن میں
ایسی روتی بلکتی زندگی اپنے بچوں کو نہیں دے سکتا۔" اس نے آسیہ کی آوازوں پر کان نہیں دھرا
تھا۔

"ذرا سے دل کی خاطر میں خودغرض نہیں بن سکتا، میری یہ ذرا سی تکلیف میرے
بچوں کا مستقبل سنوار دے گی۔" اس کے پاس اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے ایک بہلاوا
موجود تھا۔

"جیسی زندگی میرے باپ نے مجھے دی میں ایسی زندگی ہرگز بھی اپنے بچوں کو نہیں
دے سکتا۔" طعنہ شاید سیدھا اس کے باپ کے دل کو لگا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے خاکی
لفافے پر چھپے شہر کی مشہور و معروف لیبارٹری کے مونوگرام کو دیکھا۔

پانچ سال ہو گئے تھے اس کی اور حرا کی شادی کو۔ پانچ سال سے وہ اپنے گھر میں
پھول کھلنے کا منتظر تھا، جس کی خاطر اس نے یہ سارا کشٹ اُٹھایا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہے، بس خدا کی مہربانی کا انتظار کریں۔" حرا شہر کی ہر بڑی گائنا
کالوجسٹ سے اپنا معائنہ کرانے کے بعد اسے یہ تسلیاں دیتی تھی اور پھر کسی گائنا کالوجسٹ
کے مشورے پر ہی اس نے اسد مرزا سے کہا تھا۔

"اسد.....! ایک بار آپ بھی اپنا معائنہ کروا لیں۔ مسئلہ تو کسی کے بھی ساتھ ہو سکتا
ہے۔" وہ بہت جھنجھلایا تھا اس مشورے پر لیکن وہ جھونپڑ پٹی میں بسنے والا کوئی جاہل مرد تو نہ تھا
کہ اس بات کو انا کا مسئلہ بنا لیتا۔ اس نے ڈاکٹر کے لکھے ٹیسٹ کروائے تھے اور اب ٹیسٹ کی
رپورٹ اسے بتا رہی تھی۔

"زندگی کی بساط پر ہر مہرہ اپنی مرضی سے رکھنے والے اسد مرزا.....! وہ بازی جو
آپ کھیل رہے تھے، اس میں شکست ازل سے آپ کے حصے میں لکھ دی گئی تھی۔"

"اولاد کا صدمہ، سب سے بڑا صدمہ ہے۔ انسان ہر ترغیب سے بچ نکلے لیکن یہاں آ کر
ناکام ہو جاتا ہے۔" اماں جی کی غم آواز میں کیسا دکھ تھا وہ آج محسوس کر سکتا تھا۔ ان دیکھی، غیر
موجود اولاد کے لئے دھوکا، خوشامد، دل آزاری ہر گناہ تو کر چکا تھا وہ۔ کیوں تھی یہ ساری بھاگ

دوڑ۔

صرف اس لئے کہ اپنی اولاد کے مقدر میں ہر وہ نعمت لکھ سکے جو اسے نہیں ملی؟ وہ جانتا تھا کہ اللہ نے خود اس کے مقدر میں کیا لکھا ہے اور یہی ہمارا المیہ ہے، یہ جانے بغیر ہمارے مقدر میں کیا لکھا ہے ہم اپنی تقدیر سنوارنے کی خاطر اندھا دھند بھاگتے جاتے اس بات کی پروا کئے بغیر کہ ہمارے قدموں تلے، کتنے دل، کتنے جذبات اور رشتے کچلے رہے ہیں۔

☆☆☆

منے بھیا

''منے.....! آٹھ بجنے والے ہیں۔ جلدی سے باہر آؤ۔ بچوں کو اسکول چھوڑ آؤ انہیں دیر ہو جائے گی۔'' تخت پر بیٹھی آپا نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے آواز

میں جو چھوٹی ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے ان ہی کی طرف آ رہی تھی، ان کی پر چونک سی گئی۔

آج کے دن کیسا اسکول؟ اور کون منے میاں؟ ابھی کل ہی تو اس گھر کے در و پر ایک حادثہ گزرا تھا۔ رات گئے تک افسوس کے لئے آنے والوں سے مل مل کر اہل کا حشر نشر ہو گیا تھا اور اس وقت میرے اور بڑی آپا کے سوا کوئی بھی فرد ایسا نہ تھا جو لے رہا ہو۔ اپنی آواز کے جواب میں چھائی خاموشی اور میرے چہرے کے تاثرات نے آپا کو چابک سا رسید کیا اور وہ بیقراری سے رونے لگیں۔ اس پل مجھے ان پر شدید آیا۔

''صبر کریں بڑی آپا.....! جانے والوں پر صبر کرنے کے سوا کیا بھی کیا جا سکتا ہے'' ہاتھ میں تھامی ٹرے تپائی پر رکھ کر میں انہیں دلاسا دینے لگی۔

''اس نے اس دُنیا میں ابھی دیکھا ہی کیا تھا۔ کوئی ایک بھی تو خوشی نہیں پائی اس اپنی زندگی میں۔'' انہیں نہ جانے کیا کیا یاد آ رہا تھا اور میں صرف ایک بات سوچ رہی تھی۔

''ہمیں لوگوں کی قدر ہمیشہ ان کے بچھڑ جانے کے بعد ہی کیوں ہوتی ہے.....؟

☆☆☆

''منے ماموں.....! ذرا اس سین کی بچی کو تو پکڑیں۔ قسم سے ہلا کر رکھ دیا ہے نے مجھے۔ ایک تو شادی کی تھکن، اس پر سے اس کی ریں ریں۔ میرا تو جوڑ جوڑ ہلنے لگا ہے جماہیاں لیتی تابندہ ایک ہاتھ میں اپنی دو سالہ بیٹی کو دبوچے برآمدے میں آئی اور فوراً ہی منور بھیا المعروف منے کے حوالے کر کے خود دھپ سے اپنی اماں جی کے تخت پر نیم دراز ہوگئی۔

''واقعی میری بیٹی نے بڑا ہاتھ بٹایا کاموں میں۔ یقین جانو دُلہن.....! تمہاری تیار کرنے کے لئے شہر بھر کی مارکیٹیں کھنگال ڈالیں اس دیوانی نے۔ کہتی تھی سب سے چھوٹے اور لاڈلے ماموں کی شادی ہے۔ بڑی تو ایسی شاندار ہونی چاہئے کہ لوگ عش عش کر اٹھیں۔''

''بڑی آپا.....! مجھے اپنی اکلوتی دختر نیک اختر کی کارکردگی کے بارے میں بتا تھیں لیکن میرا زیادہ دھیان ان کے بجائے منور بھیا کی طرف تھا جو اپنا ناشتہ چھوڑ کر سیدھے چائے میں پاپے ڈبو ڈبو کر کھلا رہے تھے۔ بچی یقیناً بہت بھوکی تھی، اس لئے رونا دھونا بھلا بڑی رغبت سے کھا رہی تھی۔ میں نے ایک نظر تابندہ پر ڈالی۔ اب وہ بڑی آپا کے گاؤ تکیے پر رکھے آنکھیں موندے لیٹی تھی اور وہ اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے اُنگلیاں پھیر رہی تھیں۔

مجھے اندر ہی اندر اس پر غصہ سا آنے لگا۔ خود ایک بچی کی ماں ہو کر وہ ہر وقت بنی رہتی تھی۔ اس وقت بھی یہ خیال کئے بغیر کہ اس کے خاموش طبع ماموں کو ناشتے کی اس رات کے بعد دن بھر کی بھاگ دوڑ میں مشکل سے ہی کھانے کا موقع ملے گا۔ اپنے لاڈ اُٹھوانے میں مصروف تھی۔ آج میری شادی کو چوتھا دن تھا اور اس مختصر سے عرصے میں ہی میں ہر طرف منور بھیا کو لگنے والی صداؤں اور ان کی خاموشی سے عمل پیرا ہو جانے کی عادت کو جان چکی تھی۔

''منے یہ لاڈو، منے وہ لے جاؤ، منے یہ رکھ دو، وہ اُٹھا لو، اسے سنبھال لو۔''

دن ان کے بہن بھائی اور بھانجے آرڈر دیتے رہتے اور وہ ایک بار بھی انہیں ''نہ'' نہیں کہتے تھے، بلکہ یہ کہنے کا کیا سوال۔ میں نے تو انہیں کچھ بھی بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔

''کہیں بیچارے گونگے تو نہیں۔'' میرے ذہن میں خیال سا کوندا۔ اپنے خیال کی تصدیق منور بھیا کے سامنے بڑی آپا سے کرنا مجھے نامناسب معلوم ہوا۔ سو خاموشی سے بیٹھی رہی۔

''السلام علیکم آپا.....! بھئی جلدی سے ناشتہ دے دیں، بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' صفدر تولیے سے منہ پونچھتے آئے اور منور بھیا کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''صبر کرو میاں.....! ابھی گلواتی ہوں ناشتہ۔ دُلہن بیچاری بھی کب سے تمہارے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہے۔ خیر سے اب شادی شدہ ہو، یہ چھٹی والے دن دیر تک سونے کی عادت چھوڑو، ورنہ یہ بیچاری تو تمہارے انتظار میں بیٹھی سوکھتی ہی رہے گی۔'' بڑی آپا نے صفدر کو لتاڑا۔

''تو کس نے کہا ہے اس سے کہ منہ اندھیرے اُٹھ کر بیٹھ جائے۔ یہی تو دو چار دن ہیں عیاشی کے۔ چھٹیاں ختم ہوں گی تو پھر لگنا ہی پڑے گا لائن سے۔'' صفدر نے انہیں جواب دیتے ہوئے تولیہ لاپرواہی سے تیسری کرسی پر ڈالا۔

اپنی اسی دلیل کے ساتھ وہ روزانہ فجر کے بعد مجھے بھی سونے پر اُکساتے رہتے تھے لیکن میں جانتی تھی یہی دو چار دن ہی سسرال والوں پر اپنا اچھا تاثر قائم کرنے کے بھی ہیں۔ سو ان کی دلیل کو نظر انداز کر کے ہلکے پھلکے تیار ہوتی اور بڑی آپا کے تخت پر برآمدے میں جلوہ افروز ہوتے ہی خود بھی وہاں آ بیٹھتی۔ بڑی آپا میری اس روش پر بڑی خوش تھیں اور میں اپنی جگہ مطمئن۔ یوں بھی گنتی کے چند دن ہی تو گزارنے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ اگر ہلکی خوشی گزر جاتے تو کیا حرج تھا پھر تو صفدر مجھے لے کر اپنے علیحدہ گھر میں شفٹ ہو جاتے۔

''منے.....! آج انیق کو ساتھ لے کر گھر چلے جانا۔ رنگ و روغن تو ہو چکا ہے، تم وہاں مل کر گھر کی دُھلائی اور جھاڑ پونچ کر لینا۔ دُلہن کا سامان وہاں شفٹ کرنے سے پہلے گھر کی حالت سدھر جائے تو اچھا ہے۔ موئے کرایے داروں نے تو برسوں میں حال ہی خراب

کر کے رکھ دیا ہے۔" بڑی آپا نے ہدایت دی تو انہوں نے حسب معمول تابعداری۔ اثبات میں ہلا دیا۔

اس پل پہ جانے کیوں میں ان کا موازنہ صفدر سے کرنے لگی۔ منور بھیا سے سال چھوٹے صفدر ان کے مقابلے میں بے حد فریش لگ رہے تھے۔ لمبا قد، گندمی، صحت مند و توانا جسم اور سب سے بڑھ کر آنکھوں میں خود اعتمادی کی چمک اور اپنے ہو احساس کے مقابلے میں منور بھیا نسبتاً کم قامت، ہلکی رنگت اور نہایت کمزور جسمانی کے حامل ایک دبی ہوئی شخصیت رکھنے والے انسان تھے۔ دو سگے بھائیوں میں اس قدر میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

"منور بھیا.....! آپ کو چائے بنا کر دوں.....؟" صفدر کے آگے چائے رکھتے ہوئے میں نے منور بھیا سے پوچھا۔

"نہ نہ دُلہن.....! منے کو زیادہ چائے پینے کی عادت نہیں۔ بس صبح کو ایک چائے پیتا ہے اور منے.....! تم کیوں ابھی تک یہاں ڈیرہ جمائے بیٹھے ہو.....؟ جو کام اس کے لئے نکل پڑو۔"

مجھے جواب دینے اور منور بھیا کو ڈپٹنے کے کام بڑی آپا نے ایک ساتھ دیئے۔ منور بھیا سبین کو ان کے پاس تخت پر بٹھا کر جلدی سے باہر نکل گئے۔ میرا خ بڑی آپا کو جتاؤں کہ وہ جو ایک پیالی چائے منور بھیا پیتے ہیں، اسے ان کی نواسی پاپو ساتھ نوش کر چکی ہے لیکن اپنے نئے نئے دُلہناپے نے زبان بندی پر مجبور کر دیا۔ نہ کیوں ایک میرے سوا سب وہاں بڑے مطمئن تھے۔ سلائس پر جیلی لگاتے صفدر سے باقی رہ جانے والی نیند کو پورا کرتی تابندہ اور تخت پر بیٹھی نواسی کے لاڈ اٹھانے والی بڑی تک۔

☆☆☆

"آپا جی.....! آج تو منے بھیا نے مجھے بھوکا ہی مروا دیا۔ صبح سے شام کو دوپہر کی روٹی کا کوئی نام ہی نہیں۔ آخر دیلے تو میں بھی سارے کام شام چھوڑ کر

گیا۔ آپے ہی انہوں نے صحن کی دُھلائی اور کمروں کا پوچھا لگایا۔ میرے تو جی بھوک کے مارے جان ہی نکلی جا رہی تھی۔"

شام سوا پانچ کے قریب بڑی آپا کا جز وقتی ملازم اینق اور منے بھیا گھر واپس لوٹے تو اینق نے بڑی آپا کے سامنے دہائی دی۔

"ارے اس گلوڑے منے کو تو کبھی عقل ہی نہیں آئے گی۔ یہ نہیں کہ گھر سے جاتے وقت چار پیسے ساتھ لے جاتا۔ ہوٹل سے سالن روٹی لے کر دونوں کھا لیتے۔ جا بیٹا ثریا.....! اینق کو کھانا دے دے، بیچارہ بچہ خوار ہو کر رہ گیا۔"

بڑی آپ نے منے بھیا کو تماڑتے ہوئے اپنی بہو کو ہدایت دی تو وہ اور اس کے پیچھے پیچھے اینق بھی باہر نکل گیا۔

"کم بخت اچھے ملازم کوئی آسانی سے ملتے ہی۔ نوکری چھوڑ کر بھاگ گیا تو میری جان پر عذاب آئے گا۔" بڑی آپا آہستہ آہستہ آواز میں بڑبڑا رہی تھیں تاکہ اینق کے کانوں تک آواز نہ پہنچے۔ بصورتِ دیگر اس کا دماغ مزید آسمان پر پہنچ جاتا۔

"تم بھی جا کر منہ ہاتھ دھو لو اور ثریا سے کہو تمہیں بھی کھانا دے دے۔" چھوٹی آپا نے دن بھر کی مشقت کے بعد مزید خراب ہو جانے والے منور بھیا کے حلیے کو دیکھتے ہوئے ان سے کہا تو بڑی آپا نے شدید ناراضی کے عالم میں انہیں بھی ڈپٹ دیا۔

"ہاؤلی ہوگئی ہو راحت.....! یاد نہیں اماں کتنا ناراض ہوتی تھیں عصر، مغرب کے درمیان کھانا کھانے سے۔ کہتے ہیں اس طرح مردوں کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ اب وقت ہی کتنا ہے مغرب ہونے میں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد کھانا کھالے گا وہ۔ میرا منا ویسے بھی بڑا صبر والا ہے۔"

مردوں کی روزی کی فکر کرنے والی بڑی آپا نہ جانے کیوں ایک زندہ انسان کی طرف سے بے نیاز تھیں۔ ان کے اس رویے پر میرا دم گھٹنے لگا۔ یتیم، بے سہارا، کمزور، مسکین، قرابت دار ہر تعلق سے منور بھیا کا حق سب سے زیادہ تھا اور یہ سب بہن بھائی مل کر اس حق کو غصب کر رہے تھے۔ خود کو ماں کی جگہ کہنے والی بڑی آپا اس معاملے میں سب سے پیش پیش

تھیں۔

☆☆☆

"میرے ہاتھ سے کیا ہوا میک اَپ بیوٹیشن کو بھی مات دے دیتا ہے۔ حالانکہ
نے باقاعدہ سیکھا نہیں ہے۔ آج اپنی دوست کے ہاں دعوت میں جائیں گی تو کسی
پوچھ کر دیکھ لیجئے گا۔" میرے چہرے پر مہارت سے ہاتھ چلاتی تابندہ کی زبان بھی مسلسل
رہی تھی۔ ویسے وہ اپنے دعوے میں کافی حد تک سچی تھی لیکن اس کے لہجے میں جو ایک "میں
تاثر ہوتا تھا، وہ مجھے قطعی پسند نہیں تھا۔

"تابندہ...... ! بھئی کب فارغ ہو گی تم۔ تمہاری بچی نے آفت مچا رکھی ہے۔"
کو گود میں اُٹھائے بڑی آپا میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"بس تھوڑی دیر کی بات ہے امی...... ! میں مامی کے میک اَپ کو فائنل ٹچ دے
ہوں۔ جب تک آپ پلیز اس کو بہلا لیں۔"

"صاف بات ہے بھئی...... ! اب بچے سنبھالنے کی نہ عادت رہی ہے نہ حوصلہ
لوگوں کو پال پوس کر بڑا کر دیا، اب اپنے بچے تم آپ ہی سنبھالو۔"

بڑی آپا تو اسی کو سنبھالتے سنبھالتے یقیناً ہلکان ہو گئی تھیں۔ ورنہ تابندہ کو ایسا
دیتے، میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"تو آپ سیٖن کو منے ماموں کو دے دیں ناں...... ! وہ آرام سے سنبھال لیں
اسے۔" تابندہ نے آرام سے مشورہ دیا۔

"ارے وہ تو کب کا بستر پر پڑ کر سو چکا۔ ورنہ میں خود ہی تمہاری لاڈو کو ا
حوالے کر دیتی۔ اتنے عرصے بعد تو ہم بہنیں ایک جگہ جمع ہوئی ہیں لیکن دو گھڑی سکون
بیٹھ کر باتیں کرنے کا موقع نہیں مل رہا۔"

"ابھی سے سو گئے منے ماموں...... ! ابھی وقت ہی کیا ہوا ہے......؟" بڑی
بات میں سب سے اہم نکتہ تابندہ کے نزدیک شاید یہ ہی تھا، سو حیرت کا اظہار فرمایا گیا۔

"ہاں تو اسے کیا کرنا ہے۔ نہ ٹی وی دیکھنے کا شوق، نہ کتاب

آخر بندہ فارغ ہو تو سونے کے علاوہ کیا کرے گا۔" سیٖن کی مسلسل ریں ریں تو بری لگ ہی
رہی تھی۔ بڑی آپا کی بات اور بھی بری محسوس ہوئی۔ ساڑھے آٹھ بجے منور بھیا کے بستر
سنبھال لینے کی وجہ بڑی آپا کے نزدیک ضرور ان کی فراغت ہو سکتی تھی لیکن میرے نزدیک اس
کا سبب دن بھر کی تھکن اور مسلسل کام تھا۔ آج کا سارا دن انہوں نے میرے جہیز کے سامان
اور دیگر چیزوں کو ہمارے گھر میں پہنچانے اور سیٹ کرنے میں خرچ کیا تھا۔ ابھی میں بڑی آپا
کی بات کے زیرِ اثر تھی کہ تابندہ کہنے لگی۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، منے ماموں جیسے لوگوں کو پیدا کرنے کے پیچھے اللہ کی
کیا مصلحت ہوتی ہے۔ اب دیکھیں نہ تو بیچارے پڑھ لکھ سکے، نہ ہی کمانے کے لائق ہیں۔
ان کی نہ تو صحت ایسی ہے نہ ذہنی استعداد۔ اگر پرچون کی دکان سے مہینے کا سودا منگوانا ہو
اس کے لئے بھی باقاعدہ لسٹ بنا کر اور حساب کتاب پرچے پر لکھ کر دکاندار کو بھیجنا پڑتا
ہے۔ ورنہ منے ماموں تو یہ معمولی سا کام بھی ڈھنگ سے نہیں کر پاتے۔"

تابندہ منور بھیا کے وجود کو جس طرح بے مقصد قرار دے رہی تھی، مجھے اس کی بے
تکی پر غصہ آنے لگا اور میں ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر بول پڑی۔

"منور بھیا کوئی بالکل ناکارہ شخص تو نہیں ہیں۔ دن بھر کتنے چھوٹے چھوٹے کام
ہیں جو وہ خاموشی سے نمٹا ڈالتے ہیں اور اگر خدانخواستہ وہ کوئی بالکل ہی معذور و مجبور
انسان ہوتے تب بھی ہمیں ان کے وجود کو بے مقصد قرار دینے کا کوئی حق نہیں کیونکہ ایسے افراد
کو دنیا میں بھیجنے کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا کوئی اور مقصد ہو یا نہ ہو، ایک مقصد تو مجھے یہ سمجھ میں آتا
ہے کہ ہم نارمل انسانوں کی آزمائش ہو سکے۔ نارمل فرد کا نارمل فرد سے حسنِ سلوک اتنا مشکل
نہیں لیکن اپنی زندگی میں شامل ابنارمل یا کسی بھی لحاظ سے کم تر فرد کو عزت دینا، اس کے
جذبات کو مجروح ہونے سے بچانا ایک کڑی آزمائش ہے اور اس آزمائش پر پورا اُترنے والا
ہی انسان کہلانے کا حقدار بھی ہے۔"

"سنا تھا آپ کتابیں بہت پڑھتی ہیں۔ اب آپ کی باتیں سن کر یقین بھی آ گیا۔
اوہ...... ! میرا کام مکمل ہو چکا، میں جا کر اپنی بچی کو دیکھتی ہوں۔"

تابندہ نے یقینی طور پر میری بات کا برا مانا تھا، سو وہ قدرے خشک سے لہجے میں
ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ بڑی آپا تو ہمارے گفتگو کے اس موڑ سے بہت پہلے ہی
سے جا چکی تھیں۔

"ہاں بھئی مسز.....! تیار ہو۔ اتنا لمبا ٹائم لے لیا تمہاری تیاری نے، بعد میں
کہ کسی کے گھر دعوت میں اتنی دیر سے پہنچنا بدتمیزی ہے۔"

صفدر کمرے میں آ کر بولے تو میں اپنی گم صم کیفیت سے باہر نکل کر جلدی سے
اوڑھنے لگی کیونکہ حقیقتاً ہم لوگ لیٹ ہو چکے تھے۔

"مزاج بخیر.....! آج بڑی چپ چپ سی لگ رہی ہو۔" تمام گھر والوں کو
روانگی کی اطلاع دے کر ہم گھر سے نکلے تو سڑک پر ٹیک دوڑاتے صفدر نے میری خاموشی
محسوس کیا۔

"میں منور بھیا کے بارے میں سوچ رہی تھی صفدر.....! وہ آپ لوگوں کے ساتھ
کر بھی آپ سب سے اتنے مختلف کیوں ہیں۔ بظاہر کوئی بڑا عیب بھی نہیں دکھائی
میں۔ ابتداء میں میں سمجھی تھی کہ شاید وہ بول نہیں سکتے لیکن کبھی کبھی انہیں "ہاں نہیں
جواب دیتے سنا تو معلوم ہوا ایسی بھی کوئی بات نہیں لیکن وہ اس قدر چپ رہتے ہیں کہ
کو ان کے قوتِ گویائی سے محروم ہونے کا شک گزرتا ہے۔" بالآخر میں اپنی دل کی اُلجھن
پر لے ہی آئی تھی۔

"ان کا اصل مسئلہ خود اعتمادی کی کمی ہے۔ چار بہنوں کے بعد پیدا ہوئے
سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ حد سے زیادہ کیئر نے انہیں ہتھیلی کا چھالا بنا دیا۔ چھ سال
کہ بدقسمتی سے شدید بیمار ہو گئے۔ تقریباً پانچ ماہ کی بیماری نے انہیں بے حد کمزور کر
نقاہت کے باعث وہ بولنے سے بھی گریز کرنے لگے تھے اور جب انہوں نے بولنا
تو گھر والوں پر انکشاف ہوا کہ وہ ہکلانے لگے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی توجہ دینا
رہنے لگیں۔ اسی حال میں میں پیدا ہوا۔ اماں کی بیماری، میری دیکھ بھال اور گھر کو سنبھ
ابا اور بہنیں اس بری طرح مصروف ہوئے کہ منے بھیا کو توجہ دینے کا وقت ہی نہیں

نے انہیں کمزور تو کیا ہی تھا، عدم توجہی نے معاملہ اور خراب کر دیا۔ آئے روز نزلہ، بخار اور
کھانسی جیسی چھوٹی چھوٹی بیماریاں گھیر لیتیں اور اسکول سے ناغے ہوتے رہتے۔ نتیجتاً ان کو
اسکول سے نکال دیا گیا۔ منے بھیا کے بولنے میں جب سے ہکلاہٹ آئی تھی، وہ ویسے ہی
اسکول جانے سے گھبراتے تھے۔ ایک بار نام کٹا تو دوبارہ اسکول کی شکل دیکھنے کو تیار نہیں
ہوئے۔

ابا نے ایک آدھ بار مارا پیٹا پھر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس دوران اماں کا
انتقال ہو گیا تو ابا ذمہ داریاں نبھانے میں منے بھیا کو بالکل ہی بھول گئے۔ چھوٹا ہونے کے
باعث بہنوں کی توجہ کا مرکز میں بن گیا اور یوں منے بھیا بالکل پس منظر میں چلے گئے۔ بہنوں
کے یکے بعد دیگرے شادیاں ہو گئیں۔ سب سے چھوٹی باجی کی شادی کے صرف دو ماہ بعد ابا
بھی ہارٹ اٹیک میں چل بسے۔ بڑی آپا کے سوا باقی تینوں بہنیں شہر سے باہر شادی ہو کر گئی
ہیں۔ بڑی آپا نے کہا۔

"میں دو دو گھر نہیں سنبھال سکتی، تم لوگ اپنے گھر کرائے پر دو اور میرے ساتھ
رہنے آ جاؤ۔" مجھے یہ تجویز پسند آئی۔ سو ہم دونوں بھائی، بڑی آپا کے گھر رہنے لگے۔ میں اپنی
تعلیم میں مصروف ہو گیا اور منے بھیا نے آپا کے ہیلپر کی حیثیت اختیار کر لی۔ تعلیم مکمل ہونے
کے بعد نوکری لگی تو آپا نے زور دیا کہ شادی کر لو لیکن میں نے ٹال دیا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ
مالی طور پر مستحکم ہونے کے بعد یہ کام کروں۔

میرے سمجھانے اور اپنے میاں کی خواہش پر بڑی آپا نے اس دوران اپنے دونوں
بچوں سین اور شہریار کی شادیاں کر دیں۔ یوں بھی وہ دونوں مجھ سے چند سال ہی چھوٹے
ہیں۔ اب مجھے لگا کہ میں کافی حد تک سیٹل ہو چکا ہوں تو شادی کے لئے ہامی بھر لی۔ بڑی آپا
نے چونکہ ماں کی طرح پالا تھا، اس لئے ان کی خواہش تھی کہ تم دلہن بن کر پہلے ان کے گھر میں
آؤ پھر ہم بعد میں اپنے گھر میں شفٹ ہو جائیں تو میں نے ان کی خواہش کا احترام کیا۔ اب
ان تمام حالات کا تجزیہ کرو تو تمہیں خود ہی جواب مل جائے گا کہ منے بھیا ایسے کیوں ہیں۔"
صفدر نے مجھے حالات کا تجزیہ کرنے کو کہا تو میں چند لمحوں کے غور و خوض کے بعد ہی اپنا آئندہ

کالائحہ عمل طے کر چکی تھی۔

☆☆☆

"منور بھیا......! آپ نے ابھی تک اپنا سامان پیک نہیں کیا۔ لگتا ہے باقی کا
میں آپ اپنی تیاری کرنا بھول گئے۔ لائیں مجھے بتائیں اپنی چیزوں کے بارے میں م
کی پیکنگ کر دوں گی۔"

بڑی آپا کے گھر سے اپنے گھر شفٹ ہونے سے ایک دن قبل تمام اہل خا
جگہ بیٹھے تھے کہ منور بھیا کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے اچانک ہی کہا۔

"ہیں......؟ کیسی پیکنگ......؟ منا کہاں جا رہا ہے جو تم اس کا سامان پیک
کی بات کر رہی ہو......؟" منور بھیا تو میری بات سن کر ہونق ہوئے ہی تھے، بڑی آپا ا
زیادہ بوکھلا گئیں۔

"بڑی آپا......! کل ہم لوگ گھر شفٹ ہو رہے ہیں تو ظاہری بات ہے م
بھی ہمارے ساتھ ہی جائیں گے۔ آخر وہ ان کا بھی تو گھر ہے۔" میں نے لہجے میں احتر
کر انہیں جواب دیا۔

"لیکن منے کو تو عادت ہو گئی ہے میرے ساتھ رہنے کی۔ وہ بھلا وہاں اکیلا
پائے گا......؟" بڑی آپا نے توجیہہ پیش کی۔

"اکیلے کہاں......؟ میں اور صفدر بھی تو ہوں گے ناں وہاں پھر آپ بھی آ
رہئے گا۔" میں کسی طور پر اب منور بھیا کو اس گھر میں بے دام کا غلام بن کر چھوڑنے
تیار نہیں تھی۔ خود منور بھیا کے چہرے کے تاثرات سے بھی ظاہر تھا کہ انہیں میری با
اتفاق ہے۔

"دلہن......! تم نے تو اچانک ہی اور خود سے فیصلہ کر لیا۔ کم از کم مجھے
تیار ہونے کا موقع تو دیتیں۔" بڑی آپا کے لہجے میں ہلکی سی ناراضی تھی۔

"بھئی......! اس معاملے میں اصل اہمیت منے کی مرضی کی ہے۔ اگر وہ
ساتھ جانا چاہتا ہے تو بھی ٹھیک ہے اور آپ کے گھر رہنا چاہتا ہے تو بھی کوئی حرج

میری سب سے چھوٹی نند صبیحہ باجی نے مداخلت کرتے ہوئے فیصلے کا حق منور بھیا
دیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ منور بھیا کا فیصلہ چاہے جو بھی ہوتا لیکن ان کو فیصلے کا حق دینا بھی
ک طرح سے ان کی شخصیت کو تسلیم کرنا تھا اور میں چاہتی بھی یہی تھی۔

"م......م...... میں...... صف...... صفدر...... کے...... ساتھ...... جاؤں...... گا۔"

منور بھیا نے قدرے شرماتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔ یہ پہلی بار
ا کہ میں ان کی زبان سے ایک مکمل جملہ سن رہی تھی ورنہ وہ عموماً سر ہاں یا نہیں میں جنبش
ے کر کام چلا لیا کرتے تھے۔

"تو پھر جاؤ۔ اپنا بوریا بستر باندھ لو۔" منے بھیا کے فیصلے پر خفگی کا اظہار کرتی بڑی
آپا کہہ ہی رہی تھیں کہ صفدر انگلی کی رنگ گھماتے دمکتا ہوا چہرہ لئے اندر داخل ہوئے۔

"لیڈیز اینڈ جینٹل مین......! اپنی اپنی نشستوں سے اُٹھ جایئے۔ مابدولت اپنی
کل نئی نویلی گاڑی میں آپ سب کو آئس کریم کھلانے لے جا رہے ہیں۔"

انہوں نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا تو سب ایک دم ہی پرجوش ہو گئے۔
در کی گاڑی لینے کا ارادہ ہے، یہ تو سب کو معلوم تھا لیکن وہ یوں اچانک ہی یہ کام کر جائیں
اس کی خبر نہ تھی۔

"ارے......! اب تو ماموں کی بائیک اپنی ہوئی۔" شہریار نے نعرہ لگایا۔

"بالکل بھانجے......! آخر یہ ہمارا تم سے وعدہ تھا۔" صفدر نے پاکٹ میں سے
ک کی چابی نکال کر اسے تھمائی۔

"واہ بھئی......! مزہ آ گیا۔ آپ سب ماموں کے ساتھ ان کی گاڑی میں اور میں
بیگم کے ساتھ بائیک پر۔" شہریار کی شادی کم عمری میں ہوئی تھی، اس لئے شادی شدہ اور
ں کا باپ ہونے کے باوجود اس کے انداز میں بچپنا جھلکتا تھا۔

"چلیں نا بڑی آپا......!" تمام لوگ بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا چکے تھے
بڑی آپا ہنوز اپنی جگہ بیٹھی تھیں۔

"تم لوگ جاؤ، میرا دل نہیں چاہ رہا۔" انہوں نے روکھے انداز میں جواب دیا۔

"تو پھر ہم لوگ بھی نہیں جا رہے، آپ کے بغیر مجھے تو بالکل بھی مزہ نہیں آئے
میں ان کا انداز سمجھ رہی تھی، اس لئے ان کی دلجوئی کی خاطر ان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر
بھی جانے سے انکار کر دیا۔

"چلیں نا آپا......! بچوں کی خوشی کی خاطر موڈ بنا لیں۔"

صبیحہ باجی نے اصرار کیا۔ میری باقی دو نندیں اپنے اپنے گھر روانہ ہو چکی تھیں
صرف صبیحہ باجی ابھی تک رُکی ہوئی تھیں اور وہ بھی اپنے میاں کے ساتھ بچوں کو واپس بھیج
تھیں تا کہ ان کی پڑھائی کا حرج نہ ہو۔

"اچھا بھائی چلتی ہوں، تم بلائیں کہاں مجھے سکون سے رہنے دو گی۔" سب کے
اصرار پر بالآخر بڑی آپا کو ہار ماننی پڑی۔

اس شام ہم سب نے بہت انجوائے کیا۔ میں منور بھیا کو بھی بطورِ خاص ساتھ
کر گئی تھی۔

☆☆☆

ہمیں اپنے گھر شفٹ ہوئے مہینے سے اوپر ہو چلا تھا۔ شروع کے دن گھر کی س
اور آرائش میں گزرے۔ اس کام میں صفدر اور منور بھیا دونوں نے ہی میرا بہت ساتھ
بڑی آپا، ثریا اور تابندہ نے بھی کئی چکر لگائے۔ صبیحہ باجی نے تو باقاعدہ تین دن میرے
قیام کیا اور پھر اپنے گھر روانہ ہوئیں پھر آہستہ آہستہ زندگی اپنے معمول پر آتی چلی گئی۔
اپنے آفس اور میں گھریلو ذمہ داریوں میں مصروف۔

منور بھیا نے آسٹریلین طوطوں اور گھر کے ساتھ موجود چھوٹے سے لان میں
دلبستگی کا سامان ڈھونڈ نکالا۔ میں فارغ ہوتی تو انہیں باقاعدہ وقت دیتی۔ ہلکے پھلکے موضو
پر بات چیت، تبصروں اور خبروں کے ذریعے میں ان کا اعتماد بحال کرنے کی کوشش
ابتداء میں وہ جواب دیتے ہوئے جھجکتے لیکن بالآخر انہیں یقین آ گیا کہ میں ان کی ہتک
نشانہ بنا کر مذاق اُڑانے والوں میں شامل نہیں لیکن منور بھیا کی خود اعتمادی بس میری
ہی تھی۔ باہر کسی شخص سے بات چیت کرنے میں وہ اب بھی کتراتے ہی تھے۔ میں

ل سوچ رہی تھی کہ ایک دن ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا۔ ہم سب کو خاندان کی کسی تقریب
میں جانا تھا۔ صبح آفس جاتے ہوئے صفدر نے منور بھیا کو مخاطب کیا۔

"منے بھیا......! میرے براؤن شوز نکال کر پالش کر دیجئے گا۔ آج کی دعوت میں
پہننے ہیں۔"

مجھے صفدر کا اپنے بڑے بھائی کو اس طرح سے آرڈر دینا برا لگا لیکن مصلحت سے
کام لیتے ہوئے ہنس کر بولی۔

"جی ہاں......! ضرور، بدلے میں آپ بھی تو ان کے کپڑے پریس کریں گے۔"

صفدر منہ بناتے گھر سے نکل گئے۔ پیچھے سے میں نے ان کے اور منور بھیا کے
کپڑے استری کرنے کے ساتھ ساتھ، وہ براؤن شوز بھی پالش کر دیئے۔ صفدر واپس آئے تو
استری شدہ کپڑوں کو دیکھ کر طنز سے بولے۔

"یہ کام تو مجھے کرنا تھا، تم نے کیوں زحمت کی......؟"

"وہ تو میں نے منور بھیا کی دل آزاری نہ ہو، اس وجہ سے کہا تھا، ورنہ کیا کبھی میں
نے آپ کے کسی کام میں کوتاہی کی ہے۔" اخلاقیات سکھانا اپنی جگہ لیکن روٹھے میاں کو منانا
بھی بے حد ضروری تھا۔

"اس میں دل آزاری کی کیا بات ہے......؟ منے بھیا فارغ ہی رہتے ہیں سارا
دن۔ میرا ایک چھوٹا سا کام کر دینے میں کیا حرج ہو جاتا ان کا......؟" صفدر میرا پوائنٹ آف
ویو سمجھے ہی نہیں تھے۔

"یہاں آپ لوگوں ہی کا قصور ہے صفدر......! پہلے آپ لوگوں نے ایک انسان کی
شخصیت مسخ کی۔ اس نے نادانی میں اپنا برا بھلا نہیں سمجھا تو کسی نے انہیں احساس بھی نہیں
دلایا اور اب جب وہ کوئی قابلِ ذکر کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، آپ لوگ انہیں کسی
چھوٹے سے ہوٹل کے بیرے یا ورکشاپ کے چھوٹے کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ انہیں کسی
کام کا آرڈر دیتے وقت آپ کا انداز ایک بھائی سے بے تکلفی میں کہی جانے والی بات کے
بجائے ایک مالک کا سا ہوتا ہے۔ شاید آپ سوچتے ہوں کہ میں اس شخص کو کھلاتا پلاتا ہوں،

اس کے کپڑے بناتا ہوں، بیمار پڑ جائے تو دوا دارو کرتا ہوں، اس لئے میرا حق ہے کہ اسے جس طرح چاہے استعمال کروں لیکن مجھے ان کے ساتھ یہی سب کچھ ہونے دینا تھا؟ مجھے انہیں بڑی آپا کے گھر سے اُٹھا کر یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی----؟ میں چہرہ مقام بدلنے کے لئے انہیں یہاں نہیں لائی تھی۔ میں ان کے ساتھ کیا جانے والا سلوک چاہتی ہوں۔ انہیں ایک "چھوٹے" کے بجائے "فرد" کی حیثیت دینا چاہتی ہوں۔" آواز شاید رُندھ گئی تھی جو صفدر شرمندہ سے ہوکر بولے۔

"سوری یار......! مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنی حساس لڑکی ہو۔ آئندہ خیال رکھوں گا" اور میرے لئے فی الحال اتنا بھی کافی تھا۔

☆☆☆

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا تھا صفدر......! اگر آپ میرا ساتھ دیں تو اس پر عمل بھی کیا جاسکتا ہے۔" صفدر کو دودھ کا گلاس تھماتے ہوئے میں نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا

"ارشاد فرمائیے بیگم صاحبہ......! ہم سن لیتے ہیں کہ آپ کے ذرخیز ذہن میں کون سا خیال پیدا ہوا ہے۔" صفدر کا موڈ خوشگوار تھا۔

"ارباز بھائی کے ایک دوست کی دُکان ہے ہمارے گھر کے قریب، انہیں ایک ہیلپر کی ضرورت ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر ہم منور بھیا کو وہاں جاب کے لئے صفدر کے چہرے کے تاثرات میں بہت تیزی سے تبدیلی آئی تھی، اس لئے مجھے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑنا پڑا۔

"اس دن تو تم مجھے بڑا لیکچر دے رہی تھیں۔ بڑے بھائی کا خیال رکھنے، ان کی کمائی کا احسان جتانے کے سلسلے میں پھر اب کیا ہوا کہ تمہیں ان کی دو روٹیاں بھاری لگیں......؟ اور تم چاہتی ہو کہ وہ کما کر لائیں......؟"

وہ مجھ پر طنز کے تیر برسا رہے تھے۔ میں صبر سے بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی۔ ان کا رویہ میری توقعات کے برعکس ہرگز بھی نہیں تھا۔

"آپا سنیں گی تو انہیں کتنا دُکھ ہوگا۔ ہم اتنے سال ان کے گھر رہے لیکن انہوں

بھائی صاحب نے کبھی ایک دفعہ بھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔ بہن کے گھر رہ کر ایسا ہوتا تو وہ بھی چپ رہتے کہ بہنوئی کے سامنے بہن کا زور نہیں چلا ہوگا۔ لیکن یہاں رہ کر منے بھیا سے نوکری کروانے کا مطلب ہے، میں سارے جہان کو اپنے اوپر تھوکنے کا موقع دوں۔"

صفدر کا غصہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھی لیکن حوصلے سے کام لے کر ان کے نزدیک بیٹھ گئی اور ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"صفدر......! کیا آپ مجھے اتنا گرا ہوا سمجھتے ہیں کہ مجھے منور بھیا اپنے لئے بوجھ محسوس ہونے لگیں۔ وہ آپ کے بڑے بھائی ہیں اور جیسا احترام میرے دل میں ارباز بھائی کے لئے ہے ویسا ہی منور بھیا کے لئے بھی ہے۔"

تو پھر تم نے ایسی بات کی ہی کیوں......؟" صفدر کا منہ ہنوز پھولا ہوا تھا۔

"میں نے یہ بات بہت سوچ سمجھ کر اور صرف اور صرف منور بھیا کی بھلائی کے لئے کی ہے۔ مجھے نہیں معلوم آپ نے کبھی غور کیا یا نہیں، لیکن میں شادی کے بعد سے مسلسل نوٹ کر رہی ہوں۔ منور بھیا کی زندگی میں کچھ بھی نارمل نہیں۔ ان کی خوراک ایک جوان مرد کے بجائے ایک چھوٹے بچے جتنی ہے، وہ کئی کئی دن تک نہاتے نہیں ہیں، انہیں اپنے کپڑوں کا ہوش نہیں رہتا۔ ان کے مشاغل ٹی وی دیکھنے اور ریڈیو سننے تک محدود ہیں، وہ روپے پیسوں کا حساب ڈھنگ سے نہیں کر سکتے اور سب سے بڑھ کر ان میں خود اعتمادی کی کمی ہے۔ اگر وہ دُکان پر بیٹھنے لگیں گے تو انہیں لوگوں سے ملنے جلنے کا طریقہ آئے گا۔ وہ اپنی صفائی ستھرائی کا خیال رکھیں گے۔ گھر کی محدود فضا سے نکل کر باہر جائیں گے تو طبیعت پر اچھا اثر پڑے گا۔ ان کی بھوک کھلے گی۔ پھر کچھ پیسے ہاتھ آئیں گے تو ان میں اپنے ہونے کا احساس پیدا ہوگا۔"

میں نے کہنا شروع کیا تو صفدر کے چہرے کے تاثرات آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگے۔

"تمہاری بات میری سمجھ میں تو آرہی ہے، لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ منے بھیا کام کر بھی سکیں گے......؟ کیونکہ انہیں حساب کتاب بالکل نہیں آتا اور دُکان پر ظاہری بات ہے

ساراوقت پیسے کالین دین ہی چلتا ہے۔"

"اس سلسلے میں آپ فکر نہ کریں۔ ارباز بھائی اپنے دوست سے ساری بات خو کرلیں گے۔ ویسے بھی انہیں ہیلپر کی ضرورت ہے، روپے پیسے کالین دین وہ خود ہی سنبھ لیں گے۔ ساتھ ساتھ منور بھیا کو بھی سکھاتے جائیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ منور بھیا وہاں ہوجائیں گے۔ ویسے بھی خدشات میں گھر کر عمل نہ کرنے سے بہتر یہ ہے کہ موقع سے فا اُٹھانے کی کوشش کی جائے۔"

صفدر جیسے خدشات مجھے بھی تھے، لیکن میں ساتھ ساتھ پراُمید بھی تھی۔ خاص طو منور بھیا کی طبیعت میں موجود فرمانبرداری کے عنصر کی وجہ سے، اس قسم کے لوگوں کی خامیاں مالکان عموماً نظرانداز بھی کردیتے ہیں۔ پھر ارباز بھائی کی دوستی کا بھی کچھ لحاظ رکھنا تھا۔

"ایک مسئلہ اور بھی ہے صبوحی......! جو زیادہ شدید ہے۔ بڑی آپا اس بات خوش نہیں ہوں گی۔ بلکہ شاید ناراض ہی ہوجائیں۔" صفدر نے تشویش کا اظہار کیا۔

"اس بات کا تو مجھے بھی ڈر ہے لیکن صفدر......! انہیں یہ بات سمجھنی چاہئے کہ بھیا ایک عاقل و بالغ شخص ہیں اور میں اس معاملے میں ان کی رضامندی لے چکی ہوں، ہی بات کو یہاں تک پہنچایا ہے۔"

"بڑی آپا کو کچھ سمجھانا بہت مشکل ہے وہ صرف اپنی بات کو ہی صحیح جان دوسروں سے منوانے کی عادی ہیں۔ خیر ایسا کرتے ہیں کہ فی الحال ان سے یہ بات چھ ہیں۔ منے بھیا نے اچھا رزلٹ دیا تو بتادیں گے ورنہ خاموشی سے ان کی جاب چھڑوا کر ختم کردیں گے۔ لیکن تم اس سلسلے میں منے بھیا کو اچھی طرح سمجھا دینا۔"

صفدر اپنی بہن کی نیچر کو میرے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح جانتے تھے اس میں نے ان کی تجویز پر صاد کیا۔

☆☆☆

"یہ منا مجھے کمزور لگ رہا ہے، خیریت تو ہے، طبیعت وغیرہ تو ٹھیک

ی......؟"

ہم اتوار کا دن بڑی آپا کے گھر گزارنے گئے تھے۔ باتیں کرتے کرتے اچانک ہی ی آپا نے منور بھیا کی طرف رُخ کیا اور تشویش کا اظہار کرنے لگیں۔ حالانکہ اگر میں نبداری سے کام لوں تو منور بھیا کی صحت ماضی کے مقابلے میں کچھ بہتر ہی ہوئی تھی۔

"منور بھیا بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں بڑی آپا......! آپ فکر نہ کریں۔ میں اور صفدر ان پورا خیال رکھتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر ان کی تسلی کرنا چاہی۔

"منے......! کیا بات ہے......؟ کیا کھانا وغیرہ صحیح سے نہیں کھاتے......؟" میری ات کو نظرانداز کرکے بڑی آپا نے براہِ راست منور بھیا سے پوچھا۔

"ہاں بھئی......! تسلی کروا دو اپنی آپا کی۔ ان کے انداز سے تو لگ رہا ہے کہ جیسے ن کا بھائی فوجی ٹریننگ لے کر واپس آیا ہو۔" بھائی صاحب نے شاید میرا دُھواں دُھواں ہوتا رہ دیکھ لیا تھا۔ سو منور بھیا کو مخاطب کرتے ہوئے پُرمزاح انداز میں بولے۔

"ویسے میں سوچ رہا ہوں اگر سارے فوجی منے ماموں جیسے ہوں تو کتنا مزہ آئے۔ نوں کو یہ نظر نہیں آئیں گے اور وہ بیچارے سمجھیں گے کہ جنوں سے واسطہ پڑ گیا ہے۔" سدا کے نان سیریس شہریار نے منے بھیا کے دُبلے پن کو نشانہ بناتے ہوئے شوشہ چھوڑا تو ہم سب بے ساختہ ہنسنے لگے۔

"خیریت بھئی......! یہ اتنے قہقہے کس سلسلے میں لگائے جارہے ہیں۔" ثریا جواب کچن میں تھی وہاں آئی تو ہم سب کو ہنستے دیکھ کر وجہ پوچھنے لگی۔

"ہم لوگ منے ماموں کی صحت پر تبادلہ خیال کررہے تھے۔" شہریار نے مسکراہٹ باتے ہوئے بتایا۔

"ہاں......! یہ بات تو میں بھی کہنی والی تھی۔ ماشاءاللہ سے منے ماموں کی صحت کے مقابلے میں کافی بہتر ہوگئی ہے۔" وہ انجانے میں ایک ایسی بات کہہ گئی تھی جو سراسر ی آپا کے خلاف جاتی تھی۔ سو ان کا غصے میں آنا لازمی تھا۔

"تمہارا باتوں میں بہت دل لگتا ہے ثریا......! یہ نہیں کہ جلدی سے کھانا پکا کر فارغ

ہو جاؤ۔ پھر کرتی رہنا اپنا شوق پورا۔" بڑی آپا نے اسے ڈپٹا تو بیچاری ڑیا جو اپنے قصور سے ناواقف تھی بوکھلا کر واپس کچن میں چلی گئی۔

"ایک بات ہے منور میاں.....! تمہارے جانے سے کسی پر اثر پڑا ہو یا نہ پڑا ہمیں تمہاری کمی بڑی محسوس ہوتی ہے۔" میرے علاوہ صرف بھائی صاحب ہی تھے جو منور کو منا کہنے کے بجائے ان کا صحیح نام لے کر مخاطب ہوتے تھے۔

"وہ اس لئے کہ اب ابو کو منے ماموں کے حصے کے سارے کام کرنے پڑتے ہیں۔" شہریار کی زبان ایک بار پھر پھسلی تھی۔

"تم جیسا نکما بیٹا ہو تو باپ کو ساری ذمہ داریاں اُٹھانی پڑتی ہیں۔"

بڑی آپا نے غضب ناک ہو کر اسے دیکھا۔

"ارے بڑی آپا.....! میں تو آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔ کل آفس میں چھوٹی آپا کا فون پر بات ہوئی تھی۔ سب کو سلام کہہ رہی تھیں۔"

صفدر جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھے تھے لاڈلے بھانجے کی طرف توپوں کا رخ ہوتے دیکھا تو بات کا رُخ بدل کر بڑی آپا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"اچھا.....! وعلیکم السلام.....! اور کیا کہا اس نے.....؟" بڑی آپا فوراً ہی متوجہ ہوئیں۔

"کہہ رہی تھیں کہ صبوحی کو لے کر لاہور آؤ۔ تمہاری سیر بھی ہو جائے گی اور ہماری طرف سے دعوت بھی۔" صفدر تفصیلات بتانے لگے۔

"ہاں تو لگا لو ناں لاہور کا چکر بلکہ باقی دو کے گھر بھی ہو آؤ۔ اتنے ارمانوں سے بہنوں نے تمہاری شادی کی ہے۔ اکلوتی بھاوج کو اپنے سسرالیوں سے بھی تو متعارف کرا ہوگا انہوں نے۔" بڑی آپا نے صفدر کو مشورے سے نوازا۔

"میرا بھی یہی ارادہ ہے آپا.....! بس ذرا آفس سے چھٹیوں کا مسئلہ ہے۔ جیسے چھٹیاں ملیں گی انشاء اللہ تینوں بہنوں کے گھر صبوحی کو لے کر جاؤں گا۔"

صفدر کی حکمت عملی بڑی کامیاب رہی تھی۔ بڑی آپا سب کچھ بھول کر گفتگو

معروف ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

"اس ہفتے کو تمہاری سالگرہ آ رہی ہے نا صبوحی.....؟" ٹی وی دیکھتے دیکھتے صفدر نے مجھے مخاطب کیا تو مجھے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ کیونکہ صفدر قدرے لاپرواہ طبیعت کے انسان تھے اور شادی سے قبل منگنی کے مختصر سے پیریڈ میں بتائی گئی یہ بات انہیں یاد ہوگی، مجھے بالکل اُمید نہیں تھی۔

"میں سوچ رہا ہوں ہم اس روز بڑی آپا وغیرہ کو اپنے ہاں انوائٹ کر لیں۔"

"لیکن بچوں کی طرح میری سالگرہ منانا کچھ عجیب سا نہیں لگے گا۔" صفدر کی تجویز پر میں نے کچھ جھجکتے ہوئے اعتراض کیا۔ کیونکہ مجھے وہ اس وقت کافی سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔

"میں چاہتا ہوں اس بہانے بڑی آپا ہمارے گھر آئیں اور ہمیں آپس میں مل بیٹھ کر ہنسنے بولنے کا موقع ملے۔ کیونکہ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ بڑی آپا ہم لوگوں سے کچھ ناراض سی ہیں۔ خصوصاً اس روز جو ان کے گھر میں بدمزگی ہوئی تھی اس کے بعد سے وہ ہم لوگوں سے ملنے تک نہیں آئیں۔ یہاں آئیں تو تم تھوڑا ان کے لئے اہتمام کر لینا۔"

"جی اچھا.....!" میں نے خاموشی سے ہامی بھر لی۔ ورنہ اُصول کی بات تو یہ تھی کہ میں نے بڑی آپا کے ساتھ کسی قسم کی گستاخی نہیں کی تھی۔ جو انہیں منانے کے لئے جدوجہد کرتی پڑتی۔ وہ ہی اپنی کسی اندرونی جلن کی بناء پر منور بھیا کی صحت کو موضوع بنا کر مجھ پر نکتہ چینی کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور اپنے ہی شوہر اور بچوں کے ریمارکس جب اپنے خلاف سنے تو برداشت نہیں کر پائیں۔ بہرحال میری تو وہ ندکم ساس تھیں، سو مجھے ان کی ناجائز ناراضی ختم کرنے کے لئے بھی اقدامات کرنے ہی تھے۔

دوسرے دن میں نے منور بھیا کو بھی اس پروگرام سے آگاہ کر دیا تھا، میری سالگرہ کا سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔

"م.....م.....میں.....گھر.....میں سجاؤں گا۔" انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا

تو میں مسکرا دی۔

"جو آپ کا دل چاہے وہ کیجئے گا۔ آخر یہ گھر آپ کا بھی تو ہے۔"

اور واقعی انہوں نے اس سلسلے میں تیاریاں شروع کر دیں۔ نا صرف اپنا سے سجاوٹ کا سامان منگوایا بلکہ ہفتے کے دن کی خصوصی چھٹی بھی لے لی۔ میری سالگ دن وہ صبح سے ہی بہت مصروف تھے، رنگ برنگے غبارے، ربن، نقلی پھول اور دیگ چھوٹی چیزیں تھیں جو سجاوٹ کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ ایک بار میرے دل میں بھی کہ منور بھیا کو روک دوں کہ سب مذاق اُڑائیں گے، پھر مجھے لگا کہ منور بھیا کے اتنی اہمیت ہے کہ میں باقی سب کا مذاق اُڑانا برداشت کر لوں گی، انہیں دُکان پر بیٹھ وار اُجرت ملتی تھی۔ بہت کم سہی لیکن وہ ان کی اپنی کمائی تھی، جسے وہ زندگی میں پہل مرضی سے خرچ کر رہے تھے۔ سو انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر میں کچن میں مصروف ہو

"ماموں......! آپ کا منا کہاں ہے......؟ اسے بلائیں تاکہ کیک کاٹا
شام میں جب ہم سب کیک کاٹنے کے لئے ٹیبل کے گرد کھڑے تھے تابندہ نے صفدر

"ہائیں منا کہاں سے آیا......؟ شادی کے ڈھائی مہینے بعد سالگرہ منانے کو کہاں سے مہیا کریں......؟" صفدر سخت حیرت کا شکار تھے۔

"تمہیں کیا معلوم، یہاں کی سج دھج سے تو یہی لگ رہا ہے کہ آپ اپ ارجمند کی سالگرہ منا رہے ہیں۔" تابندہ نے بے نیازی سے کہا تو ایک زوردار قہقہہ

"یہ سارا اہتمام تو منے بھیا نے کیا ہے۔" صفدر نے جھینپ کر وضاحت میں خود اعتمادی سے کھڑی مسکراتی رہی۔ یہ ردِعمل میری توقع کے خلاف نہیں تھا۔

کیک کٹنے کے بعد جب سب نے مجھے گفٹس دینے شروع کئے تو منو ایک پیکٹ لے کر جھجکتے ہوئے میرے پاس آئے۔ میں نے فوری طور پر وہ پیکٹ کھولا تو اندر سے موتیے اور گلاب کے گجرے نکلے۔

"اُف......! زبردست، بہت خوبصورت گفٹ دیا ہے آپ نے بھیا......! تھینک یو ویری مچ۔" میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فوراً گجرے ا

میں لپیٹ لیے۔ منور بھیا کے چہرے پر میری پسندیدگی کے اظہار نے چمک سی دوڑا دی۔

"ہاں بھئی......! بھاوج چہیتی جو ہوئیں۔ ورنہ آج سے پہلے نہ انہیں کسی کے لئے اہتمام کرتے دیکھا نہ تحفے لاتے۔" بڑی آپا نے بظاہر ہنس کر کہا لیکن ان کے لہجے میں حسد کی جو لپک تھی، وہ میں نے بہت اچھی طرح محسوس کی۔

"بڑی آپا......! یہ بیٹھے دہی بھلے میں نے اسپیشلی آپ کے لئے بنائے ہیں۔ صفدر بتا رہے تھے کہ یہ آپ کی پسندیدہ ڈش ہیں۔ ذرا کھا کر تو بتائیں کیسے ہیں......؟"

بڑی آپا کی بات کو نظرانداز کر کے میں نے انہیں خوش دلی سے مخاطب کیا۔ ایک تو صفدر کی ہدایت دوسرے خود مجھے ان سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی، جواباً میں خود بھی اینٹھ کر بیٹھ جاتی۔ ایک دوسرے کے ساتھ گپیں لگانے اور کھانے پینے میں وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ کسی کو اندازہ ہی نہیں ہوا۔

"اوہو......! اتنا وقت ہو گیا اب چلنا چاہئے۔" سب سے پہلے تابندہ کے شوہر کی نظر گھڑی پر پڑی تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"یار......! اب اتنی رات کو گھر جا کر کیا کرو گے۔ فون کر کے بتا دو کہ آج ہمارے ہاں رُک رہے ہو۔"

صفدر نے کہا تو میں نے بھی ان کی پرزور تائید کی اور بالآخر تھوڑی سی پس و پیش کے بعد تمام ہی لوگ رُکنے پر راضی ہو گئے۔ یوں بھی اگلے دن اتوار تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن میں صبح جلدی ہی اُٹھ گئی۔

منور بھیا کو ناشتہ بنا کر دیا اور خود کچن سمیٹنے لگی۔ رات زیادہ ہو جانے کے باعث کل یہ کام نہیں ہو سکا تھا۔ جب تک منور بھیا ناشتے سے فارغ ہو کر دُکان پر گئے، میں اچھا خاصا کام نمٹا چکی تھی۔ صفدر سمیت باقی لوگ ابھی تک لمبی تان کر سو رہے تھے اور میری کوشش تھی کہ ان کے جاگنے سے پہلے ناشتے کے اہتمام کی تیاری کر لوں۔

"یہ تم میں بڑی اچھی عادت ہے کہ صبح دیر تک نہیں سوتیں، ثریا کی اسی عادت سے

میں سب سے زیادہ عاجز ہوں۔" تھوڑی دیر بعد بڑی آپا کچن میں چلی آئیں اور پہلی با
سراہا۔

"آپ کو چائے دوں آپا......!" وہ چائے کی رسیا تھیں، سو میں نے ان
پوچھا۔

"ہاں بھئی......! دے دو۔ چائے کی پیالی کے بغیر تو سستی ہی رہتی ہے۔ و
رات دیر تک جاگنے سے طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے۔ دیر تک سونے کی عادت نہیں، س
وجہ سے بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی رہی۔ کب سے تمہاری کھٹر پٹر کی آوازیں سن رہی
اب ہمت کر کے اُٹھ آئی ہوں۔" انہوں نے تفصیل سے بتایا اس دوران میں چائے
چولہے پر رکھ چکی تھی۔

"یہ لوگ ایسے اُٹھنے والے ہیں، انہیں اُٹھانا پڑے گا۔" وہ چائے پی کر فارغ
چکی تھیں۔ ایک ایک کر کے انہوں نے سب کو جگا ڈالا۔ تمام لوگوں کے منہ ہاتھ دھو
خوان پر جمع ہونے تک میں ناشتہ بنا چکی تھی۔

"یہ منا کہاں ہے......؟ اسے ناشتہ نہیں کرنا۔" گرم گرم پراٹھے کا نوالہ م
رکھتے ہوئے بڑی آپا کو خیال آیا۔

"وہ تو بہت صبح آپ کے اُٹھنے سے بھی پہلے ناشتہ کر چکے۔" میں نے انہیں ا
فراہم کی۔

"لیکن وہ ہے کہاں......؟ گھر میں تو مجھے دکھائی نہیں دیا۔"

"یہیں کونے کی دُکان تک گئے ہیں۔ آپ ناشتہ کریں ابھی آجاتے ہیں۔"

اس بار جواب دینے کی ذمہ داری صفدر نے اُٹھائی، وہ کافی گھبرائے ہوئے
لیکن آپا نے نوٹ نہیں کیا اور ناشتے میں مصروف ہو گئیں۔

"تم نے منع کیوں نہیں کیا منے بھیا کو آج دُکان جانے سے......؟ اب م
ہوں انہیں بلانے ورنہ آپا قیامت برپا کر دیں گی۔ اگر انہیں خبر ہو گئی تو......" میں برتن سم
کچن میں رکھنے گئی تو صفدر بھی میرے پیچھے ہی چلے آئے۔

"کل منور بھیا کو چھٹی اسی بنیاد پر ملی تھی کہ وہ آج کا دن دُکان پر گزاریں گے۔ کل
ان پر راشن آیا تھا اور کام بہت تھا۔ لیکن منے بھیا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج ضرور آئیں
گ۔ اس لئے انہیں جانا پڑا۔ ویسے بھی ہم اس بات کو کب تک چھپا سکتے ہیں۔ اچھا ہے سب
معلوم ہو جائے، پہلے بھی آپ کے مشورے کی وجہ سے میں نے چھپایا ورنہ محنت کرنا اور
پنے ہاتھ سے کمانا کوئی جرم نہیں، جسے لوگوں سے چھپایا جائے۔"

میری بات نے صفدر کو مطمئن کیا یا نہیں، لیکن وہ خاموش ہو گئے۔

"دادی......! پتا ہے ہم کہاں سے چیز لے کر آئے ہیں۔ منے ماموں کی دُکان سے
انہوں نے ہم سے پیسے بھی نہیں لئے۔"

ناشتے کے برتن دھو کر میں سب کے درمیان کمرے میں آکر بیٹھی تو شہریار اپنے
ں کے ساتھ گھر واپس آیا، یقیناً وہ ان کی فرمائش پر انہیں دُکان سے چیزیں دلانے لے گیا
اور بچے وہاں منور بھیا کو دیکھ کر ایکسائیٹڈ ہو رہے تھے۔

"یہ منا ابھی تک گھر نہیں آیا۔ وہاں دُکان پر بیٹھا کیا کر رہا ہے......؟" بڑی آپا کو
ہ بار پھر بھائی کی یاد ستائی۔

"بڑی آپا......! اصل میں بات یہ ہے کہ منور بھیا اس دُکان پر جاب کرتے ہیں۔
ے شام چھ بجے تک۔ درمیان دوپہر کے کھانے کے وقت ایک گھنٹے کے لئے آتے ہیں
وڑا سا آرام کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔"

میری دھیرے سے کہی بات کوئی دھماکا تھی جس نے سب کو ساکن کر دیا۔ بالآخر
آپا ہی سب سے پہلے سکتے سے باہر آئیں۔

"غضب خدا کا، شرم نہیں آئی تم لوگوں کو مجھے یہ بات بتاتے ہوئے......؟ تم تو
م سے اسے لائی تھیں جیٹھ کو، دو دن بھی بٹھا کر روٹی نہیں کھلائی گئی جو نوکری سے لگا دیا
لدار......! میں تم سے پوچھتی ہوں، تمہاری ہزاروں کی تنخواہ پر اس بے زبان بھائی کا کوئی
ں جو تم اس سے دوسروں کی غلامی کروا رہے ہو......؟" بڑی آپا کا غیض ہم دونوں میاں
و لپیٹ میں لے رہا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں آپا.....! خدانخواستہ منے بھیا میرے لئے بوجھ کبھی
گے.....؟ یہ تو بس ان کی بہتری کے لئے ہم نے ایک مصروفیت انہیں دی ہے اور
شاید نوٹ نہیں کیا اس سے ان کی حالت میں کتنا فرق آیا ہے۔ وہ پہلے کے مقابلے
اچھے اور خوداعتماد ہوگئے ہیں۔" صفدر بہن کو منانے کی کوشش کرنے لگے۔

"اور آپا.....! ہم کوئی منور بھیا سے ان کی کمائی تھوڑی لیتے ہیں۔ ان کے
کے پاس ہی رہتے ہیں۔ ابھی وہ گھر آئیں تو آپ خود ان سے پوچھ لیجئے گا۔" میں
گفتگو میں حصہ لیا، لیکن ان کا پارہ بے حد ہائی ہو چکا تھا۔

"تم چپ رہو۔ کس قدر سازشی اور چالاک عورت ہو، یہ تو مجھے آج
ہے۔ میاں کی لگامیں تو تمہارے ہاتھ میں تھیں ہی، ساتھ میں تم نے بیٹے کو بھی مٹھی
تم میاں کو بے وقوف بنانے کو سنے کی کمائی ہاتھ میں نہیں لیتیں، لیکن وہ لٹا تو تم پر
کل ہم نے آنکھوں سے دیکھا تھا تحفے تحائف کا لین دین۔ ہمارے پیچھے تو جانے
ہوتا ہوگا۔"

"آپ زیادتی کر رہی ہیں بڑی آپا.....! صبوحی نے تو بہت خلوص سے
بہتری کے لئے ایک اقدام کیا تھا۔ آپ کو ناپسند ہے تو ٹھیک ہے ہم ختم کروا دیتے
بھیا کی ملازمت۔" میں بڑی آپا کی باتوں پر بالکل گنگ رہ گئی تھی۔ البتہ صفدر جو
سائڈ لیتے تھے، آج پہلی بار میرے حق میں بولے۔

"تم اور تمہاری بیگم اپنے خلوص کا ٹوکرا لئے بیٹھے رہو۔ میں اب منے کو
نہیں چھوڑنے والی۔ جاؤ شہریار.....! بلا کر لاؤ منے کو۔ وہ ہمارے ساتھ ہی واپس
انہوں نے صفدر کو صاف جواب دیتے ہوئے شہریار کو ہدایت دی۔ چند منٹوں
حیران پریشان سے شہریار کے ساتھ گھر پر موجود تھے۔

"چلو منے.....! جا کر اپنا سامان باندھو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ اپنے گھ
ہوں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ان تنگ دل لوگوں کے ساتھ رہنے کی۔"

بڑی آپ نے انہیں دیکھتے ہی آرڈر دیا تو وہ ہکا بکا ہو کر مجھے

لگے۔ اس وقت میں اور صفدر دونوں ہی کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

"بھائی بھاوج کو کیا دیکھ رہے ہو.....؟ میرے ہوتے تمہیں ان سے ڈرنے کی کوئی
ضرورت نہیں۔ جاؤ اور اپنا سامان باندھو۔" ایک طرف بڑی آپا کا آڑو، دوسری طرف میری
اور صفدر کی خاموشی۔ اسی صورتِ حال میں منور بھیا جیسا انسان خود سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا
سو انہیں بڑی آپا کے ارشاد کی تعمیل کرنی پڑی۔

جس پل منور بھیا نے گھر کی دہلیز پار کی میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں نے
ایک انسان کی شخصیت کی تعمیر کی کوشش کی تھی اور جواباً میرے دل پر ایسے زخم لگائے گئے تھے
جن کی کسک شاید ایک طویل عرصے تک میرے دل میں رہنا تھی۔

☆☆☆

"میں آفس سے ایک مہینے کی چھٹیاں لے رہا ہوں۔ تم ایسا کرو کپڑوں وغیرہ کی
پیکنگ کر لو، ہم چھوٹی آپا، ثمینہ آپی اور صبیحہ باجی تینوں کے گھر چلیں گے۔"

منور بھیا کو ہمارے گھر سے گئے چوتھا دن تھا کہ صفدر نے مجھ سے کہا۔ شاید گھر کی
فضا میں در آنے والی خاموشی اور میرے چہرے کی اُداسی نے ان سے یہ فیصلہ کروا دیا تھا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے، ضرور بڑی آپا نے ضرور ان لوگوں سے بھی بات کی ہوگی اور
میرے متعلق پتا نہیں کیا کیا کہا ہوگا۔" میں خدشات میں گھری ہوئی تھی۔

"اگر ایسا ہے تب بھی ہمیں سب کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ بڑی آپا فی الحال
ناراض ہیں لیکن میں ہمیشہ تو یہ ناراضی قائم نہیں رہنے دوں گا اور اس کے لئے میرا باقی تینوں
بہنوں سے فوراً حاصل کرنا بہت ضروری ہے اور پھر تم کس لئے ڈر رہی ہو.....؟ تم نے جو کچھ
کیا تھا نیک نیتی کے ساتھ کیا تھا، تم کیا سمجھ رہی ہو کہ جیسے بڑی آپا تمہارے خلوص کو نہیں سمجھ
پائیں وہ تینوں بھی نہیں سمجھیں گی۔ ایسا نہیں ہے صبوحی.....! بڑی آپا کی طرح وہ تینوں اس
قدر جذباتی نہیں ہیں کہ اگلے کا پوائنٹ آف ویو جاننے کو تیار ہی نہیں ہوں۔" صفدر نے مجھے
تسلی دی تو میں قدرے مطمئن ہوگئی۔

"ٹھیک ہے میں تیاری کر لوں گی، لیکن آپ میرے ساتھ بازار چلئے گا، تاکہ میں

وہاں والوں کے لئے تحفے تحائف خرید سکوں۔ خالی ہاتھ بہنوں کے گھر جانا برا محسوس ہوتا

"تم ایسا کرو اپنی امی کے گھر دو تین دن کے لئے جاؤ، وہیں سے اپنی بہن کو لے کر شاپنگ کے لئے چلی جانا۔ جانے سے پہلے مجھے آفس کے بہت سے ضروری نمٹانے ہیں، میں وقت نہیں نکال پاؤں گا۔"

میری بات کے جواب میں صفدر نے اپنی مجبوری بتاتے ہوئے مشورہ دیا تو میں راضی ہوگئی۔ میں خود بھی امی کے گھر جانا چاہ رہی تھی۔ منور بھیا نے جس طرح اچانک چھوڑی تھی، اس کی خبر ارباز بھائی کو ان کے دوست نے پہنچا دی تھی۔ ارباز بھائی مجھ سے بارے میں پوچھنے آئے بھی تھے اور میں نے کسی حد تک ان کی تسلی بھی کروا دی تھی، جس طرح روزانہ فون کر کے مجھ سے خیر خیریت معلوم کر رہی تھیں مجھے لگتا تھا کہ وہ طرف سے پریشان ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی میں ہونے والی شدید تکلیف کے باعث وہ گھر نکل نہیں پا رہی تھیں، ورنہ اب تک خود آچکی ہوتیں اب مجھے موقع مل رہا تھا کہ میں خود ان کی تشفی کروا سکوں۔ یقیناً میرے اور صفدر کے لاہور جانے کی خبر ان کو انہوں نے جانا تھا۔ نہ جانے کیوں ہماری مائیں بیاہی بیٹیوں کی طرف سے خدشات کا شکار رہتی ہیں

☆☆☆

"چھوٹی آپا اور ثمینہ آپی کا کیا ردِعمل تھا اس واقعہ پر.....؟"

مونگ پھلی کے دانے منہ میں ڈالتے ہوئے صبیحہ باجی نے مجھ سے پوچھا وقت میں ان کے بیڈ روم میں ان کے ساتھ کمبل میں گھسی بیٹھی تھی۔ صفدر اپنے بہنوئی ٹی وی لاؤنج میں تھے، جبکہ بچے سو چکے تھے۔ میں اور صفدر باری باری چھوٹی آپا اور کے گھر رہ کر اب صبیحہ باجی کے گھر پہنچ چکے تھے۔

"چھوٹی آپا نے تھوڑی سی ڈانٹ پلائی اور بڑی آپا سے معافی مانگنے کا کے ساتھ اپنی سفارش کی یقین دہانی کروائی۔ ثمینہ آپی نے اس موضوع کو چھیڑا نہیں چپ رہے۔ اب آپ نے پوچھا ہے تو آپ کو سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دیا ہے، کچھ آپا نے بھی فون پر خبر دی ہوگی۔ اب آپ بتائیں کہ اس سارے معاملے میں سوا

کہ میں منور بھیا کی بھلائی چاہتی تھی، ہمارا کیا قصور تھا.....؟"

"تمہارا قصور یہ تھا کہ تم نے سب فیصلے خود ہی کر لئے۔ اگر تم اس کام سے پہلے مجھے یا چھوٹی آپا کو اعتماد میں لیتیں تو ہمارا ووٹ تمہارے ساتھ ہوتا اور بڑی آپا اتنی آسانی سے تم پر چڑھائی نہ کر پاتیں۔ اب جو انہوں نے واویلا مچایا ہے کہ تم منے کے ساتھ ظلم کر رہی تھیں اس سے تمہاری بچت ہو جاتی۔ چھوٹی آپا اور ثمینہ آپی ہمیشہ بڑی آپا کے زیر اثر رہی ہیں، اس لئے انہوں نے ان کی ہر بات پر یقین بھی کر لیا۔ لیکن میں بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی عادی ہوں۔ تم جب منے کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی تھیں، میں نے تب ہی بڑی آپا کی تلملاہٹ محسوس کر لی تھی۔ ایک تو انہیں دو دن کی آئی لڑکی کا اپنی مرضی چلانا پسند نہ آیا، دوسرے تم ان سے ان کا کل وقتی ملازم چھین لے گئیں۔ ہے تو بہت تلخ اور افسوس ناک بات لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم اور بڑی آپا نے منے سے ملازموں جیسا ہی سلوک روا رکھا اور اس سے بھی زیادہ شرم ناک بات یہ ہے کہ ہم لوگ اس حقیقت کو سمجھنے کے باوجود ہمیشہ چشم پوشی کرتے رہے۔ منا ایک بے ضرر، خاموش طبع اور ہمارے لئے قدرے غیر مفید انسان تھا تو ہمیں کیا ضرورت پڑی تھی کہ ہم بڑی آپا کو غلطیوں کا احساس دلاتے اور وہ جو ہماری خاطر مدارات کرتی تھیں عید بقر عید پر، ہمیں اور ہمارے بچوں کو تحائف بھیجتی تھیں۔ انہیں خود سے ناراض کرتے۔ اصل بات یہ ہے صبوحی.....! کہ ہم سب اپنے اپنے مفاد دیکھتے رہے۔ ہم نے اپنے مظلوم بھائی کی طرف سے دانستہ نظریں پھیرے رکھیں، لیکن یقین کرو جب تم نے انہیں اپنے ساتھ گھر لے جانے کا فیصلہ کیا تو مجھے بہت اچھا لگا۔ کیونکہ میں نے تمہاری آنکھوں میں منے کے لئے ہمدردی کے جذبات دیکھے تھے۔"

صبیحہ باجی کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی کہ کیا غرض اور ضرورت کے رشتے اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ انسان اپنے خونی رشتوں کے ساتھ انصاف تک کرنا بھول جائے۔

"یہاں سے واپس جاؤ تو بڑی آپا کے گھر ضرور جانا۔ کوشش کرنا کہ ان کے دل سے تمہارے لئے ناراضی ختم ہو جائے۔ اگلے مہینے میں کراچی کا چکر لگاؤں گی تو خود ان سے

بات کروں گی اور مجھے یقین ہے کہ وہ منے کو تمہارے گھر بھیجنے کے لئے راضی ہو جائیں گی
اتنے برے دل کی عورت نہیں ہیں۔ دراصل ہماری خاموشی نے انہیں ان کی غلطیوں پر
رہنا سکھایا ہے۔ لیکن جب ہم میں سے کوئی انہیں احساس دلائے گا تو وہ سنبھل جائیں گی
صبیحہ باجی کے الفاظ نے مجھے اُمید دلائی کہ اب ظلم و ناانصافی کے خلاف
اُٹھانے والوں میں میرے ساتھ ایک آواز کا اضافہ اور ہو چکا ہے۔

☆☆☆

میں صفدر کے ساتھ بہت ڈرتے ڈرتے بڑی آپا کے گھر آئی تھی۔ ہم کل ہی
کراچی پہنچے تھے، اور آج تحائف سے بھرا بیگ لئے بڑی آپا کے گھر کے سامنے کھڑے
تھے۔ بیرونی گیٹ کھلا تھا، اس لئے ہم خود ہی اندر چلے گئے۔ صبح کا وقت تھا اس لئے گھر
میں خاموشی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اور صفدر برآمدے سے گزر کر بڑی آپا کے کمرے
طرف بڑھنے لگے کہ کسی کے بری طرح کھانسنے کی آواز نے مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کیا
کھانسی سے بے حال ہوتے وہ منور بھیا تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر میں دھک سے
رہ گئی۔ کمزور تو وہ پہلے ہی تھے لیکن اب تو بالکل لاغر ہو چکے تھے۔ سفید پڑتے چہرے
زندگی کی رمق گویا گم ہوتی جا رہی تھی۔

"منور بھیا...... ! کیا حال بنا رکھا ہے آپ نے اپنا......؟ طبیعت تو ٹھیک ہے
کی......؟"

میں لپک کر ان کے پاس پہنچی، میری آواز پر انہوں نے میری طرف دیکھا تو
لگا ان کی آنکھوں میں چمک سی جاگی ہو، لیکن بس ایک پل کی ہی بات تھی پھر انہوں
آنکھیں موند لیں۔ میں نے ان کی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔ بخار کی حدت نے میری اُنگلیوں
پوروں کو دہکا دیا۔

"منور بھیا...... ! آپ کو اتنا تیز بخار ہو رہا ہے اور آپ یہاں اتنی ٹھنڈک میں
ہوئے ہیں......؟ چلیں اُٹھ کر اندر اپنے کمرے میں چلیں۔" میں نے انہیں آواز دی
انہوں نے جواب دینے کے بجائے میری طرف سے کروٹ بدل لی۔

میرے دل میں شدت سے احساس جاگا کہ وہ مجھ سے ناراض ہیں اور میری کوئی
سننا نہیں چاہتے۔ میں مایوسی سے وہاں سے اُٹھ کر بڑی آپا کے کمرے میں پہنچی۔ جہاں
یقیناً معافی تلافی کے مراحل طے کر چکے تھے۔

"السلام علیکم بڑی آپا......!"

"وعلیکم السلام......!" انہوں نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

"آپا......! یہ منور بھیا کو کیا ہوا ہے......؟ مجھے تو ان کی طبیعت بہت خراب لگ رہی
ہے۔" مجھے بڑی آپا کے موڈ سے زیادہ منور بھیا کی فکر تھی۔

"سب تمہاری مہربانیاں ہیں بی بی......! تم نے اپنی خودمختاری دکھائی، کسی سے
ہانہ تا چھا اور جو دل چاہا وہ کرتی چلی گئیں۔ ارے کیا ہم سے بڑھ کر تمہیں ہمارے بھائی کی
تھی۔ چلی تھیں اس کی بھلائی کرنے۔ نوکری تم نے اس کے ساتھ نیکی۔ اتنے کمزور شخص
نوکری کرواؤ گی تو یہی حال ہوگا۔ جب سے تمہارے گھر سے آیا ہے بیمار پڑا ہے۔ اس
ارے کی جان ہی کتنی تھی۔ ادھ موا ہو کر رہ گیا ہے۔"

بڑی آپا مجھ پر چڑھ دوڑیں۔ صفدر نے مجھے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور
ں سر جھکا کر سب سنتی چلی گئی لیکن یہ طے تھا کہ منور بھیا کی بیماری کا سبب کم از کم وہ نہیں تھا
بڑی آپا بیان کر رہی تھیں۔ اس لئے دوپہر کے کھانے کے بعد جیسے ہی موقع ملا، میں نے
ہا سے اس بارے میں پوچھا۔

"آپ کے گھر سے تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک آئے تھے۔ ہاں بس یہ ہے کہ بہت
واس لگ رہے تھے اور ان کا رویہ بھی بہت عجیب و غریب ہو گیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے ناں کہ
ان کے جانے کے بعد میں نے ان کا کمرہ بچوں کے لئے سیٹ کر دیا تھا۔ وہ واپس آئے تو میں
نے ان سے کمرہ واپس لینے کو کہا لیکن انہوں نے برآمدے میں اپنا ڈیرہ جما لیا۔ جب سے
سردی بڑھی ہے سب ہی ان کو وہاں رہنے پر ٹوکتے ہیں لیکن وہ عجیب ضدی سے ہو گئے ہیں۔
کبھی ٹھنڈے پانی سے نہا لئے، تو کبھی چھت پر ٹھنڈی ہوا میں ٹہلنے لگے۔ کھانا پینا پہلے بھی کم
تھا، اب تو برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ پندرہ دن سے کھانسی اور بخار ہو رہا تھا، لیکن ڈاکٹر کو

دکھانے کے لئے راضی نہیں تھے۔ دو دن پہلے شہریار نے زبردستی ڈاکٹر کو گھر بلا کر چیک کروایا تو پتا چلا کہ نمونیہ ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر نے دوا دی ہے اور ساتھ ہی احتیاط کو بھی کہا لیکن منے ماموں نہ تو دوا کھانے کے لئے راضی ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی احتیاط کرتے آپ نے دیکھا تو ہے کہ برآمدے میں کتنی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے، اور پھر بھی وہ وہیں سوئے ہوئے ہیں۔"

ثریا مجھے تفصیلات بتا رہی تھی، اور میرا دل دُکھ سے بھرا جا رہا تھا۔ میں سمجھ سکتا تھا یہ منور بھیا کا احتجاج ہے۔ انہوں نے ساری زندگی دوسروں کو کچھ نہ کہا تھا، اس لئے چپ تھے۔ ان کا زور صرف ان کی اپنی ذات پر چل سکتا تھا، سو وہ اپنے ساتھ ہی جنگ لڑ رہے تھے۔

بڑی آپا کے گھر سے واپس آتے ہوئے میرا دل بے حد بوجھل تھا۔ اپنی اور منور بھیا کی بربادی پر، اس سے تو اچھا تھا میں نے ان کے اندر ان کے ہونے کا احساس پیدا نہ کیا ہوتا۔ کم از کم وہ اس حال کو تو نہ پہنچتے، یا پھر میں نے غلط رویوں کے خلاف آواز اُٹھایا تھا اس مصلحتوں کی خاطر پیچھے نہ لے جاتی۔ میں ایک شخص کو دریا کے پار لے جانے لئے نکلی تھی اور بیچ منجدھار میں پہنچ کر اسے ڈوبنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا تھا۔

میرا ضمیر مجھے مسلسل کچوکے لگاتا رہا اور رات سونے سے قبل میں اپنے دل میں طے کر کے سوئی تھی کہ چاہے مجھے صفدر سے کتنی ہی بحث کرنی پڑے اور بڑی آپا کی بیٹی کیوں نہ سننی پڑیں، میں منور بھیا کو واپس اس گھر میں لا کر رہوں گی۔

☆☆☆

"صبوحی اُٹھو.....!" رات کا جانے کون سا پہر تھا جب صفدر نے میرا شانہ ہلا کر مجھے جگایا۔

"کیا ہوا.....؟" صفدر کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

"اُٹھ کا چادر وغیرہ اوڑھو، ہمیں بڑی آپا کے گھر جانا ہے۔"

"اس وقت.....؟ مگر کیوں.....؟" انہونی کا احساس میرے دل کو بھینچ رہا تھا۔

"منے بھیا.....! ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔"

صفدر کا ضبط ٹوٹ گیا اور وہ سسکنے لگے، لیکن میرے احساسات پر برف پڑ چکی تھی۔ میں نے صفدر کو دلاسا دینے کی کوئی کوشش نہیں کی اور خاموشی سے ان کے ساتھ گاڑی میں جا بیٹھی۔ مجھے منور بھیا کی موت پر رونا نہیں آ رہا تھا کیونکہ مجھے ان کی زندگی پر بہت بار رونا آیا تھا۔ آج ان کی لاش پر آنسو بہا کر میں انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی۔ کیونکہ آج وہ ہر احساس سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ صفدر کی بہنیں بھی اگلے چند گھنٹوں میں پہنچ گئی تھیں۔ وہ سب بھائی بہن مل کر منور بھیا پر آنسو بہا رہے تھے اور میرا دل چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر کہوں کہ آپ سب چپ ہو جائیں۔ کسی مردہ شخص کو آپ کی محبت کے اظہار کی قطعی ضرورت نہیں۔ وہ شخص جو ساری زندگی آپ لوگوں کی توجہ، محبت اور احساس کو ترستا رہا، اب اس کے لئے ان آنسوؤں کی کوئی حیثیت نہیں۔

آج جبکہ منور بھیا اس دُنیا میں نہیں رہے، ان کے بھائی بہنوں کو ان کا خیال بار بار آتا ہے۔ ان کی بے رنگ زندگی، تابعدار فطرت، خاموش مزاجی، اپنا لاپرواہ سلوک دسیوں وجوہات ہیں، جن کی بنا پر وہ منور بھیا کو یاد کرتے ہیں۔ ان کی یاد میں پچھتاوے کا رنگ ہے کیونکہ وہ اپنے سامنے موجود ایک انسان کو انسان کا درجہ نہیں دے سکے تھے۔ آپ لوگ بھی اپنے اطراف میں نظر دوڑایئے۔ کہیں آپ کے اردگرد چلتے پھرتے لوگوں میں کوئی کردار منور بھیا جیسا تو نہیں؟ کہیں آپ بھی انجانے میں ان سادہ لوح لوگوں سے زیادتی تو نہیں کر رہے؟ کہیں آپ نے بھی اپنے مفاد کی خاطر بڑی آپا جیسے کرداروں کے ساتھ مصالحت تو نہیں کر رکھی؟ اگر یہ وقت نکل گیا تو پچھتاوے کے سوا آپ کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ بلکہ شاید جب آپ اللہ ربّ العزت کے سامنے کل حاضر ہوں تو اس بظاہر محسوس نہ ہونے والے گناہ کے بوجھ نے آپ کی کمروں کو توڑ رکھا ہو۔

☆☆☆

محبت یا سراب

"مجھے محبت ہوگئی ہے۔"

سندس کی زبان سے نکلا یہ فقرہ میرے لئے اتنا حیرت انگیز تھا کہ چیونگم سے … بنانے کی کوشش سے سکیڑے میرے ہونٹ سکڑے ہی رہ گئے اور ہاتھ میں پکڑی آئس کر… پگھل پگھل کر بہنے لگی۔ چیونگم اور آئس کریم ایک ساتھ کھانے کا یہ عمل سندس برسوں کی د… میں ہزار ہا پریکٹس کے بعد بھی نہیں سیکھ پائی تھی اور ہر بار ناکام ہوکر پوچھتی تھی۔

"مہیرہ......! تم ایسا کیسے کرلیتی ہو......؟" اور میں ہر بار اس کی حیرت پر ہنس… تھی لیکن آج اس کے ایک چھوٹے سے فقرے نے مجھے حیرت کا وہ زوردار جھٹکا لگایا… میں اپنی جگہ ساکت ہوگئی تھی۔

"اُف وہ......! اب میں نے ایسا بھی کچھ نہیں کہہ دیا کہ تم حیرت سے بت ہی… جاؤ۔" اس نے میرے ہاتھ سے آئس کریم لے کر قریبی ڈسٹ بن میں ڈالی اور اپنے ہاتھ… تھاما ٹشو پیپر مجھے تھمایا۔

"کیا ہوا بھئی......؟ دونوں سہیلیوں کو ایسی کیا خاص بات یاد آگئی کہ سب کچھ… چھاڑ یوں بیچ راستے میں جمی کھڑی ہو۔" سندس کی ممی جو میری مما کے ساتھ ہم دونوں کے پیچھے ہی آرہی تھیں ہم دونوں کو یوں کھڑے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"کچھ نہیں ممی......! بس ہم تھوڑا تھک گئے ہیں۔ سوچ رہے ہیں یہاں کسی…

بیٹھ جائیں۔" سندس نے گھبرا کر بہانہ بنایا اور میرا ہاتھ تھام کر قریبی بنچ تک لے گئی۔ ہفتے میں ایک آدھ دن ہم لوگ اپنے گھر کے قریب واقع اس پارک میں ضرور آتے تھے۔ میری مما اور سندس کی ممی میں بھی اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ اس لئے کبھی کبھار وہ بھی ہمارے ساتھ ہی ہوتی تھیں۔

"تم کیا کہہ رہی تھیں سندس......!" ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے میں نے سندس سے پوچھا۔

"یہی کہ مجھے محبت ہوگئی ہے۔" سندس نے اپنی بات اطمینان سے دہرائی۔

"مگر کس سے......؟" سندس سے پوچھتے میں خود اپنی یادداشت پر بھی زور دے رہی تھی کہ سندس کے کزنز کی لسٹ میں کوئی ایسا چہرہ سامنے آجائے جس کے لئے سندس کا اتنا بڑا دعویٰ فٹ بیٹھ سکے۔

"زمان شاہ سے۔" سندس کے جواب نے مجھے باور کروایا کہ وہ اس کا کوئی کزن نہیں کیونکہ پڑوسی اور کلاس فیلو ہونے کے ناطے ہمارے اتنے قریبی مراسم تو تھے ہی کہ وہ میرے اور میں اس کے خاندان کے تقریباً تمام افراد سے اچھی طرح واقف تھی۔

"کون ہے یہ زمان شاہ......؟ پہیلیاں بجھوانے کے بجائے مجھے ساری بات مکمل کر بتاؤ۔" مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ تشویش نے بھی گھیر رکھا تھا کہ پتہ نہیں کون شخص ہے اور جانے کیسے سندس سے ٹکرایا۔ ورنہ میں اور وہ تو تقریباً ہر جگہ ہی ساتھ ہوتے تھے۔

"سمیع بھائی کا دوست ہے۔ بہت امیر اور خوبصورت۔ سچ مہیرہ......! میں نے اسے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔" سندس نے آنکھیں میچ کر بتایا تو مجھے بھی تجسس ہونے لگا۔

"لیکن تم اس سے کہاں اور کیسے ملیں......؟"

"تم سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ ہماری پہلی ملاقات اتنی فلمی سی ہے کہ اسے یاد کر کے ہم دونوں اب بھی ہنس پڑتے ہیں۔" سندس کی بات نے مجھے احساس دلایا کہ وہ زمان شاہ سے مسلسل رابطے میں ہے۔

"ابھی بس مہینہ بھر پہلے کی بات ہے۔ اتوار کا دن تھا کہ بیل بجی۔ انیلا نے دیکھا تو

پتہ چلا سمیع بھائی کے دوست زمان شاہ ہیں۔ بھائی اس وقت نہا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے دوست کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا جائے۔ انیلا ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولنے اندر گئی۔ وہ صاحب انتظار میں سیڑھیوں کے پاس کھڑے تھے۔ اسی وقت میں کسی کام سے نیچے کی طرف آنے لگی، جلدی میں تھی۔ پاؤں پھسلا اور میں سیدھی ان کی بانہوں میں۔ بس سمجھو بڑے الوہی لمحے تھے ہم دونوں ہی کے دل کو کچھ ہوا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ مجھے چھوڑ کر اندر چلے گئے لیکن سمجھو میرا دل بھی ساتھ ہی لے گئے۔ میں دو دن بڑی بیقرار رہی۔ رات رات بھر نیند ہی نہیں آتی تھی۔ بس ہر پل زمان شاہ کا چہرہ نظروں کے سامنے رہتا تھا مگر دو دن بعد ان کا فون آیا تو جانا کہ وہ بھی میری طرح بے کل ہیں۔ بس جب سے ہم دونوں روزانہ رات کو جب سب سو جاتے ہیں تو فون پر بات کرتے ہیں۔"

سندس کی باتیں میری حیرت میں اضافہ کر رہی تھیں۔ مہینہ بھر سے وہ کسی کے عشق میں مبتلا تھی۔ اس سے چھپ چھپ کر باتیں کرتی تھی اور مجھے اس نے ہوا ہی نہیں لگنے دی تھی۔ کبھی میں نے اس کے بے وجہ مسکرانے یا کلاس میں بیٹھ کر جمائیاں لینے کا سبب پوچھا تو وہ مجھے ٹال گئی اور اب خود آرام سے بیٹھی اعتراف کر رہی تھی کہ وہ گوڈے گوڈے کسی کے عشق میں ڈوب چکی ہے۔

"جب پورے ایک مہینے سے تم نے یہ بات مجھ سے چھپا رکھی ہے تو اب بتانے کی کیا ضرورت تھی......؟" یکدم ہی میں اس سے خفا ہو گئی۔

"پلیز مہیرہ......! سوری یار......! بس میں ڈر گئی تھی کہ تمہیں بتاؤں تو کہیں تم مجھے نصیحتیں نہ کرنا شروع کر دو۔ کیونکہ میں زمان کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" اس نے فوراً ہی مجھے منانا شروع کر دیا۔

"لیکن سندس......! اس بات میں خطرہ تو ہے ناں، پتہ نہیں وہ کیسا لڑکا ہو۔ ابھی ہم لوگ اتنے سمجھدار تو نہیں ہوئے ناں کہ لوگوں کو پہچان سکیں۔" میں نے تشویش کا اظہار کیا۔

"وہ بہت اچھا ہے مہیرہ......! اور سب سے بڑھ کر سمیع بھائی کا دوست ہے۔ سمیع بھائی خود اتنے اچھے ہیں۔ بھلا ان کی کسی خراب لڑکے سے دوستی کیسے ہو سکتی ہے۔"

سندس کی یہ دلیل واقعی جاندار تھی۔ سمیع بھائی واقعی بہت سوبر اور شائستہ مزاج تھے ن کے دوستوں سے بھی ایسی ہی اُمید رکھی جا سکتی تھی۔ مجھے کچھ کچھ اطمینان محسوس ہونے

سندس مجھے آہستہ آہستہ اپنے اور زمان شاہ کے درمیان ہونے والی ٹیلیفونک گفتگو کی لات سنانے لگی۔ جو میں پوری دلچسپی اور حیرت سے سن رہی تھی۔ محبت کی یہ بیقراریاں نے اب تک فلموں اور کہانیوں میں ہی دیکھی تھیں۔ اپنی سب سے قریبی دوست سے ت میں یہ سب کچھ سننا بہت دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔

"سندس......! مہیرہ......! چلو گھر چلیں۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔" مما کے آواز لگانے ں اپنی گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ مما کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوتے مجھے لگا کہ ے دل میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔

کیا......؟ میں سمجھ نہیں سکی۔ کیونکہ میری ساڑھے سترہ سالہ زندگی میں اس کیفیت کو یا کرنے کا پہلا موقع تھا۔

☆☆☆

"کیا ہوا......؟ بہت چپ چپ سی ہو۔ زمان سے کوئی جھگڑا ہو گیا ہے کیا......؟" یڈ میں جیسے ہی موقع ملا میں نے سندس سے پوچھا۔ صبح سے میں سندس کی سوجی ہوئی یں اور اُترا اُترا سا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ لیکن وین میں اور کلاس میں دوسری لڑکیوں کی گی کے سبب کچھ بھی پوچھنے سے گریز کیا اور سندس تو جیسے میرے پوچھنے کی ہی منتظر تھی۔ پھوٹ کر رونے لگی۔

"یا اللہ خیر......! نہ جانے کیا ہو گیا......؟" میں نے بڑی مشکلوں سے اسے چپ

"زمان مجھ سے ناراض ہیں۔" ہچکیاں تھوڑی قابو میں آئیں تو سندس نے انکشاف یرا لرزتا دل بھی تھوڑا سنبھلا۔ تجربہ نہیں تھا لیکن اس بات سے تو میں بھی واقف تھی کہ یں روٹھنے اور منانے کے مراحل آتے ہی رہتے ہیں۔

"وہ ناراض ہیں تو تم منالو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"وہ مجھ سے بات ہی نہیں کر رہے تو مناؤں کیسے.....؟ پرسوں ناراض ہو کر فون بند کیا تھا اور کل ان کا فون آیا ہی نہیں۔ میں ساری رات ٹرائی کرتی رہی لیکن انہوں نے فون نہیں اُٹھایا۔" اس کی سسکیاں اب بھی جاری تھیں۔

"مگر وہ تم سے ناراض کیوں ہیں.....؟" آخر مجھے یہ اہم سوال کرنے کا خیال آ ہی گیا۔

"وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ پرسوں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کالج کی چھٹی ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے آؤں گا۔ تم کلاسز بنک کر کے گیٹ پر آجانا لیکن میری ہمت ہی نہیں ہوئی۔ بس وہ ناراض ہو گئے کہ تمہیں مجھ پر اعتماد ہی نہیں۔" سندس نے جو تفصیلات بتائیں وہ خاصی تشویش ناک تھیں۔ یوں کالج سے نکل کر زمان شاہ کے ساتھ جانے میں کئی خطرات تھے۔ اول کالج میں بدنامی ہوتی، دوم اگر باہر کوئی ان دونوں کو ساتھ دیکھ لیتا تو پھر اس کی خیر نہیں تھی۔ ایسے میں رونے کے لئے اسے اپنا کندھا پیش کرنے کے سوا بھلا کیا مدد کر سکتی تھی۔

دو دن سندس کی آہ و فغاں سنتے بڑی مشکل سے کٹے۔ سندس اپنی ابتر ہوتی حالت کو طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر گھر والوں کو ٹالتی رہی۔ تیسرے دن سچ مچ اسے شدید بخار ہو گیا تھا۔

میں اس کی واحد رازداں اور ہمدرد ہونے کے ناطے عجیب مشکل کا شکار تھی۔ کبھی اسے تسلیاں دیتی کہ زمان شاہ کی ناراضی جلد ختم ہو جائے گی، کبھی اس کے آنسو پونچھتی اور کچھ نہیں بن پڑتا تو خود بھی اس کے ساتھ مل کر آنسو بہانے لگتی۔ سندس میری اتنی قریبی دوست تھی کہ اس کی ہر تکلیف مجھے اپنے دل میں محسوس ہوتی۔ اسی دوستی کے ناطے میں نے بالآخر زمان شاہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور سندس سے اس کا فون نمبر لے کر اپنے گھر چلی آئی۔ سندس کی کال تو وہ سی ایل آئی پر نمبر دیکھ کر ریسیو ہی نہیں کرتا تھا۔

"وہ..... ہیلو جی..... السلام علیکم.....! مجھے زمان شاہ سے بات کرنی ہے۔" میں

کے سونے کے بعد میں لاؤنج سے فون اُٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی تھی اور اپنے سے سال چھوٹی ماہرہ کے جاگ جانے کے خطرے کے پیش نظر دھیمی آواز میں بات کر رہی تھی۔

"جی.....! میں زمان شاہ ہی بات کر رہا ہوں۔ آپ کون.....؟" دوسری طرف سے سنائی دینے والا ٹھہرا ٹھہرا گمبھیر لہجہ واقعی دل کو چھو لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ میں نے بے ساختہ سندس کی دیوانگی کو حق بجانب قرار دیا۔

"میں سندس کی بیسٹ فرینڈ مہیرہ بات کر رہی ہوں۔" گلا صاف کرتے میں نے اپنا تعارف کروایا۔

"جی مہیرہ صاحبہ.....! کیسی ہیں آپ کی وہ سنگ دل دوست.....؟ ہمیں محبت کی راہ پر لگا کر اب ساتھ نبھانے سے انکاری۔ کوئی ان کی یاد میں تڑپ تڑپ کر جان دے دے۔ وہ اپنے اُصولوں سے نہیں ہٹیں گی۔" اس کی آواز میں غصہ اور دُکھ دونوں ہی تھے۔ مجھ کو یکدم اس سے ہمدردی ہونے لگی۔

"جیسا آپ سوچ رہے ہیں ویسی بات نہیں زمان صاحب.....! لیکن لڑکیوں کے لئے مسئلہ ہوتا ہے اس طرح گھر والوں سے چھپ کر کہیں آنا جانا۔ سندس بھی بس اسی لئے آپ کی فرمائش پوری نہیں کر سکی مگر دیکھیں آپ بھی تو جواب میں میری دوست پر کتنا ظلم کر رہے ہیں۔ اپنی آواز تک کو ترسا دیا ہے آپ نے بیچاری کو۔ رو رو کر اس نے اپنا حشر خراب کر لیا ہے۔ کل سے بخار میں مبتلا ہے لیکن یقین جانیں اب بھی ٹیلی فون کے اردگرد ہی منڈلا رہی ہوگی۔" میں اپنی دوست کی بھرپور وکالت کر رہی تھی۔

"سوری مہیرہ.....! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سندس اتنا اثر لے گی۔ لیکن یقین کریں میں بھی بہت ہرٹ ہوا ہوں اس کے انکار سے۔"

"چلیں جو ہو گیا سو ہو گیا لیکن اب آپ اسے فون کریں۔ آپس میں بات کریں گے تو ہی سارے گلے شکوے دور ہوں گے۔" میں بڑی مدبر بنی اسے سمجھا رہی تھی۔

"جی ضرور.....! اب تو رہا بھی نہیں جائے گا مجھ سے۔ لیکن ایک وعدہ کرنا ہوگا

آپ کو۔" اس کی خوبصورت آواز میرے کانوں میں گونجی۔

"وہ کیا.....؟"

"جیسے آپ اپنی دوست کی وکالت کر رہی ہیں، ایسے ہی اس کے سامنے میرے لئے بھی سفارش کرنی ہوگی۔ سندس سے ایک چھوٹی سی ملاقات کروا دیں، ساری عمر آپ کو دُعائیں دوں گا۔" اس کی فرمائش پر میں تذبذب کا شکار ہوگئی۔

"پلیز مہیرہ.....!" بالآخر اس کا التجی لہجہ اس کی بیقراری نے مجھے اس سے وعدہ کرنے پر مجبور کر ہی دیا۔

ریسیور کریڈل پر رکھ کر میں ٹیلی فون سیٹ خاموشی سے لاؤنج میں رکھ آئی۔ لیکن بستر پر کافی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد بھی نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ بار بار زمان شاہ کی خوبصورت آواز، ٹھہرا ہوا لہجہ کانوں میں گونجنے لگتا اور میں سوچتی کہ وہ اس وقت سندس سے کیا باتیں کر رہا ہوگا۔ رات کے اس پہر جب سب لوگ سکون سے سو رہے ہیں، دو پیار کرنے والے آپس میں کیا راز و نیاز کر رہے ہوں گے۔ میں اپنے بستر پر لیٹے لیٹے زمان شاہ کی سرگوشیوں اور سندس کے دہکتے گالوں کی سرخی کو محسوس کر سکتی تھی۔ مجھ پر اس روز پارک میں طاری ہونے والی کیفیت ایک بار پھر چھانے لگی۔ اس روز میں اپنی کیفیت کو سمجھ نہیں پائی تھی لیکن اب جیسے یہ کوئی ادراک کا لمحہ تھا۔ ایک خواہش نے میرے دل میں چٹکی لی تھی۔

"کوئی ہو جو سندس کی طرح مجھے بھی چاہے۔" چاہے جانے کا احساس کتنا خوبصورت ہوتا ہے۔ میں سندس کی آنکھوں میں اترتے خمار سے بخوبی جان سکتی تھی۔

"کیا کوئی کہیں ہوگا جو زمان شاہ کی طرح میرے لئے اپنی راتوں کی نیندیں قربان کر سکتا ہو۔" میں کچھ بے چین سی ہو کر اُٹھ کر آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور ٹیوب لائٹ آن کر دی۔ سندس جیسا ہوشربا حسن نہ سہی لیکن میں کوئی ایسی گئی گزری بھی نہ تھی۔ گندمی رنگت، سیاہ آنکھیں، بھرے بھرے ہونٹ، مناسب ناک، میں خود کو پاسنگ مارکس دے ہی رہی تھی کہ ماہرہ کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

"آپی.....! لائٹ تو بند کر دیں۔ روشنی آنکھوں میں چبھ رہی ہے۔" میں ہڑبڑا کر

سامنے سے ہٹی اور لائٹ آف کر کے بستر پر واپس آ گئی۔ محبت سندس کو ہوئی تھی اور پھری اُڑی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

"ہوگئی زمان شاہ سے ناراضی ختم.....؟" صبح کالج وین کے انتظار میں میں گیٹ پر تھی کہ سندس بھی چلی آئی۔ اس کے چہرے پر چھائی خوشی اتنی واضح تھی کہ میں نے بے اسے چھیڑا۔

"ہوں.....! اور اس کا سارا کریڈٹ تمہیں جاتا ہے۔ زمان بہت تعریف کر رہے ری۔ انہوں نے تمہارے لئے اسپیشل تھینکس کہلوایا ہے۔" وہ میرے گلے لگ گئی۔

"کیا بات ہے.....؟ صبح صبح بڑا پیار آ رہا ہے دوست پر۔" مما جو مجھے اللہ حافظ پھر نکلی تھیں، پوچھنے لگیں۔

"ارے آنٹی.....! یہ تو ہے ہی اتنی پیاری کہ اسے ہر وقت پیار کیا جائے۔" سندس ہی وقت ہماری وین آ گئی اور ہم دونوں مما کو اللہ حافظ کہتے وین میں سوار ہو گئے۔ وین دوسری لڑکیاں بھی ہوتی تھیں، اس لئے ہم زمان شاہ والے موضوع کو ڈسکس کرنے راز کرتے تھے۔

"مہیرہ.....! آج زمان مجھے لینے آئیں گے۔ پلیز تم میرے ساتھ گیٹ تک چلی تیسرے پیریڈ میں لیب کی طرف جاتے سندس نے مجھ سے کہا۔

"جب تمہیں اس کی بات ماننی ہی تھی تو اتنی ضد بحث کیوں کی تھی.....؟"

"بس یار.....! پہلے اندازہ نہیں تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ زمان شاہ کی ناراضی رے بس کی بات نہیں اور وہ خود کیا کریں۔ وہ بھی تو دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ ان کا تا ہے مجھے دیکھنے، میرے سامنے بیٹھ کر باتیں کرنے کو۔" یہ یقین یقیناً اسے زمان شاہ یا تھا۔

لیب میں جتنی دیر پریکٹیکل ہوتا رہا سندس بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں ٹائم ری۔

"جلدی کروناں مہیرہ.....! کہیں دیر نہ ہو جائے۔ اگر تمہارا یہی حال رہا تو کر
ہم بی ایس سی پہلے سال میں ہی شاندار طریقے سے فیل ہو کر اپنے گھر والوں کی جوتے
کھائیں گے۔ تمہارے زخموں پر تو چلو تمہارا زمان شاہ اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے مرہم رکھ د
گا مگر مجھ غریب کا کیا ہوگا۔" میں کچھ چڑی اور کچھ اسے چھیڑا لیکن وہ برا مانے بغیر کھلکھلا
ہنسنے لگی۔

"چلو مرو.....!" اس نے تو کسی چیز کو ہاتھ ہی نہ لگایا تھا۔ اس لئے اطمینان
کھڑی تھی۔ میں جا کر صابن سے ہاتھ دھو کر آئی اور اسے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ پریکٹیکل
اوقات میں یہ آسانی تھی کہ جو اسٹوڈنٹ جب اپنے کام سے فارغ ہو جائے، اپنی مرضی
لیب چھوڑ کر جا سکتا تھا۔

"وہ رہے زمان.....!" گیٹ پر پہنچتے ہی سندس سیاہ کرولا سے ٹیک لگائے کھڑ
شخص کو دیکھ کر خوشی سے چیخی۔

میں نے نظر اُٹھا کر جائزہ لیا۔ وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا اس کی آواز سن کر میں
تصور قائم کیا تھا۔ لمبا قد، گوری رنگت، ورزشی جسم، سلیقے سے جمے بال، تیکھے نین نقش اور
مونچھیں کھڑے ہونے کے انداز میں ایک خاص قسم کا اعتماد جو اس کی کلاس کے شاید ہر فرد
قدرتی طور پر ہی بیدار ہو جاتا ہے۔ عمر بھی کوئی پچیس چھبیس کے درمیان ہوگی۔ اس اعتبار
وہ سندس سے کوئی سات آٹھ سال تو بڑا تھا ہی۔

"چلو، تمہیں زمان سے ملواؤں۔" سندس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا چاہا۔

"نہیں سندس.....! تم جاؤ میں پھر کبھی مل لوں گی۔" میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

پتہ نہیں ارد گرد موجود لڑکیاں یوں ایک اجنبی کے ساتھ جانے پر کیا کیا با
بناتیں۔ سندس فی الحال ایسے ہر خوف سے آزاد تھی۔ شاید محبت ایسے ہی انسان کو بہادر بنا
ہے۔ میں زمان شاہ کے قریب کھڑی نازک سی سندس کو دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ پہلے جب سند
نے بتایا تھا کہ زمان شاہ عمر میں سمیع بھائی سے بڑا ہے کیونکہ وہ ایم بی اے کرنے کے بعد
سال کا گیپ دے کر اکنامکس میں ایم اے کر رہا ہے تو میں اس کے اور سندس کے درم

فرقوں کے فرق پر کچھ اُلجھی تھی لیکن زمان شاہ سے بات کرنے اور اب دیکھنے کے بعد یہ
چھا لگا رہا تھا۔ نازک سی سندس اور مضبوط اور مجبور سے زمان شاہ کا کپل بڑا آئیڈیل، بڑا
وس ہو رہا تھا۔

زمان شاہ نے فرنٹ ڈور کھول کر پہلے سندس کو گاڑی میں بٹھایا اور پھر خود گھوم کر
ک سیٹ والی طرف پہنچا۔ ڈور کھول کر گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اس نے میری طرف
اپنا بایاں بازو ہلایا۔ میں جواباً تھوڑا سا مسکرا کر گیٹ کے اندر ہو گئی۔

"سندس کس کے ساتھ گئی ہے.....؟ وہ تو تمہارے ساتھ وین میں جاتی ہے
.....؟" ہماری کلاس فیلو نرگس متین نے آگے بڑھتی کرولا کی طرف دیکھتے معنی خیزی سے

"سندس کو آج گھر جلدی پہنچنا تھا، اس لئے اس کی امی نے اس کے کزن کو لینے
یا۔ میں کلاسز ختم ہونے کے بعد وین سے جاؤں گی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے نرمی
رس کو جواب دیا ورنہ وہ بات کا بتنگڑ بنا کر ہر طرف پھیلا دیتی۔

☆☆☆

"آپی.....! پلیز مجھے یہ پرابلم سولو کروا دیں ناں۔" ماہرہ کی التجا سے بے نیاز میں
لدی جلدی بالوں میں برش کیا اور دوپٹہ شانوں پر ڈال کر سندس کی طرف جانے کے لئے
لنے لگی۔ زمان شاہ اور اس کی ملاقات کی روداد سننے کو دل مچلا جا رہا تھا۔

"مہیرہ.....! کچھ خیال ہے چھوٹی بہن کا۔ وہ تم سے کچھ کہہ رہی ہے اور تم ہو کہ
ں میں روئی ٹھونسے اپنی کرنے میں لگی ہو۔" مما کی آواز نے میرے باہر کی طرف بڑھتے
ں کو روکا۔

"میرا کل ٹیسٹ ہے مما.....! مجھے سندس کے ساتھ مل کر تیاری کرنا ہے۔" میں کسی
ی رُکنے کو تیار نہیں تھی۔

"پانچ منٹ میں تمہارا کوئی عظیم نقصان نہیں ہو جائے گا۔ پوری دوپہر سو کر گزاری،
یسٹ کا خیال نہیں آیا۔ اب چھوٹی بہن کو پانچ منٹ بھی دیتے دم نکل رہا ہے۔" مما کے

غصے پر چاروناچار مجھے واپس پلٹنا ہی پڑا۔ ماہرہ کو پرابلم سولو کرواتے میرا خون بری طرح کھول رہا تھا۔

"میں دیکھ رہی ہوں تم دن بدن بہت لاپرواہ ہوتی جا رہی ہو۔ بس کل سے چا آندھی آئے یا طوفان، تمہیں رات کی روٹیاں پابندی سے بنانی ہوں گی۔" مما نے ایک ا نادر شاہی حکم سنایا۔

"کیا ہوا......؟ غصے میں لگ رہی ہو......؟" میں ماہرہ کو نمٹا کر سندس کے پاس گئی تو اس نے میرے چہرے کی سرخی سے میرے مزاج کا اندازہ لگایا۔ میں تو پہلے ہی جلی بیٹھی تھی۔ مما کے جابرانہ حکم کو بڑی دل سوزی سے سنایا۔

"اُف......! ایک تو ہماری کلاس میں لڑکیوں کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہے۔ اماؤں کا بس نہیں چلتا کسی ہوٹل کا شیف بننے جتنی ٹریننگ دے دیں۔ کل مما بھی مجھے زبردستی کچن میں لے گئی تھیں کہ سویوں کا میٹھا بنانا سیکھ لو گھی گرم کرتے ہوئے اُچھل کر ہاتھ پر آ گیا۔ آج زمان نے ہاتھ دیکھا تو صاف کہہ دیا کہ تمہیں ان بکھیڑوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ میرے گھر چار چار خانساماں ہیں۔ چھ چھ گھنٹے کی ڈیوٹی کرتے ہیں۔ آل ٹائم سروس کے لئے چاق و چوبند ہوتے ہیں۔ تمہیں صرف زبان سے حکم دینا ہوگا۔ دُنیا کی ہر ڈش ان ٹائم تیار ملے گی۔ پھر تمہیں کیا ضرورت ہے کہ تم اپنی خوبصورت اسکن کو برباد کرو۔"

وہاں اپنے چاہے جانے کا (وہ بھی کروڑوں کے مالک شخص کی طرف سے) بھرپور فخر بول رہا تھا۔ میں جو بڑے اشتیاق سے اس کی زمان شاہ سے ملاقات کا حال جاننے آئی تھی، چپ کی چپ رہ گئی۔

"بہت شاندار بھئی......! بہت اچھا کھانا بنایا ہے میری بھتیجی نے۔ ماشاء اللہ سمجھدار ہوتی جا رہی ہے۔" میں بڑے فخر سے گردن اُٹھائے پھپھو کے تعریفی کلمات سن رہی تھی۔ یہ کھانا جس کی تعریف میں پھپھو رطب اللسان تھیں۔ میں نے مما کی بے اعتنائی پر کل سے بڑی مجبوری کے عالم میں بنایا تھا۔ پھپھو سے مما کی بہت انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ پھپھو آئیں تو مما نے روٹی کے ساتھ ساتھ سالن پکانے کی ذمہ داری بھی میرے سر تھوپی اور خود ان کے ساتھ سر

باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ میں نے بھی فٹ چکن جلفریزی کا تیار شدہ مسالا منگوا کر لکھی ترکیب کے مطابق سالن تیار کیا۔ فریج سے کباب نکال کر تلے۔ سلاد بنانے اور چھنے کے لئے ماہرہ کو پکڑا یوں ٹھیک ٹھاک اہتمام کے ساتھ کھانا تیار ہو گیا۔ پھپھو کے کلمات جہاں میرا خون بڑھا رہے تھے، وہیں مما بھی بڑی مسرور تھیں۔

"تم نے تو بہت تھوڑا سا سالن لیا ہے اسید اور لو ناں......!" میں نے خود سے تین ے پھپھو کے سپوت کی طرف ڈونگا بڑھاتے خوش اخلاقی سے کہا۔ پھپھو کی تعریفوں کی ے لہجہ خود بخود ہی اچھا ہو گیا تھا۔

"سوری......! میں بازار کے مسالوں سے بنی چیزیں کھانے میں احتیاط کرتا" اس نے جیسے میرے منہ پر طمانچہ مارا۔ میرا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔

"بڑا آیا ڈاکٹر کہیں کا۔ ابھی تھرڈ ائیر میں ہے تو اتنے نخرے ہیں۔ کہیں کوئی ماہر بن گیا تو کیا ہوگا۔" میں منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔ یہ بھی شکر تھا کہ اسید کا جواب ے میرے کسی اور نے نہیں سنا تھا۔ ورنہ مزید سبکی ہوتی۔

"ماموں......! ایک بات ہے آپ کے علاقے کی۔ یہ رس ملائی بڑے مزے کی ہے، بندہ کھائے تو دل ہی نہیں بھرتا۔" میٹھے میں پپا باہر سے رس ملائی لے آئے تھے۔ کے بعد دوسری رس ملائی پیالی میں ڈالتے اس نے تعریف کی تو میرا خون جلنے لگا۔

"یہ رس ملائی تو تمہارے چچا جان نے اپنے ہاتھوں سے بنا کر رکھی ہوگی اسے ے ہوئے تمہیں بازار کی چیزوں سے احتیاط کا خیال نہیں آ رہا۔" اس کے بالکل برابر والی پہ بیٹھے ہونے کا فائدہ تھا کہ اگر کسی نے اس کا تنقیدی تبصرہ نہیں سنا تھا تو میں بھی اپنی دل تیں بنا رکاوٹ اس تک پہنچا سکتی تھی۔

"اس کے اثرات تمہاری چکن جلفریزی سے کم ہی برے ہوں گے۔ ایک تو پیکٹ الا اوپر سے تمہارے ہاتھوں سے تیار ہوئی ڈش۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ کریلا اوپر سے نیم" اس نے بھی آواز دبا کر جوابی حملہ کیا۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کارروائی کرتی پھپھو از نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"یہ میری طرف سے تمہارے لئے انعام۔ آج پہلی بار تمہارے ہاتھ کا
کھایا۔ سچ بہت اچھا لگا۔" پھپھو نے اپنے پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر مجھے تھمایا۔
"اس ڈنر کے لئے پانچ سو روپے......؟ اس سے تو اچھا تھا آپ فوڈ میلہ جا
فورڈشنز والا بوفے ڈنر کر آتیں۔" اب کے اسید نے کھل کر میری مخالفت کی۔
"میری بھتیجی کے ہاتھ سے بنے ڈنر پر فوڈ میلہ کی فنٹی فور تو کیا فنٹی فور تھا
ڈشنز قربان۔" پھپھو نے پیار سے مجھے اپنے ساتھ لگایا تو میں اس کو ٹھینگا دکھاتے ہو
گی۔

☆☆☆

"یہ دیکھو، زمان نے مجھے یہ رنگ دی ہے۔" سندس نے اپنی مخروطی انگلیو
ہاتھ میرے سامنے پھیلایا۔ درمیانی انگلی میں پڑی نازک سی انگوٹھی میں جڑا واحد نگینہ جگ
کر رہا تھا۔
"ڈائمنڈ ہے۔ زمان نے کہا تمہاری انگلی کے لئے ڈائمنڈ سے کم کوئی اسٹون
جا سکتا۔ حالانکہ میں اتنا منع کرتی رہی لیکن وہ مانے ہی نہیں۔ کہنے لگے زمان شاہ کی م
نشانی کوئی کم قیمت چیز تو ہو ہی نہیں سکتی۔" سندس کے لہجے میں دُنیا جہان کی خوشی تھی۔
"اور تم اتنے آرام سے انگلی میں پہنے گھوم رہی ہو۔ اگر فرح آنٹی یا انکل
لی تو کیا ہوگا......؟" میں نے اسے ڈرانا چاہا۔ ویسے بھی اس کے آئے دن زمان شاہ کے
کالج سے جانے پر لڑکیوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں جو مجھے اچھی نہ لگتی تھیں۔
"یہ تو میں نے ان سب کی بولتی بند کروانے کے لئے پہنی ہے۔ گھر جا
پہلے اُتار کر بیگ میں رکھ دوں گی۔ ابھی دیکھنا جب ان لوگوں کو پتہ چلے گا کہ زمان شا
ڈشنگ شخص میرا فیانسی ہے تو کتنا جلیں گی۔" اور واقعی اس نے تقریباً ہر کلاس فیلو کو
خوبصورت انگوٹھی دکھانے کے ساتھ اپنے اور زمان شاہ کے رشتے کی خبر بھی سنا ڈالی۔
خبر پر کسی نے یقین کیا ہو یا نہ کیا ہو، رنگ دیکھ کر سب ہی متاثر ہوئیں۔
"تم زمان شاہ سے کہتیں ناں کہ وہ تمہارے گھر میں رشتے کی بات کر

ب تک تم لوگ یوں چھپ چھپ کر فون پر باتیں کرو گے اور اِدھر اُدھر ملتے رہو گے......؟"
سندس اور زمان شاہ کی محبت پر رشک تو بہت آتا لیکن میری شدید خواہش تھی کہ اس سے
کسی کو اس سارے معاملے کی خبر ہو، وہ دونوں کسی باضابطہ رشتے میں بندھ جائیں۔
"زمان تو خود بھی ایسا چاہتے ہیں لیکن انہیں کئی مسئلے ہیں۔ پہلے وہ اپنا ایم اے مکمل
نا چاہتے ہیں۔ پھر بزنس کے معاملات بھی ابھی پوری طرح ان کے ہاتھ میں نہیں۔ ان
پیرنٹس اگر مڈل کلاس کی لڑکی سے شادی کی خواہش پر بدک گئے تو ساری پراپرٹی ان کے
سے نکل جائے گی۔ ادھر وہ سمیع بھائی کا سامنا کرنے سے بھی گھبراتے ہیں کہ کہیں سمیع
ئی یہ نہ سوچیں کہ زمان نے دوست ہوتے ہوئے دوست کی بہن پر نظر رکھی۔ اس لئے فی
ال جو جیسے چل رہا ہے ٹھیک ہے۔ اچھا ہے، اس دوران میری ایجوکیشن بھی کمپلیٹ ہو جائے
ی۔" سندس کے لہجے کا یہ اعتماد زمان شاہ کی محبت کا اعجاز تھا۔ میں ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔
"کیا دیکھ رہی ہو......؟" اس نے پوچھا۔
"تم خوبصورت تو تھیں، مگر اب خوبصورت ترین ہوتی جا رہی ہو۔"
"سارا محبت کا کمال ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔
"اگر محبت ایسی ہی خوبصورتی دیتی ہے تو مجھے بھی اس کے بارے میں سوچنا پڑے
ا۔ آسان ترین بیوٹی ٹپ، جس میں ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔"
"تو کر دیکھو ناں......!" اس نے ادا سے مشورہ دیا۔
"یہی تو مسئلہ ہے کہ کیسے کروں اور کس سے کروں......؟ کوئی ڈھنگ کا بندہ نظر ہی
یں آتا۔" میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔
"کیوں......؟ وہ تمہارا کزن ہے ناں اسید۔ اچھا خاصا گڈلکنگ اور جینئس لڑکا
۔ فیوچر بھی کافی برائٹ ہے۔"
"وہ......؟ اس سے محبت کر کے میں خوبصورت ہونے کے بجائے جل جل کر توے
کی طرح سیاہ ہو جاؤں گی۔" مجھے سندس کا مشورہ ایک آنکھ نہ بھایا۔
"ویسے بھی بندہ تھوڑا میچور ہونا چاہئے۔ اب زمان شاہ کو دیکھو، کتنے ڈیسنٹ لگتے

ہیں۔ کیئرنگ بھی ہیں، اس پر جب تم انہیں آپ جناب سے مخاطب کرتی ہو تو کتنا پیارا لگتا ہے۔ اسید سے تو میں تو تڑاخ سے کم پر بھی بات کروں تو زیادہ سے زیادہ تم کہہ کر مخاطب ہو سکتی ہوں۔"

"تو ایسا کرو، سیج بھائی پر ٹرائی مارو۔ وہ اسید کے مقابلے میں بڑے بھی ہیں اور سوبر بھی۔ تم انہیں عزت سے بھی پکارتی ہو، اس لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" اسید کے لئے میری رائے جان کر اس نے نیا مشورہ دیا۔

"رہنے دو یار.....! بچپن سے تمہارے ساتھ رہ کر انہیں اتنی بار بھائی کہا ہے کہ اب اس لفظ کو ان کے نام سے جدا نہیں کر سکتی۔" میں نے اس کا دوسرا آئیڈیا بھی رد کر دیا۔

"تو پھر تم انتظار کرو۔ اس وقت کا جب تمہیں خود بخود ہی کسی سے محبت ہو جائے۔" سندس جھنجھلائی۔

"اور اگر اس سے پہلے مما نے میرا کوئی انتظام کر دیا تو میں تو محبت کی حسرت دل میں لئے ہی مر جاؤں گی۔" میں سخت تشویش میں مبتلا تھی۔ شادی سے پہلے چاہے جانے میں جو نشہ تھا، میں اس سے کسی صورت محروم نہ رہنا چاہتی تھی۔ مگر یہ محبت ایک مجھ پر ہی مہربان ہونے کو تیار نہیں تھی۔

☆☆☆

آج پھر سندس، زمان شاہ کے ساتھ ملاقات کے لئے گئی ہوئی تھی اور میں جلتی بھنتی کالج گراؤنڈ میں بیٹھی تھی۔ میڈم عطیہ کو کسی ایمرجنسی کی وجہ سے جلدی جانا پڑا تھا جس کی وجہ سے ہمارا لاسٹ پیریڈ فری تھا۔ سندس ہوتی تو بات چیت میں وقت اچھا گزر جاتا لیکن اب اکیلے بیٹھ کر بور ہونا مجبوری تھی۔ وین تو اپنے وقت پر ہی لینے آتی۔

"ہیلو مہرہ.....! کیا ہوا.....؟ یہاں بیٹھ کر برے برے منہ کیوں بنا رہی ہو.....؟" میری کلاس فیلو حمیرا وہاں سے گزرتے رُک کر مجھ سے پوچھنے لگی۔

"بس یار.....! وین کے انتظار میں خوار ہو رہی ہوں۔"

"میں نے اپنے ڈیڈی کو موبائل پر کال کر کے بلوایا ہے۔ کہو تو میں تمہیں ڈراپ کر

.....؟" وہ بڑے اخلاق سے بولی تو مجھے موقع اچھا لگا۔ یہاں بور ہونے سے آرام سے پہنچنے کا تصور بڑا خوش کن تھا۔ اپنے ساتھ وین میں جانے والی لڑکیوں میں سے ایک کو بتا میں حمیرا کے ساتھ گھر آ گئی۔

"آج تم کچھ جلدی نہیں آ گئیں.....؟" مما نے مجھے دیکھ کر پوچھا وہ اس وقت کچن لڑی ہرے دھنیے کی پتیاں توڑ رہی تھیں۔

"جی.....! ہمارا لاسٹ پیریڈ فری تھا۔ ایک کلاس فیلو نے اپنی گاڑی میں لفٹ کی ہوئی تو ہم اس کے ساتھ آ گئے۔" میں نے اپنے جلدی گھر پہنچنے کی وجہ بتائی۔

"یہ تو غلط بات ہے۔ اگر پیریڈ فری تھا تب بھی تمہیں اپنی وین کا انتظار کرنا چاہئے تمہارے اس طرح پہلے سے آ جانے پر وین والے کو کوئی اُلٹا سیدھا شک بھی ہو سکتا ہے۔ کیا معلوم تم کس کے ساتھ گئی ہو.....؟ وہ تو اپنی مرضی سے کوئی بھی رائے قائم کر لے گا۔" نے مجھے تنبیہ کی تو مجھے بے ساختہ سندس یاد آئی۔ اس کے زمان شاہ کے ساتھ جانے پر ب میں وین والے کو کوئی بہانہ گھڑ کر سناتی تھی تو وہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتا تھا لیکن اس کے وں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔

"اچھا اب جاؤ، کپڑے چینج کر کے آؤ۔ مجھے تم سے کام ہے۔" مما نے مجھے وش کھڑے دیکھ کر نرمی کے کہا۔ شاید وہ میری خاموشی کو اپنی ڈانٹ کا نتیجہ سمجھ رہی تھیں۔

"یہ کوفتے سندس کے گھر دے آؤ۔ فرح کو میرے ہاتھ کے کوفتے بہت پسند ۔" میں کپڑے تبدیل کر کے آئی تو دیکھا مما ڈش نکالے اس پر ہرا دھنیا چھڑک رہی ہیں۔

"چھوڑیں ناں مما.....! شام میں بھجوا دیجئے گا۔ ابھی تو مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے ہم لوگ کھانا کھا لیتے ہیں۔" میں نے انہیں ٹالنا چاہا کیونکہ مجھے بروقت یہ خیال لیا تھا کہ سندس جو زمان شاہ کے ساتھ گئی ہوئی ہے ابھی تک گھر نہیں پہنچی ہوگی۔ زمان شاہ ے وین کی ٹائمنگ کے حساب سے ڈراپ کرنا تھا۔ ایسے میں اگر میں سندس کے گھر پہنچ جاتی سئلہ ہو جاتا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو مہرہ.....! خود کھانے کے بعد کیا شام میں بچا کھچا باسی

سالن انہیں بھجواؤں گی میں۔ اگر تمہیں زیادہ بھوک لگ رہی ہے تو ٹھیک ہے۔ تم کھانا کھاؤ۔ میں خود ہی چلی جاتی ہوں سندس کے گھر۔" مما نے میری بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ لیکن میری جان تو ان کے سندس کے گھر جانے کے ذکر پر ہی آدھی ہو گئی تھی۔ اگر وہ وہاں جاتیں اور اس کے گھر والوں کو علم ہو جاتا کہ میں گھر پہنچ چکی ہوں تو وہ لازماً سندس کے نہ پہنچنے کا سبب جاننے کی کوشش کرتے اور ایسے میں سندس تو پھنستی ہی، خود میری بھی شامت آجاتی۔

"اچھا ناراض مت ہوں۔ لائیں دیں مجھے یہ ڈش۔ میں چلی جاتی ہوں سندس کے گھر۔" میں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے ڈش لے لی۔ اپنے گھر سے سندس کے گھر تک کا چند قدم کا فاصلہ میں نے بڑی سست روی سے طے کیا تھا۔ میرا ذہن جلد از جلد کوئی اچھا سا بہانہ تلاش کرنے میں مصروف تھا۔

"ارے مہیرہ آپی......! آپ کالج سے کب آئیں، سندس باجی تو ابھی گھر نہیں پہنچیں۔" گیٹ انیلا نے کھولا تھا اور مجھے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

"مجھے ڈینٹسٹ کے پاس جانا تھا۔ داڑھ میں درد تھا۔ اس لئے میں جلدی چھٹی لے کر آ گئی۔ سندس پیریڈز لینے کے لئے رُک گئی تھی۔ بس ابھی تھوڑی دیر میں پہنچتی ہی ہو گی۔" میں نے سالن اسے تھماتے اپنا سوچا ہوا بہانہ جلدی سے سنایا اور واپس پلٹ گئی۔ انیلا کو مزید کسی سوال جواب کے لئے موقع دینا مناسب نہیں تھا۔

"اس سندس کی بچی کے عشق نے تو میری جان عذاب میں کر دی ہے کالج میں لڑکیوں کی باتیں سنو، یہاں گھر والوں سے جھوٹ بولو۔ میں تو گھن چکر بن کر رہ گئی ہوں۔" میں دل ہی دل میں سندس کو کوس رہی تھی۔

"ویسے زمان شاہ اسے کہاں لے کر گیا ہو گا......؟ سندس بتا رہی تھی، آج وہ اسے کسی اچھی سی جگہ لنچ کروائے گا۔ کتنا رومانٹک لگ رہا ہو گا زمان شاہ کے ساتھ کسی زبردست سے ہوٹل کے خوبصورت ماحول میں شاندار سا لنچ کرنا۔"

مما کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے میرے خیال کی رو سندس اور زمان شاہ کے رومانٹک لنچ کی طرف مڑ گئی۔ مما کے ہاتھ کے بنے کوفتے یکدم ہی اپنا ذائقہ کھو بیٹھے۔ چاہے

کی دبی دبی سی خواہش اب کچھ زیادہ ہی زور آور ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

"پلیز مہیرہ......! مان جاؤ ناں۔ زمان نے اتنے خلوص سے تمہیں انوائٹ کیا ہے۔" سندس مسلسل دو دن سے اصرار کر رہی تھی۔ کل زمان شاہ کا برتھ ڈے تھا اور اس نے ...ن کے ساتھ ساتھ مجھے بھی انوائٹ کیا تھا لیکن میں جانے سے انکاری تھی۔ اب بھی سندس ...سلسلے میں مجھے منانے میرے گھر آئی ہوئی تھی۔

"نہ بابا......! مجھے تو تم معاف ہی رکھو۔ کہیں کسی نے دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ میری شامت آجائے گی۔ اس روز بھی جھوٹ بول کر معاملہ سنبھالا تھا۔ وہ تو شکر ہے، اسی دن مما ...یک رشتے دار کی میت میں فوری طور پر ٹنڈو آدم جانا پڑا۔ ورنہ جب شام میں فرح آنٹی ...ی طبیعت پوچھنے گھر آئی تھیں اگر مما گھر میں ہوتیں تو سوچو کیسی درگت بنتی میری اور ...ری۔ وہ تو شکر ہے کہ مما تین چار دن شہر سے باہر رہیں تو فرح آنٹی سے ملاقات نہیں ہوئی ...مارا معاملہ سیٹل ہو گیا۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ سندس اور زمان شاہ کی دوستی میں ...ے لئے کتنی ہی اٹریکشن ہو، میں بنیادی طور پر بڑی بزدل تھی اور ایسی کسی سچویشن کا دوبارہ ...نا کرنا بڑا مشکل لگ رہا تھا۔

"وہ تو تمہاری حماقت کی وجہ سے مسئلہ ہوا تھا لیکن جب ہم دونوں ساتھ ہوں گے تو ...کسی گڑبڑ کا کوئی ڈر نہیں ہو گا۔" سندس نے مجھے سمجھایا۔

"اور اگر کسی نے زمان شاہ کے ساتھ ہمیں دیکھ لیا تب......؟" میں نے خدشہ ظاہر ...

"ارے چھوڑو، کوئی نہیں دیکھتا۔ وہ جن جگہوں پر لے کر مجھے جاتے ہیں وہاں ...رے اور میرے گھر کے افراد کا آنا جانا مہینوں میں ہی کبھی کبھار ہوتا ہے۔ اب میں بھی تو ...نے دنوں سے جا رہی ہوں۔ کبھی کسی نے دیکھا......؟" سندس کے تجربات نے اسے کافی بے ...ب کر دیا تھا۔ ویسے اس کی دلیل بالکل ٹھیک تھی۔ ہم جیسے مڈل کلاس لوگ کہاں روز روز ...نے اونچے ہوٹلوں میں جاتے تھے۔

"لیکن یار.....! یہ بھی تو سوچو۔ تم دونوں کے درمیان میں تو بس کباب میں ہڈی ہی لگوں گی۔ خاک اچھا نہیں لگے گا تم دونوں کو میرا وجود۔" میں واقعی اس طرح وہاں جانے جھجک رہی تھی۔

"کوئی ہڈی وڈی نہیں لگو گی تم۔ ہم تمہیں اتنے پیار سے انوائٹ کر رہے ہیں اور تم ہو کہ فضول کے وہم پال رہی ہو۔ دوست دوست کی خاطر کیا نہیں کرتے اور تم ہو کہ میری ایک ذرا سی فرمائش پوری کرنے کو تیار نہیں۔ کتنی انسلٹ ہوگی میری زمان شاہ کے سامنے جب وہ دیکھیں گے کہ تم نے میری خاطر بھی ان کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ تم میری اتنی قریبی دوست ہو، تمہیں تو ساری زندگی ہم سے تعلق رکھنا ہے۔ اچھا ہے زمان اور تمہاری بھی دوستی ہو جائے تاکہ انہیں بھی تمہارا وجود نہ کھٹکے۔" سندس کے جذباتی وار۔ بالآخر مجھے ہار ماننا ہی پڑی۔

"گفٹ کیا دے رہی ہو تم زمان شاہ کو.....؟" اب جب جانے کا طے ہو گیا تھا تو آگے کے معاملات بھی سوچنے تھے۔

"ابھی تک تو کچھ لیا ہی نہیں۔ تمہارے ساتھ جا کر ہی خریدوں گی۔ ایسا کرو، آنٹی سے پارک جانے کا کہہ کر آجاؤ۔ میں بھی اپنی ممی سے کہہ کر آتی ہوں۔" سندس نے فوراً ہی پلان بنایا اور اپنی ممی کو بتانے اپنے گھر چلی گئی۔ میں نے بھی الماری کھول کر اپنی بچت میں سے پانچ سو روپے نکالے۔ خالی ہاتھ کسی کی برتھ ڈے میں جانا تو اچھا نہیں لگتا اور زمان شاہ جیسے لینڈ لارڈ کے لئے تھوڑا بہت ڈھنگ کا گفٹ لینے کے لئے اتنے پیسے تو کم از کم چاہئے ہی تھے۔ پاکٹ منی سے کی گئی بچت میں سے یہ فضول خرچی کرنا مجھے کافی کھل بھی رہا تھا لیکن سندس کی بیسٹ فرینڈ ہونے کا بھرم رکھنے کے لئے یہ قربانی تو دینا ہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں پارک سے آگے بنے بڑے سے گفٹ سینٹر میں پہنچے ہوئے تھے۔ سندس نے بڑی چھان بین کے بعد کافی مہنگے خوبصورت سے کف لنکس منتخب کئے۔ میرا ارادہ پرفیوم لینے کا تھا۔ مختلف خوشبوؤں کو چیک کرنے کے بعد میں اور سندس جس پرفیوم پر متفق ہوئے، اس کی قیمت سن کر میرا منہ لٹک گیا۔ پرفیوم پانچ سو اسی کا تھا جبکہ میرے پاس صرف پانچ سو روپے تھے۔

"کوئی مسئلہ ہے.....؟" سندس نے میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا۔

ے اور اس کے درمیان تکلفات کم ہی حائل ہوتے تھے، اس لئے میں نے کھل کر اپنی ی بتا دی۔

"کوئی بات نہیں، باقی پیسے میں دے دوں گی۔" سندس نے فراخ دلی سے کہا اور پ کیپر سے دونوں چیزیں پیک کروالیں۔ واپسی میں سندس نے ایک شاپ سے مجھے میری یدہ آئس کریم اور چیونگم بھی دلائی۔

"کیا بات ہے.....؟ آج بڑی حاتم طائی بنی ہوئی ہو۔ اتنے پیسے کہاں سے ے.....؟" میں نے کچھ مشکوک ہو کر پوچھا۔

"سال بھر کی سیونگ ہے۔ پھر سمیع بھائی زندہ باد۔ کچھ نہ کچھ دیتے ہی رہتے ہیں۔ بھی پانچ سو روپے دیئے تھے کہ اپنے لئے کوئی سوٹ لے آؤ۔ میں نے سوچا، ڈھائی سو لے میں سے لے لوں گی۔ بھائی کون سا قیمت پوچھیں گے۔" وہ فخر سے بتانے لگی۔

سمیع بھائی کی محبت پر اسے ہمیشہ سے ہی بہت فخر تھا۔ بڑی شادی شدہ نیلم باجی اور ی انیلا کو چھوڑ کر سمیع بھائی نے ہمیشہ اسے اولیت دی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ سندس کا اپنا بھی تھا۔ وہ دونوں بہنوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر ان کا خیال رکھتی تھی۔ سمیع بھائی کے ے استری کرنا، ان کے کمرے کی صفائی کرنا، وقت بے وقت چائے کی فرمائش پوری کرنا، ں ان کا ہر کام بنا منہ بنائے کرتی تھی۔ ایسے میں وہ اسے اہمیت دیتے تھے تو کچھ عجیب بھی تھا۔ حالانکہ وہ خود ابھی اسٹوڈنٹ تھے اور اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے دو تین یشنز پڑھاتے تھے لیکن سندس پر ایسی مہربانیاں اکثر کرتے رہتے تھے۔

"تم میرا گفٹ بھی اپنے ساتھ لے جانا۔ گھر میں تو وہ انیلا تھانیدارنی پوچھ گچھ کر دے گی کہ کیا لیا اور کس کے لئے لیا.....؟" گھر کے نزدیک پہنچنے پر سندس نے اپنے ا کا پیکٹ بھی مجھے تھمایا۔

"لیکن کسی نے مجھ سے پوچھا تو کیا کہوں گی.....؟" میں حسب عادت گھبرا گئی۔

"کہہ دینا کہ ایک کلاس فیلو کو اس کی برتھ ڈے پر دینے کے لئے لیا ہے۔" سندس ے کیب بتائی جو گھر میں قدم رکھتے ہی اماں کے کئے ہوئے سوال کا جواب دینے میں فوراً کام

بھی آگئی۔

''تم لوگ بھی فضول کے چونچلوں میں پڑی رہتی ہو۔'' ممانے سن کر تبصرہ کیا لیکن آگے سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی۔

اگلے روز آخر کے تین پیریڈ چھوڑ کر ہم دونوں کالج کے گیٹ پر آگئے۔ زمان شاہ حسب پروگرام گاڑی لئے موجود تھا۔

''تھینک یو مہیرہ.....! اگر آپ نہ آتیں تو مجھے افسوس ہوتا۔'' گاڑی میں میرے بیٹھتے ہی اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔

''آنا ہی پڑا۔ آپ نے اتنے خلوص سے جو بلایا تھا۔'' میں اخلاقاً مسکرائی۔ زمان شاہ ہمیں ایک کافی شاندار ریسٹورنٹ میں لے گیا تھا۔ وہاں کا پرفسوں ماحول اور پھر زمان شاہ کی دلچسپ باتیں۔ میرے دل میں اگر کوئی خوف تھا بھی تو اڑن چھو ہوگیا۔

''رئیلی یار سندس.....! یو آر ویری لکی۔'' جب زمان شاہ نے ہمیں گھر کے قریب ڈراپ کیا تو میں نے گاڑی سے اُترتے ہی سندس سے پہلا جملہ یہی کہا۔ سندس کے ہونٹوں پر جواباً مدھری مسکراہٹ چلی آئی۔ اتنی متاثر کن شخصیت کی طرف سے محبت کا احساس کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔

☆☆☆

''مہیرہ.....! تمہاری پھپھو کا فون ہے۔ بات کرلو۔'' میں رات کے کھانے کے بعد اپنی پڑھائی میں جتی تھی کہ ممانے آکر اطلاع دی۔

''آپ پھپھو سے کہہ دیتیں ناں کہ میں پڑھ رہی ہوں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔ کل جو تین پیریڈز مس کئے تھے، میں ان کے نوٹس ایک کلاس فیلو سے لے کر آئی تھی اور اس وقت وہی دیکھ رہی تھی۔ کچھ عرصے سے میری پڑھائی کا بہت حرج ہونے لگا تھا۔ پہلے تو میں اور سندس مل کر پڑھ لیتے تھے لیکن اب ہماری ملاقاتوں میں زمان شاہ کو ڈسکس کرنے کے سوا کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں تو پھر بھی رات کو پابندی سے پڑھ کر کچھ تلافی کرلیا کرتی تھی لیکن سندس اللہ جانے کیا کرتی تھی۔ کالج میں پیریڈز مس کرنے، رات گئے تک زمان شاہ

فون پر بات کرنے اور نیند پوری نہ ہونے کے سبب تھکے تھکے سے ذہن کے ساتھ صبح کالج کے نتائج کچھ اچھے نکلنے کی اُمید تو نہیں کی جاسکتی تھی۔

''بری بات ہے مہیرہ.....! تمہاری پھپھو اتنے پیار سے تمہیں یاد کر رہی ہیں اور تم منٹ کی بات کرنے کے لئے بھی بہانے بازی کر رہی ہو۔'' ممانے فوراً ہی مجھے ٹوکا تو میں دونا چار فون سننے چلی گئی۔

''السلام علیکم پھپھو.....! کیا حال ہیں.....؟''

''وعلیکم السلام میری جان.....! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن تم بتاؤ تمہاری آواز ہوں بجھی بجھی سی لگ رہی ہے.....؟'' پہلی پہلی بھتیجی ہونے کی وجہ سے پھپھو مجھ سے کچھ زیادہ ہی پیار کرتی تھیں۔ اب بھی میری بیزار سی آواز سے نہ جانے کیا سمجھیں جو بڑی فکرمندی سے پوچھنے لگیں۔

''کچھ نہیں پھپھو.....! بس تھوڑی سی تھکن ہو رہی تھی۔ آپ بتائیں کیا کر رہی ہیں.....؟'' مجھے ان کے انداز پر اپنی بیزاری کو سوچتے شرمندگی ہوئی۔

''مجھے کیا کرنا ہے بیٹا.....! رات کے کھانے کے بعد فراغت ہی فراغت، اسید اپنی پڑھائی اور دوستوں میں مصروف۔ تمہارے پھوپھا کتابوں میں گم۔ میں اکیلی بیٹھی بور ہوتی رہتی ہوں۔ ایسے وقت میں بیٹی کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ کم از کم کوئی بات کرنے والا تو ہو جان سے۔'' پھپھو نے اپنا دُکھڑا رو دیا۔

''تو میں ہوں ناں آپ کی بیٹی، آپ کا جب دل چاہے بات کرنے کا مجھ سے فون بات کرلیا کریں۔'' میں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے بیزار تھی، بڑی لگاوٹ سے کہہ رہی تھی۔ دل میں تو مجھے خود بھی پھپھو سے بہت پیار تھا لیکن بس آج کل ذہن کچھ اُلجھا اُلجھا سا تھا۔ اس لئے رویہ بھی کبھی عجیب وغریب ہو جاتا تھا۔

''جیتی رہو بیٹا.....! اس بات میں تو خیر کوئی شک ہی نہیں کہ تم میری بیٹی ہو۔'' پھپھو فوراً ہی نہال ہو کر بولیں۔

''امی.....! کس سے بات کر رہی ہیں.....؟'' مجھے پیچھے سے اسید کی ہلکی سی آواز

سنائی دی۔

''مہیرہ ہے۔'' پھپھو نے اسے اطلاع دی۔

''اچھا......! آپ بات کرلیں تو میری بھی بات کروایئے گا۔'' اسید کی آواز سنائی دی تو مجھے حیرت ہوئی۔ ہم دونوں کے آپس میں تعلقات اتنے اچھے نہیں تھے کہ وہ مجھ سے بات کرتا۔

''مہیرہ بیٹا......! یہ اسید تم سے کچھ بات کرنا چاہ رہا ہے۔'' پھپھو نے مجھ سے کہتے فوراً ہی ریسیور اسید کو تھما دیا۔

''ہاں بھئی......! کیا حال چال ہیں......؟ پڑھائی کیسی جارہی ہے......؟'' وہ بڑے دوستانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''ٹھیک ٹھاک......! لیکن یہ اچانک تمہیں کیوں فکر ہونے لگی......؟'' میں سچ مچ بڑی حیران تھی۔

''امی......! ذرا میرے لئے ایک کپ چائے تو بنادیں۔'' اس نے مجھے جواب دینے کے بجائے پھپھو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کل تم اس چائنیز ریسٹورنٹ میں کیا کررہی تھیں......؟'' تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے جو بات کہی اسے سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

''تمہیں کیسے پتا......؟'' بے ساختہ ہی میرے منہ سے سوال نکلا۔

''میں اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں گیا تھا لیکن اہمیت اس بات کی نہیں کہ مجھے کیسے پتہ چلا۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ تم وہاں کیسے گئیں......؟'' وہ بہت سنجیدہ تھا۔

میرا دل چاہا کہہ دوں تم کون ہوتے ہو انوسٹی گیشن کرنے والے لیکن ڈر تھا کہ زیادہ اکڑنے کی صورت میں وہ مما پپا سے بھی شکایت لگا سکتا ہے سو شرافت سے بات کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔

''وہ......سندس کے کزن کل ہمیں کالج سے پک کرنے آئے تھے تو وہی واپسی میں ہمیں وہاں لنچ کے لئے لے گئے۔'' کوئی نہ کوئی بہانا تو بنانا ہی تھا۔

''وہ ریسٹورنٹ تمہارے کالج سے گھر کے روٹ پر تو نہیں پڑتا۔ خیر پڑتا تب بھی وں کو اس طرح کالج یونیفارم میں کسی ریسٹورنٹ میں نہیں لے جانا چاہئے تھا۔ لوگ تے ہیں۔ اچھے خاصے میچور لگ رہے تھے وہ صاحب۔ انہیں اس بات کی عقل نہیں اور چل پڑیں سندس کے کزن کے ساتھ......؟ جانے سے پہلے ماموں مامی سے اجازت ......؟'' وہ بڑا بزرگ بنا مجھے جھاڑ پلا رہا تھا۔ غلطی میری تھی، اس لئے ضبط کرگئی۔

''اچھا بابا......! آئندہ نہیں جاؤں گی۔ اب بس کرو اور پلیز اس بات کو یہیں ختم کر ہو کہ آکر مما پپا سے شکایت لگانے بیٹھ جاؤ۔'' میں نے اپنی غلطی قبول کرتے ہوئے

''اگر میں اتنا ہی چغل خور ہوتا تو کل ہی فون کر کے مامی کو بتا دیتا۔ اب بھی کسی کو اس لئے بہانے سے امی کو چائے بنانے بھیجا ہے۔'' اس نے تپے ہوئے انداز میں ٹ سے فون بند کردیا۔ مجھے اس کے موڈ کی تو خیر کوئی پرواہ نہیں تھی، البتہ یہ اطمینان کہ وہ اس معاملے میں کسی کے سامنے زبان نہیں کھولے گا۔

☆☆☆

''آج کالج سے چھٹی کرلو۔ تمہیں میرے ساتھ شاپنگ کے لئے چلنا ہے۔'' ی ہی بات تھی۔ میں حسب معمول ناشتے کی میز پر آئی تو مما نے ماہرہ کا لنچ باکس تیار کر کے بیگ میں ٹھونستے مجھے ہدایت دی۔

''آپ فرح آنٹی کے ساتھ چلی جائیں ناں۔ میرا تو آج پریکٹیکل ہے۔'' میں سدا لیٹ جانے کی چور، مما کے حکم پر فوراً ہی تجویز پیش کی۔

''فرح تو خیر ساتھ چلے گی ہی لیکن تمہارا بھی ساتھ چلنا ضروری ہے ورنہ بعد میں ہوگی کہ سوٹ کا کلر اچھا نہیں، سینڈل کا ناپ صحیح نہیں، جیولری پرانے ڈیزائن کی ہے۔ پھپھو نے تمہاری پسند کا خیال رکھنے کے لئے ہی خاص طور پر شاپنگ کی ذمہ داری سر ڈالی ہے۔'' مما پتہ نہیں کون سی۔ پہیلیاں بجھوا رہی تھیں۔ آخر میری شاپنگ وہ بھی ہدایات پر کروانے کی یہ ایمرجنسی ضرورت کیوں آپڑی تھی۔

"تم بھی ناں شاہدہ.....! پہلے اسے کچھ بتا تو دو۔ بچی ناحق پریشان ہو رہی ہے" پیا نے میرا ہونق چہرہ دیکھتے مما کو ٹوکا۔

"ہاں تو بتانے ہی جا رہی ہوں۔ آپ اور ماہرہ جائیں تو اطمینان سے بات کر ہوں۔" مما نے چائے کا کپ بنا کر پیا کے آگے رکھا۔ جبکہ میرے اندر عجیب کھد بد ہو گئی تھی۔ آخر ایسی کیا اہم بات تھی جو مما نے صرف مجھ سے کرنا تھی۔ نوالے میرے حلق پھنسنے لگے۔ بڑی مشکل سے پیا اور ماہرہ کی روانگی کا انتظار کیا۔

"تم ٹیبل صاف کر کے برتن دھو دو۔ جانے سے پہلے سارے کام نمٹانے کھانا وغیرہ پکا کر نکلوں گی تو ہی ٹھیک رہے گا۔ بازار میں تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں پاپا کے پیچھے گیٹ تک جاتے مما نے مجھے ہدایت دی۔

"مما.....! کچھ مجھے بھی تو بتائیں۔" میں نے ٹیبل سے برتن اُٹھا کر سنک میں جا کر ڈالے اور واپس کمرے میں آ گئی۔ مما بھی گیٹ بند کر کے واپس آ چکی تھیں۔ فریزر سے گوشت کا پیکٹ نکالتے آرام سے بولیں۔

"اس سنڈے کو ہم تمہاری انگیجمنٹ کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں شاپنگ کے جانا ہے۔"

"کیا.....؟ مگر اتنی اچانک کیسے.....؟" میں حیرت کے جھٹکے سے سنبھلی تو دیکھا کچن میں جا چکی ہیں۔

"مما.....! آپ کیا کہہ رہی ہیں.....؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" میں بھی کے پیچھے پیچھے کچن میں جا پہنچی۔

"ایک دو لوگوں نے مجھ سے تمہارے رشتے کے سلسلے میں بات کی تھی۔ تمہا پھپھو سے ذکر کیا تو کہنے لگیں میں باقاعدہ رسم کرنے آ رہی ہوں۔ سب لوگوں کو پتا چل جا گا کہ مہیرہ، اسید کی ہے۔ زبانی کلامی تو انہوں نے بہت دن پہلے ہی تمہارے پیا اور مجھ بات کر لی تھی۔ ظاہر ہم نے اس لئے نہیں کیا تھا کہ تم لوگوں کے ذہن ڈسٹرب نہ ہوں لوگ دل لگا کر اپنی پڑھائی کر سکو لیکن اب مجبوری ہے۔ لوگوں کو بنا کوئی جواز بتائے انکار کر

خاندان میں ناراضگیوں کا خدشہ ہے۔" مما کی باتوں نے میرے چودہ طبق روشن کر

اتنی اچانک منگنی وہ بھی اسید سے۔ میرا اور اس کا مزاج تو آپس میں کبھی ملا ہی نہیں مما کے سامنے کوئی احتجاج کرنا بیکار تھا۔ اس لئے مجھے فوری طور پر سنڈس کی ضرورت محسوس نے لگی۔ ابھی دین آنے میں کچھ وقت تھا۔ اس لئے میں نے اس سے ملنے کے لئے دوڑ لگا

"سنڈس کے گھر جا رہی ہو تو فرح سے کہہ دینا مارکیٹ چلنے کا۔" مما نے پیچھے سے از لگائی۔

"آؤ بھئی مہیرہ.....! آج کالج نہیں جانا کیا.....؟" سنڈس کے ہاں پہنچی تو سامنے سیح بھائی اور انکل بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ کھلے پٹر کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ فرح ن کچن میں ہیں۔

"سیح بھائی.....! سنڈس اپنے کمرے میں ہے ناں.....؟" میں نے ان کی بات کا اب دینے کے بجائے پوچھا۔

"ہاں ہاں ہے۔ کالج جانے کی تیاری کر رہی ہے۔" ان کے بتانے پر میں سنڈس کمرے کی طرف دوڑی۔

"ارے تم مہیرہ.....! تیار کیوں نہیں ہوئیں.....؟" سنڈس مجھے دیکھ کر حیران ہوئی ر میں نے بجائے کوئی جواب دینے کے اس کے گلے لگ کر پچکوں پچکوں رونا شروع کر

"ارے ارے کیا ہوا.....؟ کیا مسئلہ ہو گیا.....؟ کیوں اتنی بری طرح رو رہی .....؟" سنڈس میرے رونے پر بوکھلا گئی مگر میں کچھ کہے بنا شدت سے روتی رہی۔

"کچھ تو بتاؤ مہیرہ.....! آخر کیا ہوا ہے.....؟" بڑی مشکل سے سنڈس نے مجھے خود سے الگ کر کے بیڈ پر بٹھایا اور پانی کا گلاس میرے لبوں سے لگاتے پوچھا۔

"مما میری منگنی کر رہی ہیں، وہ بھی اسید کے ساتھ۔" میری آہ وزاری ایک بار پھر

شروع ہوگئی۔ اس بار سندس بھی میرے غم میں شریک تھی۔ اسید کے لئے میری ناپسندیدگی سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھی۔

''سندس......! تمہاری وین آ گئی۔'' وین کے ہارن کے ساتھ سمیع بھائی نے بھی آواز دی۔

''بھائی......! وین والے کو منع کر دیں۔ میں آج کالج نہیں جاؤں گی۔'' سندس نے آواز لگا کر سمیع بھائی سے کہا۔ مجھے اتنے بڑے غم کے حوالے کر کے وہ کیسے کالج جا سکتی تھی۔

''ہیں......! یہ تم دونوں کو کیا ہوا......؟'' سمیع بھائی جو شاید صورتِ حال کا جائزہ لینے آئے تھے۔ ہم دونوں کی ماتمی صورت دیکھ کر حیرت سے پوچھنے لگے۔

''بھائی......! مہیرہ کی منگنی ہو رہی ہے۔ اس کی پھپھو کے بیٹے اسید سے۔'' سندس نے نہایت غم سے اطلاع دی۔

''اچھا......! جب ہی یہ صبح صبح تمہیں خوشخبری سنانے دوڑی آئی ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے خوشی میں چہرے پر اس طرح بارہ تو نہیں بجتے۔'' سمیع بھائی نے ہم دونوں کے چہروں کی طرف دیکھتے تبصرہ کیا۔

''اچھا......! ہاں میں سمجھ گیا۔ تم لوگ اسید بیچارے کے لئے فکر مند ہو۔ صحیح بات ہے بھئی......! جس بیچارے کے حصے میں تم دونوں میں سے کوئی آئے وہ تو ہے ہی قابلِ رحم۔'' انہوں نے بڑے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔

''بھائی......! بند کریں اپنی یہ باتیں۔ وہ بیچاری پہلے ہی اتنی پریشان ہے اوپر سے آپ بھی۔'' سندس نے سمیع بھائی کو ٹوکا تو وہ ہنستے ہوئے چلے گئے۔ میری اور سندی کی کیفیت کو انہوں نے حسبِ عادت احمقانہ جذباتیت ہی سمجھا ہوگا۔

☆☆☆

''میری بیٹی تو بالکل شہزادی لگ رہی ہے۔'' پھپھو مجھے دیکھ کر نہال ہو گئیں اور خود سے لپٹا کر ڈھیروں ڈھیر پیار کر ڈالا۔ مگر مجھے زندگی میں پہلی بار پھپھو کا پیار ذرا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں تو ہمیشہ یہی سمجھتی رہی تھی کہ وہ بھتیجی ہونے کی وجہ سے مجھ سے اتنا پیار کرتی ہیں۔

''نیت'' کا حال تو مجھ سے پوشیدہ ہی تھا۔ یہ ان کی سازش کا ہی تو نتیجہ تھا کہ میں کتان کے بھاری کام دار شرارے پر میچنگ جیولری، ڈھیروں ڈھیر چوڑیوں اور گجروں کے سب کی مرکزِ نگاہ بنی بیٹھی تھی۔ میری سب سے چھوٹی خالہ بیوٹیشن تھیں جنہوں نے آج ے چہرے پر اپنی مہارت کے پورے پورے جوہر دکھائے تھے۔ میرے لئے خود اپنے لو پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ سب لوگوں کے بقول میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی لیکن تو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ طرح طرح کے اعتراضات دل میں اُبھر رہے تھے۔ جتنا بھاری ں اور جیولری مما نے مجھے دلائی تھی زندگی میں کبھی اس کا آدھا بھی پہننے کی اجازت نہیں دی اور میک اَپ کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ لپ اسٹک اور نیل پالش کے وہ سارے صورت شیڈز میرے سامنے گھوم رہے تھے جن کو میں بہت خواہش کے باوجود مما کے اوگی اپناؤ'' جیسے آمرانہ حکم کے باعث نہیں خرید سکی تھی۔ اب دل کی یہ ساری خواہشات ا ہوئی تھیں تو برابر میں بیٹھے اسید ز[illegible] وجود بری طرح کھٹک رہا تھا۔

''تمہارے کیا پیٹ میں درد ہو رہا ہے......؟'' اسید نے میری طرف جھکتے سرگوشی

''تم سے کس احمق نے کہا......؟'' میں نے شدید غصہ آنے کے باوجود صرف دانت انے پر اکتفا کرتے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''کہنا کس نے ہے۔ تم شکلیں ہی ایسی بنا رہی ہو کہ صاف پتا چل رہا ہے۔'' اس اطمینان سے جواب دیا۔

''تم اپنی ڈاکٹری اپنے پاس رکھو اگر مجھے کوئی تکلیف ہوئی بھی تو تم جیسے نیم حکیم رابطہ نہیں کروں گی۔'' میں نے ذرا سا اس کی طرف رُخ موڑتے اسے گھورنے کی کوشش

''یہ فاؤل ہے۔ دولہا دُلہن چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں۔'' یکدم ہی میری کزنز سے کسی نے شور مچایا۔

''تو کیا تم نے ہمیں بے شرم سمجھ رکھا ہے جو بزرگوں کی موجودگی میں بلند آواز سے

باتیں کریں۔"

"اُف......!" اسید کا جواب۔ سب نے اس بات کو اپنی طرف سے معنی پہناتے وہ ہاؤ ہو مچائی کہ میرے لئے سر اُٹھانا مشکل ہو گیا۔

"چلو بھئی......! میری بیٹی کو تنگ مت کرو۔ پہلے ہی وہ گھبرائی ہوئی ہے، اوپر سے تم لوگ مزید اسے ستا رہے ہو۔" پھپھو کا پیار ایک بار پھر میرے لئے اُمڈا اور وہ میری مدد کے لئے چلی آئیں۔

"اوہو......! ہونے والی بہو کا بڑا خیال ہے۔" کسی نے پھپھو کو بھی چھیڑا۔

"بہو کیوں......؟ بیٹی ہے میری۔" پھپھو نے ایک بار پھر مجھے گلے لگایا۔ اسی پیار پیار میں وہ حرے سے میری اُنگلی میں اپنے بیٹے کے نام کی انگوٹھی ڈال گئیں اور میرے پاس تو اپنی حسرتوں پر آنسو بہانے کا بھی موقع نہیں تھا۔ چاہے جانے کی خواہش، میچور، ڈیسنٹ ہم سفر کی تمنا۔ سب ایک آن میں ختم۔ اسید جیسا بندہ جو عین منگنی کے روز میرے برابر میں بیٹھ کر کوئی خوبصورت رومانٹک جملہ نہیں بول سکا۔ اس سے مستقبل میں کسی بھی قسم کے "منگیتر ازم" کی اُمید رکھنا بے سود ہی تھا۔

☆☆☆

"مہرہ......! یہ دیکھو مجھے زمان نے دیا ہے۔" کالج کی چھت کی طرف جاتی سیڑھیوں پر بیٹھے سندس نے اپنے بیگ سے Nokia کا موبائل سیٹ نکال کر مجھے دکھایا۔

"اچھا ہے ناں......؟" میری طرف سے کسی قسم کا رسپانس نہ ملنے پر سندس نے پوچھا۔

"ہوں......!"

"کیا ہوں......؟ جب سے تمہاری منگنی ہوئی ہے تم ڈھنگ سے میری کوئی بات ہی نہیں سنتیں۔" سندس خفا ہوئی۔

"سن رہی ہوں بابا......! اور دیکھ بھی رہی ہوں۔ بہت اچھا سیٹ ہے لیکن زمان شاہ نے تمہیں کیوں دیا......؟ تم لوگ تو پی ٹی سی ایل پر بھی بات کر لیتے ہو۔" میں نے سوچوں

سندس سے پوچھا۔ ویسے اس رات مجھے خود پر ٹھیک ٹھاک رحم آ رہا تھا۔ زمان شاہ کو ے چھپ کر بات کرنا پڑتی تھی پھر بھی وہ اس سے رابطے میں رہتا تھا اور اب یہ موبائل ت کر دیا تھا۔ دوسری طرف میرے منگیتر صاحب تھے۔ نہ کوئی پابندی، نہ کوئی ظالم ر منگنی کے بعد ایک بار بھی مجھے خصوصی فون نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ ابھی پندرہ دن ی اٹھارویں سالگرہ پڑی تھی تب بھی معمول کی طرح پھپھو ہی تحفے تحائف لے کر وہ صاحب تو حرے سے کیک اور دوسرے لوازمات سے انصاف کر کے بغیر ڈکار لئے رح اپنی والدہ کا پلو پکڑ کر آئے تھے ویسے ہی واپس بھی لوٹ گئے۔ ٹھیک ہے میں ایک لڑکی تھی، والدین نے جہاں رشتہ جوڑا تھا تھوڑا بہت رو پیٹ کر صبر سے گھونٹے سے تھی لیکن اب ایسی بھی "صابرہ بیگم" نہیں تھی کہ سامنے والے کی بے نیازی آسانی سے جاؤں۔

"سمیع بھائی کے دوست وغیرہ ان سے شکایت کرنے لگے تھے کہ رات کو جب بھی ے گھر کا نمبر ملاؤ فون انگیج ملتا ہے۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں پکڑی نہ جاؤں اس لئے زمان اب فون پر بات نہیں کریں گے۔ انہوں نے جواب میں یہ موبائل دلا دیا۔ اب کوئی ں۔ جب دل چاہے گا بغیر کسی رکاوٹ کے آرام سے بات کر لیا کروں گی۔" سندس ا۔

"اور اگر کسی نے تمہارے پاس موبائل دیکھ لیا تو......؟" میں نے اسے ڈرایا۔

"کوئی نہیں دیکھے گا۔ بیگ میں چھپا کر رکھوں گی۔ یہاں کالج ٹائم میں آن رکھوں ر آف کر دوں گی۔ گھر میں جب موقع ملے گا تب بات کر لیں گے۔" سندس کا اطمینان تھا۔ مجھے ایک بار پھر اس پر رشک آیا۔

"ارے ہاں......! زمان تم سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ میں نے انہیں تمہاری ں کی منگنی کے بارے میں بتایا تھا۔ بہت افسوس کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے مہرہ سے بات کروانا۔ میرے خیال میں یہ موقع اچھا ہے تم ان سے بات کر لو۔" سندس نے کہنے تھ کی پیڈ پر اُنگلیاں چلانی شروع کر دیں۔ اگلے ہی لمحے وہ زمان شاہ سے رابطہ کر چکی

تھی۔ خود اس نے زمان شاہ سے دو چار باتیں کیں اور موبائل میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"السلام علیکم.....!" میں بمشکل اتنا ہی کہہ پائی۔

"وعلیکم السلام.....! کیسی ہیں آپ.....؟ کیا حال ہے آپ کا.....؟" اس کی خوبصورت آواز میرے کانوں میں گونجی۔

"جی ٹھیک ہوں.....!" میری مری مری سی آواز نکلی۔

"سندس سے آپ کی زبردستی کی منگنی کے بارے میں سنا۔ بہت افسوس ہوا۔ آپ کے والدین کو آپ کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ آخر آپ کی بھی کوئی رائے ہے۔ انہیں چاہئے تھا کہ پہلے آپ سے پوچھتے پھر ہامی بھرتے۔ ویسے سندس بتا رہی تھی کہ آپ کا منگیتر ڈاکٹر ہے۔ کافی ذہین اور ہینڈسم بھی ہے۔ پھر آپ کے اسے ناپسند کرنے کی کیا وجہ ہے..... کہیں آپ پہلے سے کسی اور میں انٹرسٹڈ تو نہیں.....؟"

"جی نہیں.....! میں ایسے فضول کام نہیں کیا کرتی۔" زمان شاہ کی بات پر پتہ نہیں کیوں مجھے غصہ آ گیا اور میں بے ساختہ ہی بولی۔

"ارے.....! یہ تو آپ نے بہت غلط بات کہی۔ آپ کے نزدیک کسی کو پسند کرنا اس سے محبت کرنا فضول کام ہے.....؟ یعنی میں اور سندس آپ کے خیال میں فضول ہیں.....؟" اس نے فوراً ہی میری بات پکڑ لی۔

"نہیں نہیں.....! ایسی کوئی بات نہیں۔ یونہی پریشانی میں ایک بات زبان سے نکل گئی۔ آپ مائنڈ مت کریں۔" میں نے فوراً ہی اس سے معذرت کی۔ آخر کو وہ میری عزیز از جان دوست کا محبوب نظر تھا۔ جس سے سندس کی شادی ہونے کے نتیجے میں یقیناً میرا اہم واسطہ پڑنا تھا۔ بھلا اس کو ناراض کر کے میں اپنی دوست کو کیوں اپنے ہاتھ سے جانے دیتی۔

☆☆☆

"مہیرہ آپی.....! آپ کو سمیع بھائی بلا رہے ہیں۔" میں نے کالج سے آ کر ابھی کپڑے تبدیل کئے تھے کہ انیلا مجھے بلانے چلی آئی۔

"خیریت.....؟" انیلا کے چہرے پر ایسا کچھ تھا کہ میں گھبرا گئی۔

"جی.....! لیکن بھائی نے کہا ہے کہ آپ کو اپنے ساتھ لے کر آؤں۔" مجھے لگا کہ مجھ سے آنکھیں چرا رہی ہے لیکن سمیع بھائی کے بلاوے پر جانا تو تھا ہی۔ مما کو اپنے پڑوس میں جانے کی اطلاع دی تو بولیں۔

"ایک تو تم دونوں دوستوں کا ایک دوسرے کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ مجھے پتا ہے سندس نے آج کڑھی چاول بنائے ہیں۔ اسی لئے سندس نے تمہیں بلوایا ہے۔" مما کے لگائے اندازے پر مجھے بھی تھوڑا اطمینان ہوا۔ ایسا تو اکثر ہو ہی جاتا تھا کہ فرح آنٹی یا مما میں سے کوئی ہم دونوں کا من پسند کھانا بناتیں تو ہم دونوں دوستیں ایک دوسرے کے گھر کھانا کھا لیتے۔

مگر اصل پریشانی سمیع بھائی کی طرف سے بلاوے پر تھی۔ وہ تو عموماً اس وقت تک یونیورسٹی سے واپس ہی نہیں آتے تھے۔ میں سوچوں میں اُلجھی انیلا کے ساتھ سندس کے گھر پہنچی۔

"بھائی اور ممی آپی کے کمرے میں ہیں۔" انیلا نے مجھ سے کہا اور خود تیزی سے کچن میں چلی گئی۔ میں نے جھجکتے ہوئے سندس کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے اور جوں ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے ہی رہ گیا۔ کمرے کے منظر میں آنسو بہاتی سندس، سرکو پکڑے بیٹھی فرح آنٹی، سپاٹ چہرے اور سرخ آنکھوں والے سمیع بھائی کسی انہونی کے ہو جانے کا پتہ دے رہے تھے۔

"کیا.....؟" میں نے چند لمحوں میں ہی جان لیا۔ سندس کا کالج بیگ ایک ٹیبل پر الٹا ہوا تھا اور سمیع بھائی کے ہاتھ میں موجود موبائل سیٹ بے حد نمایاں تھا۔

"ان چیزوں کے بارے میں جانتی ہو.....؟" سمیع بھائی نے موبائل سیٹ کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر ڈائننگ ٹیبل بھی میرے سامنے کی۔ میرا تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والا حال تھا۔

"تم دونوں مل کر ہمیں اتنا بڑا دھوکا دے سکتی ہو، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا.....؟ کتنا اعتبار تھا مجھے تم لوگوں پر اور اس اعتبار کا کیا صلہ دیا ہے تم نے اور سندس نے مجھے اور اپنے گھر والوں کو.....؟ غلطی چاہے ایک کی ہو، قصوروار تو تم دونوں ہی ٹھہرائی جاؤ گی۔

تمہاری اتنی گہری دوستی، دن رات کا ملنا جلنا۔ تو یہ تو میں کسی صورت نہیں مان سکتا کہ سندس جو کچھ کر رہی تھی، تم اس سے لاعلم تھیں۔'' سمیع بھائی کی باتیں میں دم سادھے سن رہی تھی۔ کہنے کو کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ سندس بمع ثبوت کے پکڑی گئی تھی، کیسے؟ یہ تو مجھے نہیں معلوم تھا لیکن اب شامت سامنے نظر آ رہی تھی۔

''ابھی عمر ہی کیا ہے تمہاری جو تم ایسے چکروں میں پڑی ہو.....؟ صرف بی ایس سی پارٹ ون کی اسٹوڈنٹ ہو اور حرکتیں اتنی بڑی بڑی.....؟'' سمیع بھائی کی مخاطب اس بار صرف سندس تھی جسے وہ سخت لہجے میں سرزنش کر رہے تھے۔

''میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔ میں اور زمان شاہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور یہ کوئی جرم نہیں۔'' یکدم ہی سندس رونا بند کر کے دلیری سے بولی تھی۔

''چوری اوپر سے سینہ زوری۔ زبان کاٹ دوں گی میں تیری۔'' فرح آنٹی نے غضب ناک ہو کر سندس کو ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔

''ممی.....! آپ چھوڑ دیں اسے۔ اس پر عشق کا بھوت سوار ہے۔ یہ بھوت کوئی اور نہیں خود زمان شاہ اُتار دے گا اس کے سر سے۔'' سمیع بھائی نے انٹی کو پکڑ کر سندس سے دور ہٹایا۔

''یہ لو، آج کا پورا دن اور رات تمہاری۔ تم جتنی دیر چاہے زمان شاہ سے بات کر سکتی ہو۔ بس صرف اتنی شرط ہے کہ اسے اس بات پر راضی کر لینا کہ وہ اپنے ماں باپ کو تمہارا رشتہ لینے ہمارے گھر بھیجے۔ اگر وہ لوگ جھوٹے منہ بھی یہاں آ گئے تو یہ میرا وعدہ ہے میں تم دونوں کی شادی کرواؤں گا۔ لیکن مجھے یقین ہے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ جتنا میں زمان شاہ کو جانتا ہوں، تم نہیں جانتیں۔ وہ ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ ہے جس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن صرف تفریحاً لیا ہے۔ اس کا ہر دوسرے دن ایک نئی لڑکی سے افیئر چلتا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس کا یہاں صرف ایک دفعہ آنا یہ گل کھلائے گا تو میں کبھی اسے اپنے گھر کا ایڈریس نہیں دیتا۔ تمہیں اس سے عشق کا دعویٰ ہے تو جو میں نے کہا ہے، وہ اس سے منوا کر دکھا دو۔ اگر زمان شاہ بارات لے کر یہاں آ گیا تو تم میرے منہ پر تھوک دینا۔ ویسے بھی تمہارا میرا تعلق

ہمیشہ کے لئے ختم۔ مجھے بہت مان تھا تم پر۔ تم نے میرا مان توڑ دیا پھر بھلا کسی چھوڑے رکھنے کا کیا جواز.....؟'' سمیع بھائی فرح آنٹی کو اپنے ساتھ لے کر باہر نکل ں اس دوران دیوار سے ٹیک لگائے تھر تھر کانپتی رہی تھی۔ سمیع بھائی کا یہ روپ میں گی میں پہلی بار دیکھا تھا ورنہ وہ تو ہمیشہ بہت نرم لہجے میں بات کرتے تھے۔

''کیا ہوا تھا.....؟ سمیع بھائی کو کیسے پتہ چلا زمان شاہ کے بارے میں.....؟'' ان کے باہر جاتے ہی میں لپک کر سندس کے قریب آئی۔

''زمان آئے تھے مجھے ڈراپ کرنے۔ سمیع بھائی اتفاق سے یونیورسٹی سے جلدی آ گئے۔ بس سے اُترتے انہوں نے مجھے اور زمان کو ساتھ دیکھ لیا۔ گھر آ کر وہ مجھ سے بارے میں پوچھ رہے تھے کہ میرے بیگ میں موبائل بج اُٹھا۔ پتہ نہیں کیسے آج میں گھر سے پہلے موبائل سائلنٹ پر کرنا بھول گئی تھی۔ بس سمجھو، سارے برے اتفاقات ایک ہی ہوتے چلے گئے۔ سمیع بھائی نے میرے بیگ کی تلاشی لے کر موبائل اور انگوٹھی دونوں لے لئے بس پھر پہلے ممی کو بلایا بعد میں تمہارے لئے پیغام بھیجا۔'' سندس نے مجھے تفصیلات بتائیں۔

''تمہیں ڈر نہیں لگا سندس.....! میری تو جان ہی نکل گئی سمیع بھائی کا غصہ دیکھ کر ہو کہ اتنے آرام سے زمان شاہ سے محبت کا اعتراف کر رہی تھیں۔'' میں نے جھرجھری سندس سے پوچھا۔

''پہلے تو میں بھی ڈر گئی تھی لیکن پھر سوچا کہ ایک نہ ایک دن تو اس بات کو سامنے آنا تھا۔ اب جب بات سامنے آ گئی ہے تو کیوں نہ صاف صاف ہی سب کچھ بتا دیا جائے۔ سمیع بھائی خود مجھے اجازت دے کر گئے ہیں زمان سے بات کرنی کی۔'' وہ فخر سے بولی۔

''اور وہ جو انہوں نے کہا ہے وہ تم سے ہمیشہ کے لئے تعلق توڑ لیں گے۔'' میں نے سمیع بھائی کے الفاظ یاد دلائے۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ ایک بار میری زمان سے شادی ہونے دو سب لوگ میرے آگے گھومیں گے۔ زمان شاہ کی حیثیت سارے دعوؤں کو بھلا دے گی۔'' سندس نے گویا اپنے

کان سے مکھی اُڑائی۔

''اچھا تم فون تو کرو زمان شاہ کو۔'' سمیع بھائی کے چیلنج کو سوچتے میں نے سندس سے کہا تو وہ موبائل پر زمان شاہ کا نمبر ملانے لگی۔

''انہوں نے اپنا موبائل آف کر رکھا ہے۔'' کافی دیر کوشش کرنے پر سندس نے منہ لٹکا کر بتایا۔

''اچھا......! چلو رات میں کر لینا۔ فی الحال میں گھر جا رہی ہوں۔ پھر جو بھی بات ہو مجھے بتانا۔'' میں گھر لوٹ آئی۔ شام سے رات تک کئی بار میرا دل چاہا کہ سندس کے پاس جا کر زمان شاہ سے ہونے والی بات کے بارے میں پوچھوں لیکن ہمت نہ ہو سکی۔ فرح آنٹی اور سمیع بھائی کی شکایتی نظریں بار بار میرے تصور میں آ کر میرے ارادے کو کمزور کر دیتی تھیں۔

☆☆☆

''مہیرہ......! جلدی کرو یار......! دیر ہو رہی ہے۔'' اسید کی آواز پر میں نے جلدی جلدی اپنی کتابیں سمیٹیں اور باہر کی طرف دوڑ لگائی۔

''اتنی آوازیں لگاتے ہیں کہ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے ہیں۔'' میں نے اسید کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے خفگی سے کہا۔

''آوازیں تو اس لئے لگاتے ہیں کہ تمہارا چہرہ زیادہ دیر نظروں سے اوجھل رہے، یہ ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔'' گاڑی آگے بڑھاتے اسید نے میرے چہرے پر ایک محبت بھری نگاہ ڈالی۔

''رہنے دیں، سب کہنے کی باتیں ہیں، اصل جلدی تو اس بات کی ہے کہ جلد از جلد یونیورسٹی پہنچیں تاکہ میموں کا دیدار کر سکیں۔'' میں نے جواباً اسید کو چھیڑا۔

''جو بات تم میں ہے وہ میموں میں کہاں......؟ ہم تو ان کی نیلی آنکھوں میں بھی تمہاری سیاہ آنکھیں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔'' اسید کا انداز ڈھیٹ عاشقوں والا تھا۔ یوں ہی ہنستے مسکراتے انہوں نے گاڑی میرے مطلوبہ مقام تک لے جا کر روکی۔

''اچھا بھئی اللہ حافظ......! پھر لنچ ٹائم میں ملیں گے۔'' میں نے گاڑی کا دروازہ

...ر اُترتے ہوئے اپنا روزانہ کا جملہ دُہرایا۔

''یار مہیرہ......! بات تو سنو......!'' اسید نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے مجھے روکا۔

''جی......!'' میں پلٹی۔

''اتنے دنوں سے انگریزوں کے ملک میں ہو، کبھی ان کی طرح گڈبائے ہی کہہ دیا ...'' انہوں نے باہر دکھائی دیتے ایک انگریز جوڑے کی طرف اشارہ کرتے کہا تو میرے ...شرم سے سرخ پڑ گئے۔ کبھی مجھے اسید سے شکوہ ہوا کرتا تھا کہ وہ رومانٹک نہیں اور اب ...ن کے جگہ جگہ رومانس بگھارنے پر پزل ہوئی جاتی تھی۔

میری پانچ سال پیچھے کی زندگی اور موجودہ زندگی میں بہت بڑا انقلاب آیا تھا اور یہ ...ب سندس کی کہانی کے مرہونِ منت تھا۔ جس طرح اس کی زندگی میں شروع ہونے والی لو ...ی نے مجھے فینٹسی میں مبتلا کیا تھا ویسے ہی اس لو اسٹوری کا انجام مجھے اس فینٹسی سے باہر ...لے آیا تھا۔ سندس کی لو اسٹوری اسی روایتی انجام سے دوچار ہوئی تھی جو کچی عمر میں ماں ...کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کی جانے والی محبتوں کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ زمان شاہ ...سمیع بھائی کی پیشن گوئی کے عین مطابق سندس کے شادی کے مطالبے پر صاف انکار کر دیا ...سندس کو ایک طرف زمان شاہ کی بے وفائی رُلاتی تھی تو دوسری طرف گھر والوں کا سرد ...مارے ڈالتا تھا۔ خصوصاً سمیع بھائی کی بے رُخی نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ سمیع بھائی نے ...ان توڑنے پر سندس کو کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ فرح آنٹی اور انکل بھی اس سے سخت بدگمان ...۔ اسی نفرت بھری فضا میں سندس کے لئے اس کے دور پرے کے رشتے داروں میں سے ...زول آیا تو گھر والوں نے بنا کوئی چھان بین کئے فوراً رشتہ طے کر کے اس کی شادی کر دی۔ ...س کا میاں اس سے کئی سال بڑا، معمولی شکل و صورت کا مالک، ایک عام سا شخص ہے۔ ...وہ اپنی بے انتہا خوبصورت اور کم عمر بیوی پر بالکل بھروسہ نہیں۔ وہ اس بات پر حیران ہوتا ہے ...سندس کے گھر والوں نے اتنی حسین لڑکی کے لئے اس کا رشتہ کیسے قبول کر لیا اور یہ حیرانی ...ہے شک میں مبتلا رکھتی ہے۔ سندس کی زندگی کے اس رُخ سے صرف میں واقف ہوں۔ ...پنے گھر والوں سے اس نے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا۔ وہ ان کی طرف سے دی گئی سزا کو بہت

خاموشی سے سہ رہی ہے۔

دوسری طرف میں ہوں۔ میں تو یوں بھی پڑھنے لکھنے کی شروع ہی سے شوقین تھی لیکن سندس پر گزرے حادثے نے مجھے پھر پل بھر کو بھی بھٹکنے نہیں دیا۔ اپنی تعلیم میں مگن رہی۔ مجھے اسید کی بے نیازی نے کبھی ستایا نہ اُلٹی سیدھی خواہشات نے میرا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کی۔ اس انہماک اور دلچسپی سے پڑھنے کا نتیجہ تھا کہ میں نے ایم ایس سی میں ٹاپ کیا اور مجھے اسکالرشپ مل گئی۔ اسید کا ایم بی بی ایس بھی اس دوران مکمل ہو گیا تھا سو ہمارے بڑوں نے فیصلہ کیا کہ یہی وہ مناسب وقت ہے کہ اب ہم دونوں کو ایک کر دیا جائے۔ شادی کے فوراً بعد میں اور اسید انگلینڈ آ گئے جہاں میں نے ایم فل میں ایڈمیشن لے لیا اور اسید اسپیشلائزیشن کر رہے ہیں۔ زندگی میں مجھے اتنا کچھ ملا ہے جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مجھ جیسی مڈل کلاس لڑکی اس مقام پر کیسے پہنچی، جب بھی اس بات کو سوچوں تو ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ میرے قدموں میں کسی کے ٹوٹے مان کی کرچیاں نہیں، میرے دامن پر کسی نافرمانی کا داغ نہیں، میں نے دوسروں کے تجربوں سے خود کو سنبھالنے کا گر سیکھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے بزرگوں کی دُعائیں ہر قدم پر میرے ساتھ رہیں۔ دُعاؤں سے بڑھ کر کوئی زادِ راہ نہیں۔ میں نے یہ بات بہت جلد سمجھ لی۔ کاش کہ ہر لڑکی سمجھ سکے۔ سندس کی طرح خود کو تجربات کی بھینٹ چڑھانے والی لڑکیوں کا سب سے بڑا المیہ یہی ہوتا ہے کہ وہ دُعاؤں سے محروم ہو جاتی ہیں اور یقین کریں زندگی میں اس سے بڑھ کر کوئی محرومی نہیں۔

☆☆☆

خواب، خواہشیں اور زندگی

"پھر یار.....! کب دعوت دے رہے ہو ہمیں اپنے دولت کدے پر.....؟"

"دولت کدہ کیسا یار.....! بس عام سا غریب خانہ ہے۔"

"اگر وہ غریب خانہ ہے تو اللہ ہم سب کو ایسا غریب خانہ دے۔ سچ میں تو حیران رہ گیا تھا اس کی حویلی دیکھ کر۔ اتنے وسیع رقبے پر بنی، انٹیکس کے شاہکار نمونوں سے سجی کوئی حویلی کم از کم میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔ دو سال ہو گئے مجھے وہاں گئے لیکن آج تک اس کے سحر سے نہیں نکل سکا۔ یہ جو اتنا بیچارہ سا بنا پھرتا ہے تمہارے سامنے، گاؤں جا کر اس کی ٹور دیکھنا۔"

سینٹرل لائبریری کی سیڑھیاں چڑھتی دریشہ جمال کے کان پوری طرح لڑکوں کے اس گروپ کی طرف لگے ہوئے تھے جو حنیر اسد کو اپنے گھیرے میں لئے بیٹھا تھا۔

"اولینڈ لارڈ دے پتر.....! کیوں دُنیا کو بے وقوف بناتا پھرتا ہے.....؟" ان میں سے ایک نے حنیر کے شانے پر دھپ لگاتے ہوئے بے تکلفی سے پوچھا۔

دریشہ کے اپنے ذہن میں بھی یہ سوال کئی بار سر اُٹھاتا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ رُک کر حنیر کا جواب سنے لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ چکا ہے، اس لئے مجبوراً آگے بڑھ گئی۔

"سارا مال دبا کر بیٹھی ہیں تمہاری دادی اور پھپھی۔ ہمارے سسرال کا تو دستور ہی

نرالہ نکلا۔ دُنیا بھر میں دیکھا ہے، خاندانی گھر بڑے بیٹے کے حوالے کیا جاتا ہے لیکن یہاں تو ببو بیٹی کے پیار میں ابا جی ایسے دیوانے ہوئے کہ بیٹے کے حق کا بھی کوئی خیال نہیں آیا۔ کروڑوں کی حویلی کے ساتھ ساتھ بے شمار زرعی اراضی بھی اپنی چہیتی کے نام لکھ دی۔ جمال کے حصے میں کیا آیا صرف چند لاکھ روپے۔ اگر میں ہر قدم پر ان کا ساتھ نہ دیتی تو جو آج تم لوگ عیش کی زندگی گزار رہے ہو اس کا نام ونشان بھی نہ دکھائی دیتا۔"

ممی کے وقتاً فوقتاً کیے گئے تبصرے اسے پوری طرح ازبر تھے۔ اس لئے وہ اپنی پھپھی زاد حنیر اسد کے دوست کے خیال سے بالکل متفق تھی کہ وہ انہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ ورنہ کروڑوں کی جائیداد کے تنہا وارث کو اسٹوڈنٹس ہاسٹل میں رہنے اور مہران جیسی عام سی گاڑی استعمال کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ جہاں تک حویلی کا ذکر تھا تو اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک شاندار عمارت تھی۔ ہر سال عید پر وہ اپنی فیملی کے ساتھ وہاں جاتی تھی۔ اپنے ڈیڑھ دو دن کے قیام میں وہ کبھی پوری حویلی نہیں دیکھ سکی تھی۔ ملنے جلنے والوں کا ہجوم، دادی کا لاڈ پیار اور پھپھو کی خاطر مدارت اس بری طرح مصروف رکھتے کہ حویلی کے بے شمار بند پڑے کمروں کا جائزہ لینے کی خواہش ہر بار ہی دل میں دبی رہ جاتی۔ البتہ اپنی فیملی کو دیئے جانے والے کمروں، ڈرائنگ روم اور ڈائننگ ہال کی تزئین و آرائش کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ باقی کمرے بھی اسی طرح کا منظر پیش کرتے ہوں گے۔ حویلی میں شاید سب سے سادہ کمرہ وہ تھا جسے دادی اور پھپھو اپنے مشترکہ بیڈ روم کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔

"زیادہ سامان ادھر رنگ برنگی چیزوں کو دیکھ کر طبیعت گھبراتی ہے اس لئے میں نے اپنے کمرے کو سادہ ہی رکھوایا ہے۔"

ایک بار اس سے چھوٹے اُسامہ کے استفسار پر دادی نے بتایا تھا تو وہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئی تھی کہ بڑھاپے اور بیماریوں سے گھری دادی اور محدود زندگی گزارنے والی پھپھو کو ایسا ہی بے رونق کمرہ سوٹ کرتا ہے۔ البتہ حنیر اسد کے کمرے کے بارے میں اسے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ کیسا ہوگا۔ اس کے کمرے میں جانے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔ ان لوگوں کا آمنا سامنا عموماً ڈائننگ ہال میں یا پھر دادی کے کمرے میں ہوتا تھا۔ ان کے درمیان

سلسلہ بھی بزاری سا تھا جو کبھی سلام دعا یا حال چال معلوم کرنے سے آگے نہیں بڑھا
یونیورسٹی آ کر تو یہ رسمی سا تعلق بھی قائم نہیں رہتا تھا۔ نہ دریشہ کو اس سے بات چیت
کی خواہش تھی اور نہ ہی کبھی حنیر نے ایسی کوئی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

"کل یونیورسٹی سے چھٹی کر لینا۔ رات میں ایک اہم فنکشن اٹینڈ کرنا ہے۔" وہ
ٹیبل پر سب کے درمیان بیٹھی اپنے سامنے رکھی پلیٹ میں سے سلاد ٹونگ رہی تھی کہ ممی
سے مخاطب کیا۔

"فنکشن رات میں ہے تو صبح یونیورسٹی نہ جانے کی کیا تک.....؟" اپنے شغل کو
دیکھتے اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ڈیڈی اور اس کے دونوں چھوٹے بھائی اسامہ
اور بھی ان کی باہمی گفتگو سے بے نیاز کھانے کی طرف متوجہ تھے۔

"حال دیکھا ہے اپنا.....؟ پتا نہیں کتنے دنوں سے بالوں کی کٹنگ نہیں کروائی۔
اتنی رف ہو رہی ہے۔ کیا اس حلیے میں میں تمہیں اتنے اہم فنکشن میں لے جاؤں گی۔"
کے جواب پر غضب ناک ہوئی تھیں۔

"کیا یہ فنکشن "مس پاکستان" کے انتخاب کے سلسلے میں ہو رہا ہے۔ جو میرا خود کو
پینٹ کروانا بہت ضروری ہے۔" وہ ممی کے موڈ کو حسب معمول خاطر میں نہیں لائی۔ ان
کے درمیان تعلقات کبھی بھی بہت خوشگوار نہیں رہتے تھے۔ شاید اس کا سبب ممی کی
طبیعت اور خود اس کی ذات میں پائی جانے والی لاپرواہی تھی۔

"بجائے فضول بحث کرنے کے جو تم سے کہا ہے اس پر عمل کرو۔ کل صبح گیارہ بجے
لے لیا ہے میں نے شہلا سے۔ تم پارلر وقت پر پہنچ جانا باقی وہ خود دیکھ لے گی۔ تمہارا
دھارے بغیر میں تمہیں فنکشن میں نہیں لے جانا چاہتی۔" ممی نے اپنی مخصوص پیٹیشن کا
دیتے اسے حکم دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ میں گھر پر ہی رُک جاؤں گی۔ آپ، ڈیڈی اور جو بھی جانا چاہے جا
ہے۔ میں کون سا ہر جگہ آپ کا دم چھلا بن کر آپ کے ساتھ گھومتی رہتی ہوں۔" اس بار

اس کے لہجے میں بھی ہلکی سی تلخی در آئی۔

"دیکھ رہے ہیں جمال.....! اپنی لاڈلی کو۔ اتنی بڑی ہوگئی ہے مگر کسی بات کی گا نہیں۔ میرا خیال ہے آپ خود ہی اسے سمجھالیں۔ میری بات تو اس کے ویسے بھی سمجھ میں کم آتی۔" ممی نے زچ ہو کر جمال صاحب کو مدد کے لئے پکارا۔

"وریشہ.....! جو تمہاری ممی نے کہا ہے اس پر عمل کرو۔ فنکشن اہم ہے اور اس میں تمہاری شرکت بھی لازمی ہے، اسی لئے تمہاری ممی اتنا انسلٹ کر رہی ہیں۔" انہوں نے مم کی۔

"او کے ڈیڈی.....!" اس نے فوراً ہی تابعداری سے سر ہلایا۔ وہ بہت کم ا دونوں کے درمیان چھڑنے والی کسی بحث میں دخل اندازی کرتے تھے، مگر جب بھی ایسا ہوا وریشہ فوراً ہی پسپائی اختیار کر کے ان کی بات مان لیتی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ممی اس م اس انداز پر فقط اسے گھور کر رہ گئی تھیں جبکہ اُسامہ اور ولید ہنوز کھانے کے ساتھ انصاف کر میں معروف تھے۔

"سوچ رہی ہوں، بالوں کا کلر چینج کروالوں۔ بہت ون ہوگئے اس لک کے سا تھوڑا چینج آنا چاہئے۔" وریشہ کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد وہ اپنے سرخی مائل بالو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

"جیسی تمہاری مرضی.....!" جمال صاحب نے نیپکن سے ہاتھ صاف کر ہوئے جواب دیا۔

"گولڈن کلر کیسا رہے گا.....؟" اپنی عادت کے برخلاف ممی آج دوسروں کی را مانگ رہی تھیں۔

"فینٹاسٹک ممی.....! بلکہ میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنے بالوں کو ڈیانا کٹ دے دیں ریئلی.....! آپ پر بہت سوٹ کرے گا۔ لوگ آپ کو ڈیانا نو کہہ کر نہ پکاریں تو میرا نام بد دیجئے گا۔"

میٹرک کا اسٹوڈنٹ اُسامہ بہت جوش سے بولا تو وریشہ کی نظریں بے اختیار ممی

ف اُٹھیں۔

سنہری سی رنگت، تیکھے نقوش اور بہترین فگر کی مالک ممی کے بارے میں اُسامہ کا یہ بالکل درست تھا، وریشہ کی اپنی دوستیں بھی اکثر ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتی تھیں بعض تو انہیں اس کی ممی کے بجائے زیادہ سے زیادہ بڑی بہن ماننے پر زور دیتی تھیں۔ خود یشہ میں بھی ممی کی چھب آئی تھی خصوصاً رنگت اور ہونٹوں کا کٹاؤ تو بالکل ان ہی کی طرح تھا ن اس کے نقوش میں ممی کے تیکھے پن کے مقابلے میں نرمی کا تاثر تھا۔

"ممی اگر ڈیانا لگیں گی تو ہمیں بھی پرنس لگنا چاہئے۔ کیا خیال ہے اُسامہ.....! ہم وں بھی کل اسکول سے لیو لے کر کسی بیوٹی پارلر کا وزٹ کر لیں.....؟" ولید کو ہمیشہ اسکول یہ چھٹی کرنے کے موقعوں کی تلاش رہتی۔

"آپ دونوں کو تکلیفی زحمت کی ضرورت نہیں کیونکہ کل کے فنکشن میں صرف وریشہ رے ساتھ جائے گی۔ آپ دونوں نے گھر پہ ہی رہ کر اسٹڈی کو نائم دینا ہے۔"

جمال صاحب کی مداخلت پر اُسامہ اور ولید کے چہرے پر معصومانہ سی بیچارگی طاری ئی جسے دیکھ کر وریشہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ چھا گئی۔ ان دونوں کے تاثرات پر اسے یہ ساختہ ہی ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

"تو پھر کیا سوچا تم نے.....؟"

"کس سلسلے میں.....؟" اپنے ناخنوں کو فائل کرتے اس نے بے نیازی کا تاثر دینا

"تم اچھی طرح جانتی ہو میں کس سلسلے میں بات کر رہی ہوں۔" ممی نے اس کی بے نیازی کو خاطر میں نہ لاتے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن شاید آپ بھول چکی ہیں کہ میں آپ کو اس معاملے میں صاف انکار کر چکی ں۔ لہٰذا مزید اس سلسلے میں بار بار پوچھنا بے وقوفی ہے۔"

اس نے ریموٹ کی مدد سے ٹی وی آن کر کے اپنی توجہ اسکرین کی طرف مبذول کر

"بے وقوفی میں نہیں، تم کر رہی ہو۔ وحید درانی کے ساتھ شادی کر کے تم عیش میں رہو گی۔"

"جیسے اس کی سابقہ دونوں بیویاں رہی تھیں......؟" ممی کی جھنجلاہٹ کا جواب اس نے طنز سے دیا تھا۔

"وہ الگ مسئلہ تھا۔ وہ دونوں عورتیں خود ہی کرپٹ تھیں، ورنہ وحید درانی خود نہایت نائس آدمی ہے۔"

"میرا خیال ہے آپ وحید درانی کی وکالت کرنے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ اگر وہ پہلے سے دو بیویاں بھگتا کر نہ بیٹھا ہوتا تو بھی میرے پاس اس سے شادی نہ کرنے کے لئے کئی جواز ہیں۔ وہ موٹا، بھدا، ادھیڑ عمر شخص کسی بھی طرح میرے ساتھ میچ نہیں کرتا، اسے چاہئے کہ اپنے جیسی کوئی عمر رسیدہ بیوہ تلاش کرے۔"

وہ بہت مشکل سے اپنے غصے کو قابو میں رکھے ہوئے تھی۔ اسے ممی سے ہرگز بھی یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس کے لئے اس قسم کا پرپوزل لے کر آئیں گی۔ اس رات خصوصی تیاریوں کے ساتھ اپنے فنکشن میں لے جائے جانے پر وہ کھٹکی تو ضرور تھی کہ ہو نہ ہو معاملہ کسی رشتے کا ہے۔ لیکن وہ رشتہ وحید درانی جیسے شخص کا ہوگا، اسے قطعی اُمید نہیں تھی۔ وضع قطع اور عمر کے فرق کے علاوہ بھی وہ شخص اسے پسند نہیں آیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ڈولتے سرخ ڈورے اور ان سے چھلکتی ہوس اسے بلانوش اور عیاش ثابت کرنے کے لئے کافی تھی۔

"کوئی ایسا خاص بھدا اور عمر رسیدہ نہیں ہے اور پھر اس کی بے تحاشا دولت کے سامنے یہ ساری خامیاں نظر ہی کہاں آتی ہیں۔" آج ممی کا انداز کافی مصالحانہ تھا۔

"مجھے اپنے باپ کے گھر میں ایسی کوئی کمی نہیں کہ میں وحید درانی کی دولت پر ریجھ جاؤں۔" اس نے دوبدو جواب دیا۔

"کمی ہے نہیں لیکن ہو سکتی ہے۔ تمہارے ڈیڈی کا بزنس اب پہلے والی حالت میں نہیں۔ تمہارے وحید درانی سے شادی کر لینے کی صورت میں انہیں سپورٹ مل جائے گی۔ دوسری صورت میں ہم کافی نیچے کی طرف آ سکتے ہیں۔ اگر تم یہ شادی کر لیتی ہو تو نہ صرف خود

رہو گی۔ بلکہ تمہارے ڈیڈی اور بھائیں کا مستقبل بھی محفوظ ہو جائے گا۔ تمہیں اچھی معلوم ہے کہ اس بزنس کے سوا تمہارے ڈیڈی کے پاس کچھ نہیں۔ تمہارے دادا، دادی جائیداد کی تقسیم میں اتنی ناانصافی نہ کی ہوتی تو کم از کم ہمارے پاس گاؤں والی حویلی ہوتی اور آج یوں تمہارے سامنے گڑگڑانے کے بجائے ہم وہ حویلی بیچ کر نقصان پورا کر" ممی کے لہجے میں قدرے رکھائی آ گئی۔

"پلیز ممی......! ایموشنل بلیک میلنگ سے کام لینے کی کوشش نہ کریں۔ یہ میرے زندگی بھر کا معاملہ ہے، اگر میں یہ قربانی دے دوں تو یقیناً آپ لوگوں کو بہت سے حاصل ہو جائیں گے۔ لیکن میرے لئے آگے کا راستہ بہت مبہم اور غیر واضح ہے۔ اپنی کو صرف دوسروں کے عیش و عشرت کے لئے داؤ پر لگا دینا ایسا آسان کام بھی نہیں، بٹ پراس۔ میں اس سلسلے میں غور کروں گی۔ دیکھیں، ہو سکتا ہے فیصلہ آپ کی پسند کا ہو" ڈیڈی کے بزنس اور پریشانی کو سوچ کر وہ اپنے رویے میں قدرے لچک لے آئی

"پھر کب تک جواب دو گی تم......؟ درانی صاحب کو زیادہ عرصہ انتظار میں رکھنا ب نہیں ہوگا۔" ممی نے بے تابی سے پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ویسے بھی میرا موڈ گاؤں جانے کا ہو رہا ہے۔ چند دن یہاں دور رہ کر سکون سے سوچوں گی تو ہی کوئی صحیح فیصلہ کر سکوں گی۔ آپ ڈیڈی سے کہیں وہ مجھے ں بھجوانے کا انتظام کر دیں۔"

وہ جو قدرے نرم پڑی تھی۔ جھٹکے سے کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اپنے خراب موڈ کے ث اس نے ابھی ابھی وہاں پہنچنے والے ڈیڈی کو بھی مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔

☆☆☆

"میں صدقے، میری بیٹی میرے پاس رہنے آئی ہے۔" دادی اپنے بوڑھے، ریوں سے پر ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامے ہوئے تھیں۔ خوشی ان کی آنکھوں سے پھوٹی پڑ ی تھی۔ یقیناً اس کی خلاف توقع آمد نے انہیں بے حد مسرت بخشی تھی۔

"دیکھو زرینہ.....! ہماری حویلی کیسی روشن روشن اور بارونق لگ رہی ہے۔" انہوں نے سفید دوپٹے کے ہالے میں دھیمے سے مسکراتی پھپھو کو مخاطب کیا۔

"جی اماں.....! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" انہوں نے تائید کی اور پھر اس سے مخاطب ہوئیں۔

"وریشہ.....! عظمت خالہ نے تمہارا کمرہ اور غسل خانہ وغیرہ ٹھیک کر دیا ہے۔ تم چاہو تو نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ اور تھوڑی دیر آرام بھی کر لو۔ اتنا طویل سفر کر کے آئی ہو تھک گئی ہو گی۔"

"اے ہاں.....! اب مجھے دھیان آیا۔ یہ تمہارے باپ کی عقل کو کیا ہوا۔ لے کر تنہا، جوان جہان لڑکی کو ڈرائیور کے ساتھ اتنی دور بھیج دیا۔ خدانخواستہ راستے میں کچھ اونچ نیچ ہو جاتی تو۔" دادی جواب تک اس کی آمد کی خوشی میں نہال ہوئی جا رہی تھیں۔ طویل سفر کے ذکر پر انہیں یک دم ہی خیال آیا۔

"میں تو اکیلی ہی آ رہی تھی دادی.....! وہاں شہر میں تو ہر جگہ خود ہی ڈرائیو کر کے جاتی ہوں۔ یہاں تو ڈیڈی نے اصرار کر کے ڈرائیور کے ساتھ بھجوایا ہے۔"

"ہاں بھئی.....! زمانے کا چلن ہی بدل گیا ہے۔ تمہارا یا تمہارے باپ کا کیا قصور.....؟ ایک ہم ہیں حویلی سے دو گز آگے بھی اکیلے چلے جائیں تو واپسی کا راستہ نہ ملے۔" اس کے جواب پر دادی نے تاسف سے تبصرہ کیا۔

"اسی کا نام تو جنریشن گیپ ہے دادی.....!" وہ کھلکھلائی۔

"یہ کیا بلا ہے بھئی.....!" وہ حیران ہوئیں۔

"کچھ نہیں اماں.....! آپ رہنے دیں ان باتوں کو۔ وریشہ ابھی کئی روز تک یہاں رہے گی، پھر کبھی پوچھ لیجئے گا۔ ابھی اسے آرام کے لئے جانے دیں۔" زرینہ پھپھو نے مداخلت کرتے گفتگو کو سمیٹا۔ یقیناً اس کے قیام کے طویل دورانیہ کا قیاس انہوں نے اس کے جہازی سائز سوٹ کیس کو دیکھ کر لگایا تھا۔

"پھپھو.....! ڈرائیور چلا گیا یا ابھی ہے.....؟" ان کے ساتھ اپنے کمرے کی

بتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ابھی تو ہے۔ شریف بابا کے ہاتھ کھانے پینے کی چیزیں اور چائے بھجوائی تھی تو یہ بھی کھلوایا تھا کہ چند گھنٹے آرام کر لے پھر رات کا کھانا کھا کر روانہ ہو۔ غریب اتنی بھگ کر کے آیا ہے۔ اچھا تو نہیں لگتا کہ یوں اُلٹے پیروں لوٹ جائے۔ اُصولاً تو اسے صبح ناشتے کے بعد ہی جانا چاہئے تاکہ دن کی روشنی میں آرام سے گاڑی چلا سکے، لیکن ل بھائی کو تکلیف ہو گی، یہ سوچ کر اصرار نہیں کیا رُکنے پر۔" زرینہ پھپھو نے تفصیلی بتایا۔

"کوئی کام ہو تو بتا دو۔ میں اسے پیغام بھیج دوں گی کہ جانے سے پہلے تم سے مل کر ئے" انہوں نے پیش کش کی۔

"کام تو کچھ نہیں، بس یونہی پوچھ لیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ اپنے کمرے کے ے پر ٹھہری۔

"اچھا.....! یہ تو بتا دو کہ رات کے کھانے میں کیا کھاؤ گی.....؟" انہوں نے پیار پوچھا۔

"جو دل چاہے بنا لیں۔ میرا کچھ معلوم نہیں کہ رات کو کھانا کھاؤں بھی یا نہیں۔ فی آپ نے چائے کے ساتھ جو اتنی ڈھیر ساری چیزیں کھلائی ہیں، ان کا ہضم ہونا بھی لگ رہا ہے۔"

اپنے ازلی بے نیازی سے جواب دے کر وہ کمرے میں گھس گئی۔ یوں بھی اب وہ تنہا رہنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"آج بڑی جلدی اُٹھ گئیں بیٹی.....! خیریت.....؟ کیا نیند صحیح سے نہیں ...؟"

ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گراتی دادی نے قدرے تشویش سے پوچھا کیونکہ ین دنوں میں وہ دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں جاگتی تھی۔

"نیند تو بہت اچھی آئی۔ اصل میں رات کو بہت جلدی سو گئی تھی، اس لئے اس [illegible] جلدی آنکھ کھل گئی۔" وہ ان کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گئی۔

"صغریٰ......! دیکھ زرینہ بی بی ہوں گی باورچی خانے میں، ان سے بول کہ [illegible] کے لئے جوس نکال دیں۔" دادی نے کمرے میں جھاڑ پونچھ کرتی لڑکی کو حکم دیا مگر اس [illegible] پہلے کہ وہ دوبارہ جاتی، پھپھو ٹرے ہاتھ میں اُٹھائے چلی آئیں۔

"ارے تم جاگ گئیں، مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں ورنہ تمہارے لئے جوس بھی [illegible] ہی لے آتی۔ اچھا ایسا کرو، پانچ منٹ انتظار کرو۔ میں ابھی لاتی ہوں۔" وہ ٹرے دادی [illegible] سامنے تخت پر رکھتے ہوئے بولیں۔

"رہنے دیں پھپھو......! آج کچھ چینج کا موڈ ہو رہا ہے۔ میں دادی کے ساتھ ان [illegible] ناشتہ شیئر کر لیتی ہوں۔"

کہتے کہ ساتھ اس نے سامنے ٹرے میں رکھی پلیٹ سے پراٹھے کا لقمہ توڑا۔ [illegible] نہیں کیوں اسے اچھا نہیں لگا تھا کہ پھپھو اس کی خاطر دوبارہ کچن کا رُخ کریں۔ اپنے گھر [illegible] تو اسے کبھی اس قسم کی بات سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ وہاں یہ ساری خدمات تنخواہ دار ملازم دوڑ دوڑ کر انجام دیتے تھے۔

"رات تم بہت جلدی سو گئی تھیں۔ تمہاری ممی کا فون آیا تھا، تم سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ شاید تم نے اپنا موبائل آف کر رکھا ہے اس لئے ان کا تم سے رابطہ نہیں ہو رہا، اب ایسا کرنا ناشتے کے بعد تم خود سے انہیں فون کر کے بات کر لینا۔" پھپھو نے اسے فون کے متعلق بتانے کے ساتھ ساتھ مشورہ بھی دیا۔

"دیکھا جائے گا۔" آملیٹ اور پراٹھے کے ساتھ انصاف کرتی وہ بظاہر لاپروائی سے بولی۔

زرینہ نے بے ساختہ اماں کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں بھی تشویش کی پرچھائیاں تھیں۔ وریشہ کا یہاں آ کر رہنا ان کے لئے لاکھ خوشی کا باعث صحیح لیکن وہ سمجھ سکتی تھیں کہ وہ یہاں اپنی خوشی سے یا ان کی محبت میں آ کر نہیں رہ رہی۔ اس کی آمد کے پیچھے یقینا

[illegible]ئی سبب تھا۔ جو نہ تو اب تک وریشہ نے بیان کیا تھا نہ انہوں نے کریدنے کی کوشش کی تھی۔

"وریشہ......! دوپہر کے کھانے میں کیا بناؤں......؟" کچھ دیر خاموش رہنے کے [illegible]د انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں پھپھو......! ابھی تو ناشتہ بھی حلق سے نیچے نہیں اُترا اور [illegible]پ دوپہر کے کھانے کی فکر کرنے لگیں۔" وریشہ ان کے پوچھنے پر ہنس کر بولی۔

"نہیں......! اصل میں آج عصر و مغرب کے درمیان درس کا پروگرام ہے۔ اس [illegible]لسلے میں بھی کچھ انتظامات کرنے ہیں اس لئے میں چاہ رہی تھی کہ دوپہر کے کھانے سے [illegible]دی فارغ ہو جاؤں۔" انہوں نے وضاحت دی۔

"ایک تو مجھے ہر وقت آپ کے کچن میں مصروف رہنے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں [illegible]تی۔ وہ صابرہ بی جو کچن کے کاموں کے لئے ملازم ہیں، وہ آخر کس مرض کی دوا ہیں۔" [illegible]یب پڑے ٹشو رول سے ہاتھ صاف کرتے اس نے ناگواری کا اظہار کیا۔

"صابرہ بی کہاں سنبھال سکتی ہیں اکیلی اتنا کام۔ گھر والوں کے علاوہ ملازموں، [illegible]ی، پٹواری اور دوسرے آنے جانے والوں کا بھی انتظام کرنا ہوتا ہے۔ پھر یہ ہے کہ صابرہ بی [illegible]روایتی کھانوں کے علاوہ نئی نئی چیزیں بنانی بھی نہیں آتیں۔ تم آج کل کے بچے تو چائنیز اور [illegible]ریزی کھانوں کے دیوانے ہو اس لئے بھی میں خود پکانے کی کوشش کرتی ہوں۔" پھپھو مسکرا [illegible]ر بولیں۔

"تو آپ ملازمہ چینج کر لیں۔ سیلری اچھی ہو تو شہر سے بھی کوئی شخص آنے کو تیار ہو [illegible]ئے گا۔" پھپھو کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے اس نے مشورہ دیا۔

"نہ بیٹی......! یہ جو ہمارے ملازم ہیں، برسوں سے ہماری خدمت کر رہے ہیں۔ [illegible]ی جوانیاں انہوں نے اس حویلی کی خدمت میں کھپائی ہیں۔ اب جب ان کا مشکل وقت ہے [illegible]ہم کیسے ان سے منہ موڑ سکتے ہیں۔ پھر یہ غریب مانگتے ہی کیا ہیں دو وقت کی روٹی، سال کے [illegible]ر جوڑے اور کبھی بیمار پڑنے پر دوا دارو کے لئے تھوڑی سی رقم، تو کیا ہم ان کی عمر بھر کی [illegible]داری کے بدلے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔" اس کے مشورے پر دادی گویا تڑپ ہی گئی تھیں۔

”حویلی میں ہر طرف نوکروں کی فوج پھرتی ہے۔ وہ بھی ہمارے نوکروں کی طرح حرام خور نہیں کہ سارا وقت سر پر کھڑے ہو کر چلاتے رہو، تب کہیں جا کر ڈھنگ سے کام کریں۔ وہاں کے نوکر تو حویلی والوں کے بے دام غلام ہیں تمہاری دادی، پھپھی اور اس کا بیٹا تو دُنیا میں جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔“

اسے بے ساختہ ہی ممی کا تبصرہ یاد آیا۔ جواب سے پہلے ہمیشہ درست ہی محسوس ہوا تھا۔ حویلی میں اپنے سال کے سال کئے جانے والے ڈیڑھ دن کے قیام میں کبھی حقائق کو صحیح طرح سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

دن بھر عورتوں کے دُکھ درد سنتی، ان کے مسائل سلجھاتی دادی اور ہر پل متحرک رہنے والی زرینہ پھپھو کو عیاشی کے کون سے مواقع میسر تھے، وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

”کیا ماں باپ کے سچ مچ اتنے حقوق ہوتے ہیں پھپھو......!“ کل درس میں شرکت کے بعد سے وہ کچھ اُلجھی اُلجھی سی تھی۔ اس بات کو زرینہ خود بھی محسوس کر رہی تھیں۔ اب اس کے سوال پوچھنے پر ان کے احساس کو تقویت ملی۔ یقیناً کچھ ایسا تھا جس نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔

”ماں باپ کے حقوق تو اتنے ہیں کہ انہیں اُف تک کہنے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن تم بتاؤ، تم اتنی پریشان کیوں ہو؟“ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے بالوں کی لٹیں سنوارتے ہوئے پوچھا۔

”اگر ماں باپ اولاد کا برا کر رہے ہوں تب بھی......؟“ وہ ان کے سوال کے برعکس اپنی ہی کسی سوچ میں اُلجھی ہوئی تھی۔

”ماں باپ بھلا کب اولاد کا برا چاہتے ہیں......؟“ وہ اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے دھیرے سے ہنسیں۔

”ماں باپ تو اولاد کی خوشی کے لئے اپنا عیش و آرام، مال و زر سب داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اولاد تو ان کے لئے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں سے سب سے قیمتی نعمت ہوتی ہے۔ جس

کے کسی چیز کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔“

”آپ نہیں جانتیں پھپھو......! اس دُنیا میں ایسے ماں باپ بھی ہوتے ہی جو اپنے آرام کی خاطر اولاد کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔“

اس کی آواز میں دُکھ اُتر آیا۔ زرینہ نے اُلجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ کچھ پوچھنے کے لیے انہوں نے اپنے ہونٹ وا کئے مگر اس سے پہلے ہی صغریٰ وہاں چلی آئی۔

”وہ جی فون ہے شہر سے۔ دریشہ بی بی کے لئے۔“ اس کے اطلاع دینے پر وہ اُٹھ کر فون والے کمرے میں چلی گئی۔

”یہ کیا ڈرامہ ہے دریشہ......! اتنے دنوں سے تم وہاں جا کر بیٹھی ہوئی ہو اور یہاں تمہاری نانی نے جلدی مچا رکھی ہے۔ تم واپس آؤ تو کچھ ہو۔ میں اکیلی کیا کیا کام دیکھ سکتی ہوں......؟ فی الحال جیولر کو کچھ سیٹس بنانے کے لئے دیئے ہیں، باقی شاپنگ تم آؤ تو مل کر کرتے ہیں۔“

”وہ کس سلسلے میں......؟“ اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”تمہاری شادی کے سلسلے میں اور کس لئے......؟ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے......؟“ جواباً انہوں نے خفگی کا اظہار کیا۔

”مائنڈ یو ممی......! میں نے ابھی ہاں نہیں کی ہے اور میری ہاں کے بغیر آپ کچھ نہیں کر سکتیں۔“

اس نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ اپنے اندر کوئی نرم گوشہ پیدا کر سکے لیکن ممی کی باتیں ہر بار اس کی کوشش پر پانی پھیر دیتی تھیں۔ فون بند کر کے وہ خراب موڈ کے ساتھ دادی کے کمرے میں چلی آئی اور ان کے تخت پر لیٹ کر ان کی گود میں سر چھپا لیا۔

”زرینہ بتا رہی تھی تمہاری ماں کا فون آیا ہے، کیا کہہ رہی تھی......؟ یقیناً اتنے دن یہاں رُکنے پر ڈانٹ رہی ہوگی۔ تمہاری پڑھائی کا بھی تو نقصان ہو رہا ہوگا ناں۔“ دادی نے اس کے انداز کو نوٹ کرتے ہوئے اسے کریدنا چاہا۔

"میری زندگی کا نقصان ہو جائے انہیں تب بھی پروا نہیں ہوگی۔" وہ نروٹھے پن سے کہہ کر منہ چھپائے چھپائے ہی بے آواز آنسو دادی کی گود میں گراتی رہی۔

☆☆☆

"السلام علیکم.....!" ناشتے کی میز پر اس کا سامنا غیر متوقع طور پر حنیر اسد سے ہوگیا۔

"خیریت سے ہیں آپ.....؟" اس کی طرف سلام کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے پوچھا تو وہ اس بار بھی محض اثبات میں سر ہلا سکی۔

"حنیر کل رات کو پہنچا ہے۔ کافی رات ہوگئی تھی تم سو چکی تھیں۔ امتحان شروع ہونے والے ہیں ناں! درمیان میں نہیں آسکے گا۔ اس لئے ابھی دو دن کے لئے ملنے آگیا ہے۔"

اسے لگا کہ پھپھو اسے احساس دلانا چاہ رہی ہیں کہ وہ کیسے اتنے دنوں سے ہر چیز سے لاتعلق ہو کر یہاں ڈیرہ ڈالے بیٹھی ہے۔ مگر اس کے خیال کے برعکس پھپھو کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا۔ چہرے پر چھائی رہنے والی ازلی نرمی کے ساتھ وہ ہر ایک کے سامنے اس کا من پسند ناشتہ رکھ رہی تھیں۔ خلاف معمول دادی بھی اپنے کمرے میں ناشتہ کرنے کے بجائے یہیں موجود تھیں۔ یقیناً اس تبدیلی کا سبب حنیر اسد کی آمد تھی۔

"آنے سے پہلے میری اکا جان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ ہوسکتا ہے دوپہر میں کسی وقت وہ یہاں پہنچ جائیں۔"

حنیر کی اطلاع پر دادی اور پھپھو کے چہرے پر خوشی کے رنگ پھیل گئے۔ وریشہ نے چند لمحے "اکا جان" کے مخاطب پر غور کیا اور پھر فوراً ہی سمجھ گئی کہ یہ ڈیڈی کے چھوٹے بھائی سید کمال شاہ کا ذکر خیر ہے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے آج تک اسے اپنے اکلوتے چچا سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ ان کی اور ڈیڈی کے درمیان کاروبار اور جائیداد کے سلسلے میں شدید تنازعہ تھا۔ اسی وجہ سے دونوں بھائیوں نے برسوں سے ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ یہاں تک کہ حویلی بھی ایک ساتھ آنے پر

نہیں ہوتے تھے۔ اس مسئلے کے حل کے طور پر ڈیڈی عید الفطر پر اور وہ عید الاضحیٰ پر حویلی
تے تھے۔ لیکن یہاں ہونے والی گفتگو سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ سید کمال شاہ ڈیڈی کی
صرف سال کے سال یہاں نہیں آتے بلکہ ان کا حویلی کے مکینوں سے مسلسل ملنا ملانا اور
تک رابطہ رہتا ہے۔

"کمال اکیلا ہوگا یا اس کے ساتھ....." دادی نے ایک نظر وریشہ پر ڈالتے ہوئے
لہ اُدھورا چھوڑا۔

"اکیلے ہی آئیں گے۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔" حنیر نے انہیں اطمینان دلایا۔

وریشہ جو اتنے دنوں میں حویلی کے ماحول سے مانوس ہوگئی تھی خود کو ان لوگوں کے
ن اجنبی سا محسوس کرنے لگی۔

"وریشہ.....! جوس کے ساتھ کچھ کھا بھی لو بیٹا.....! رات کو بھی تم نے کھانا صحیح سے
کھایا تھا۔" پھپھو کو یقیناً اس کے احساسات کا اندازہ ہوگیا تھا جو فوراً اس کی طرف متوجہ
ہا۔

"بس پھپھو.....! میں کھا چکی ہوں۔" وہ قدرے خجل سی ہو کر اُٹھ گئی۔ اپنے کمرے
نے کے بعد بھی اس پر ایک نامعلوم سی بے چینی طاری تھی۔ شاید اپنے ان دیکھے چچا سے
سامنا اس کا باعث تھا، بہرحال جو بھی تھا وہ زیادہ دیر اپنے کمرے میں نہ رُک سکی۔ پھپھو
کے خیال کے مطابق اس وقت کچن میں ہونا چاہئے تھا اس لئے سیدھی اسی طرف چلی
خلاف توقع وہاں صابرہ بی اور صغریٰ کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"جی بی بی.....! کچھ چاہئے.....؟" صغریٰ اسے دیکھ کر الرٹ ہوگئی۔

"نہیں.....! بس میں پھپھو کو دیکھنے آئی تھی۔" اس نے اپنی آمد کا سبب بتایا۔

"بی بی تو کمال صاحب کے کمرے میں ہیں۔" صغریٰ نے اسے اطلاع دی۔

"اچھا.....! کون سا کمرہ ہے ان کا.....؟" اس نے پلٹتے ہوئے پوچھا۔

"بڑی بی بی کے کمرے سے آگے دو کمرے چھوڑ کر۔" صغریٰ نے اسے گائیڈ کیا تو
طرف چل پڑی۔ یہ حویلی کے تالاگے کمروں میں سے ایک تھا۔ اپنے مختصر قیام کے

دنوں میں کئی بار اس نے ان مقفل کمروں کے بارے میں سوچا تھا، لیکن اب جبکہ وہ اتنے دنوں سے یہاں مقیم تھی اسے ایسا کوئی دھیان ہی نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے مسئلے میں اس بری طرح اُلجھی رہی تھی کہ اسے کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"کہاں مصروف ہیں پھپھو.....! میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہی ہوں۔" وہ بلند آواز سے بولتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ پھپھو اس کی اچانک آمد سے چونک گئی تھیں مگر پھر فوراً ہی سنبھل گئیں۔

"کمال آنے والا تھا تو میں نے سوچا اس کا کمرہ تھوڑا ٹھیک کر دوں۔ تم کہو کیوں ڈھونڈ رہی تھیں.....؟" ہاتھ میں پکڑا فوٹو فریم کپڑے کی مدد سے صاف کرتے انہوں نے فہم محسوس سے انداز میں ایک دراز کھول کر اندر ڈال دیا۔

"پھپھو.....! یہ میرے....." پھپھو کا سوال نظر انداز کر کے وہ جوش سے کارنس پر رکھی فریم شدہ تصویر کی طرف بڑھی۔ مگر پھر سمجھ میں نہ آیا کہ تصویر میں نظر آنے والے سیاہ سوٹ میں ملبوس ہینڈسم سے شخص کو کیا کہہ کر پکارے۔

"یہ تمہارے ابا جان ہیں۔" پھپھو نے مسکراتے ہوئے اس کی مشکل آسان کی۔

"تصویر میں تو یہ ڈیڈی سے بہت زیادہ ہینڈسم اور ینگ لگ رہے ہیں۔ کتنی پرانی ہے ان کی یہ تصویر.....؟" بے ساختہ ہی انہیں سراہتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"پچھلے سال بقر عید پر حنیر نے یہ تصویر کھینچی تھی۔" پھپھو جیسے اس کی حیرت سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

"رئیلی.....؟ ہی از سو ینگ۔ ویسے ان میں اور ڈیڈی میں کتنا ایج ڈیفرنس ہے.....؟"

"پانچ سال کا۔ سب سے بڑے تمہارے ڈیڈی ہیں۔ ان سے دو سال چھوٹی میں ہوں اور مجھ سے تین سال چھوٹا کمال ہے۔" پھپھو نے تفصیل سے بتایا۔

"لیکن دیکھنے میں یہ آپ اور ڈیڈی سے بہت چھوٹے لگ رہے ہیں۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"ساری بات قلبی اور ذہنی سکون کی ہے۔ اچھے اور نیک ہم سفر کا ساتھ انسان کو جوان اور توانا رکھتا ہے۔" پھپھو بے خیالی میں ایک ایسی بات کہہ گئی تھیں جو اس کا دھیان ممی کی طرف لے گئی۔

نوکروں پر چیخ چلاتی ممی، جن کی شاپنگ، بیوٹیشن اور فنکشنز کے بل ادا کرتے کرتے جمال صاحب ہلکان ہو جاتے تھے مگر پھر بھی وہ کبھی زبان پر کلمہ شکر نہیں لاتی تھیں۔ ان کے خیال میں ڈیڈی کے پاس جو کچھ تھا اس میں ڈیڈی کی محنت سے زیادہ ان کے حسن ذہانت کا دخل تھا اور شاید یہ ان کی ذہانت ہی تھی کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کو بھی کیش کرنا چاہتی تھیں۔

"تم جا کر اماں کے پاس بیٹھو۔ میں بس ابھی آتی ہوں۔"

پھپھو کو یقیناً اس کے چہرے کے تاثرات سے اپنی بات کی گہرائی کا اندازہ ہوا تھا۔ اس لئے اس کا دھیان بٹانے کو کمرے سے باہر بھیجنے کی کوشش کرنے لگیں۔ خود اس کا اپنا دل بھی اُچاٹ ہو چکا تھا۔ کیا خاص تھا اس کمرے میں ماسوا اکا جان کی تصویر کے۔ سادہ سا ہلکے رنگوں سے سجا کچھ کچھ دادی اور پھپھو کے بیڈ روم جیسا کمرہ اس کے مقابلے میں تو ان لوگوں کے حصے میں آنے والے کمرے زیادہ ڈیکوریٹڈ اور پرتعیش تھے۔

"کہاں ہو.....؟ صبح سے میرے پاس آ کر بیٹھی ہی نہیں۔" دادی نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"یہیں تھی دادی.....! پھپھو کے ساتھ اکا جان کے کمرے میں۔" اس نے بتایا اور ان کے پائدان میں سے چھالیہ کا ایک دانہ نکال کر منہ میں ڈالا۔

"بہت پیار کرتی ہے زرینہ، کمال سے حالانکہ ہر دوسرے مہینے آنا جانا لگا رہتا ہے پھر بھی اس کی آمد پر ہر بار ایسے ہی خوش ہوتی ہے۔" دادی اسے بتا رہی تھیں کہ وہ یکدم ہی بول اُٹھی۔

"خوش تو آپ بھی بہت لگ رہی ہیں دادی.....!"

"سچ کہا تم نے۔ کمال سی فرمانبردار اور پرواہ کرنے والی اولاد ہی تو ماں کی آنکھوں

کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ وہ بھی میری ممتا کو زیادہ نہیں تڑپاتا۔ کبھی اس کے پاس وقت نہ ہو آنے کا تو مجھے اور زرینہ کو گاڑی بھیج کر اپنے گھر رہنے کو بلوالیتا ہے۔"

دادی کی زبانی معلوم ہونے والی باتیں اسے شرمندگی میں مبتلا کر رہی تھیں۔ شاید آج کا سورج اپنے ساتھ اس کے لئے شرمندگی ہی لایا تھا۔ پہلے اکا جان کی بیوی کی تعریفیں اور اب خود ان کی تعریفیں سن کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے ماں باپ، اپنی اپنی دُنیاؤں میں مگن رہنے والے دو خود غرض انسان ہیں جنہیں دُنیا میں شاید کسی بھی رشتے کی پرواہ نہیں۔

☆☆☆

"وریشہ.....! تم کھانا سب کے ساتھ کھاؤ گی یا....." پھپھو نے اس کے کمرے میں جھانک کر پوچھتے ہوئے دانستہ جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

"میں آ رہی ہوں پھپھو.....!" دوپٹہ شانوں پر پھیلاتے ہوئے اس نے پیروں میں چپلیں پہنیں۔ حالات و واقعات کو اب وہ جس تناظر میں دیکھ رہی تھی اسے لگتا تھا جمال صاحب اور اکا جان کے تعلقات میں پڑنے والی دراڑ کا سبب بھی جمال صاحب خود ہی ہوں گے۔

"کمال.....! یہ وریشہ ہے جمال بھائی کی بیٹی۔" ڈائننگ ہال میں پہنچ کر پھپھو نے اس کا تعارف کروایا۔

"السلام علیکم.....!" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"وعلیکم السلام.....! آؤ بیٹا.....! یہاں میرے پاس بیٹھو۔" ان کی گمبھیر آواز میں پایا جانے والا ٹھہراؤ ان کی سلجھی ہوئی شخصیت کا عکاس تھا۔

وریشہ جھجکتے ہوئے ان کے بائیں جانب موجود خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ دائیں طرف پہلے ہی سے حنیر اسد موجود تھا۔ ڈائننگ روم میں اس کی آمد کے وقت وہ اسی سے مصروفِ گفتگو تھے لیکن اس وقت ان کی توجہ کا مرکز وریشہ تھی۔ جس کے اپنے برابر والی کرسی پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ نجانے کیوں وریشہ کو اپنی آنکھیں بھیگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ شاید اتنے دنوں سے گھر سے دوری اور مسلسل ذہنی پریشانی کا اثر تھا۔

"کیا کر رہی ہو آج کل.....؟" وہ یوں پوچھ رہے تھے جیسے ہمیشہ سے اسے جانتے

"ہسٹری میرا بھی پسندیدہ سبجیکٹ ہے۔ بس یہ ہے کہ اس کی اکیڈمک ایجوکیشن نہیں کی ورنہ کتابیں اس موضوع پر بے شمار پڑھی ہیں۔" اس کی زبانی یہ جاننے کے بعد ہسٹری میں آنرز کر رہی ہے وہ بے حد خوش ہوئے تھے۔

"تم چاہو تو میرے کمرے میں چند کتابیں رکھی ہیں۔ یہاں قیام کے دنوں میں پڑھ کر بور ہونے سے بچ سکتی ہو۔"

اسے آفر کرتے انہوں نے چاولوں کی ڈش اُٹھا کر اس کے سامنے رکھی۔ باقی وقت اس سے چھوٹے موٹے سوال کرتے رہے۔ دورانِ گفتگو وہ ٹیبل پر موجود کھانوں میں سے وہ کچھ اس کی پلیٹ میں بھی ڈالتے رہے تھے۔ اپنی یہاں آمد کے بعد شاید یہ پہلا دن تھا جس نے اس قدر شکم سیر ہو کر کھایا ہو۔ ہر وقت ذہن پر چھائی رہنے والی ٹینشن نے اس کی بھوک ہی ماردی تھی۔

"اوکے ڈیئر.....! تم اب ریسٹ کرو۔ مجھے حنیر کے ساتھ مل کر کچھ کام کرنا ہے۔" کھانے کے بعد وہ بائیں ہاتھ سے اس کا رُخسار تھپتھپاتے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپا.....! پلیز میرے کمرے میں دو اسٹرانگ سی چائے بھجوا دیں۔"

وریشہ، پھپھو کے ہونٹوں پر پھیلتی اثباتی مسکراہٹ کو دیکھتی باہر نکل گئی۔ اس وقت سونے کو قطعی موڈ نہیں تھا۔ سو وہ حویلی کے پائیں باغ میں جا پہنچی۔ ناریل، انار، آم اور کے درختوں کے علاوہ یہاں بہت سے پھولوں کے پودے بھی موجود تھے۔ درختوں پر گئے گھونسلوں میں رہنے والے پرندوں کی ہلکی ہلکی آوازیں اور ہوا سے آپس میں ٹکرا کر نے والی پتوں کی سرسراہٹ ماحول میں کوئی مدھر سا جادو جگا رہی تھی۔

کچھ دیر پھولوں کے کنج کے پاس ٹہلنے کے بعد وہ ایک سنگی بنچ پر جا بیٹھی تھی کہ اپنی پر سے سنائی دینے والی دھیمی آوازوں نے اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کیا۔ وہاں کوئی ذی موجود نہیں تھا البتہ کچھ فاصلے پر کچن کی کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ یہاں سنائی دینے والی

آوازیں یقیناً اس کھڑکی کی چوکھٹ پھلانگ کر اس تک پہنچ رہی تھیں۔ اس نے چاہا کہ ا
دھیان ہٹالے مگر پھر اپنا نام سن کر ٹھٹک گئی۔

"وریشہ بی بی کتنی سوہنی ہیں ناں اماں.....!" یہ یقیناً صغریٰ تھی۔

"اچھا جا زیادہ باتیں نہ بنا اور یہ چائے لے کر کمال صاحب کے کمرے میں د
آ۔" صابرہ بی نے اسے گھرکا۔

"خوبصورت تو ہونا ہی ہے۔ سارے نین نقش ماں کے چرائے ہیں۔" صغریٰ
ڈانٹ کر چپ کرانے والی اسے باہر بھیج کر اب خود اسے موضوع گفتگو بنائے ہوئے تھی۔ ع
اس کی مخاطب عظمت خالہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

"پر اخلاق ماں جیسے نہیں، انہوں نے تو جیسے کبھی ہمیں ملازم سمجھا ہی نہیں۔"

عظمت خالہ کی بات وریشہ کے لئے گویا ایک انکشاف تھا۔ ممی اور کبھی اتنی با اخلا
بھی رہی ہوں گی کہ لوگ آج تک ان کی تعریفیں کریں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ اس
باقاعدہ کان لگا کر مزید کچھ سننا چاہا مگر شاید ان لوگوں کا کام سمٹ چکا تھا اور ان میں سے
نے ہاتھ بڑھا کر کچن میں ہونے والی گفتگو کو فرار کا راستہ فراہم کرنے والی کھڑکی کے پٹ
کر دیئے تھے۔

☆☆☆

"اس کی مرضی نہیں تو تم کیوں ضد کر رہے ہو.....؟ بچوں کی مرضی کے خلا
ہونے والے فیصلوں کا انجام نہیں جانتے کیا.....؟"

اگلی صبح وہ ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی ہی تھی کہ ایک ملازمہ
اسے ڈیڈی کے فون کی اطلاع دی۔ وہ فون سننے کی غرض سے وہاں پہنچی تو دیکھا دادی ربیع
ہاتھ میں تھامے خفا سے انداز میں بول رہی تھیں۔ دادی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اس لئے
ہی بولیں۔

"لو وریشہ آگئی ہے، پہلے اس سے بات کر لو۔ میں بعد میں آرام سے تم سے با
کروں گی۔"

"السلام علیکم ڈیڈی.....!" وہ دھیرے سے بولی۔

"وعلیکم السلام.....! کیا حال ہے تمہارا.....؟" وہ اپنے ہمیشہ کے نپے تلے انداز
ن پوچھ رہے تھے۔

"ٹھیک ہوں.....!" اس کے منہ سے مری مری آواز نکلی۔ اب تک ممی ہی اسے
ن کر کے ڈانٹتی ڈپٹتی رہی تھیں لیکن اس وقت ڈیڈی کا فون کرنا اسے تشویش میں مبتلا کر رہا
ا۔

"میں نے تمہیں یہ کہنے کے لئے فون کیا تھا کہ اپنا سامان وغیرہ پیک کر لو۔ میں
ج رات آٹھ نو بجے تک حویلی پہنچ جاؤں گا۔ رُکنے کا وقت نہیں ہوگا میرے پاس۔ اس لئے تم
ری رہنا۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ رہے تھے۔

"مگر ڈیڈی.....!" وریشہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"تو اگر مگر، تمہاری ڈیٹ شیٹ آگئی ہے، واپس آکر ایگزام دو۔ اس دوران ہم
ت وحید درانی کے ساتھ بات کر کے تمہاری شادی کے لئے کوئی قریبی تاریخ طے کر لیں
ر۔"

انہوں نے اسے کچھ بھی کہنے کا موقع دیئے بغیر ہی اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔
یشہ ان کے اس انداز پر پہلے تو چند لمحے صدمے سے گنگ بیٹھی رہی مگر پھر اس کے وجود میں
ہ کی شدید لہریں اُٹھنے لگیں۔ قریب بیٹھی دادی یقیناً اس کی کیفیت نوٹ کر رہی تھیں لیکن کچھ
پنے سے قبل ہی زرینہ کی آمد نے ان کی توجہ بانٹ لی۔

"دیکھیں اماں.....! کمال واپس جانے کی ضد کر رہا ہے۔ رات بھر یہ اور حقیر کام
تے رہے ہیں۔ میں کہہ رہی ہوں ایک دو گھنٹے سو لو پھر چلے جانا لیکن یہ مان ہی نہیں رہا۔"
اہر ہی سے بولتی ہوئی آرہی تھیں۔ سید کمال شاہ ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

"دو گھنٹے میں تو میں واپس بھی پہنچ جاؤں گا اور سونے کی آپ فکر نہ کریں۔ راستے
سو لوں گا۔ گاڑی تو ڈرائیور نے ہی چلانی ہے ناں۔" انہوں نے بہن کے کندھے پر بازو
لاتے ہوئے پیار سے انہیں سمجھایا۔

"تم بس اپنی ہی منوایا کرو۔" پھپھو کے انداز میں پیار بھری خفگی تھی۔

"ناراض نہ ہوں اور پلیز جانے سے پہلے مجھے ایک مزیدار سی چائے پلوا دیں۔ بس اب پندرہ بیس منٹ میں میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

وہ لاڈ سے فرمائش کر رہے تھے جبکہ ڈیڈی کی کال سے اُلجھن میں مبتلا دریشہ کے ذہن میں الگ ہی کھچڑی پک رہی تھی۔ وہ ان لوگوں کو باتوں میں مصروف چھوڑ کو کمرے سے باہر نکل آئی۔ اگلے ہی لمحے وہ حنیر اسد کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

"یس کم ان......!" دوسری طرف سے اجازت ملنے پر وہ اندر داخل ہوگئی۔

"تم......؟ خیریت تو ہے......؟" وہ جو الماری سے اپنی شرٹ نکال رہا تھا، اندر آنے والی شخصیت کو دیکھنے کے لئے پلٹا اور اسے سامنے پا کر حیران رہ گیا۔

"وہ...... مجھے آپ سے ایک کام تھا۔" ہاتھوں کی اُنگلیاں آپس میں پھنسائے وہ نروس سی کہنے لگی۔

"ہاں ہاں......! بولیں......!" حنیر نے اسے حوصلہ دیا۔

"مجھے آپ کی گاڑی کی چابی چاہئے۔" وہ اپنے مطلب کی بات ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

"کہاں جانا ہے تمہیں......؟ اگر کہو تو میں لے چلتا ہوں۔" حنیر نے کچھ اُلجھتے ہوئے اسے آفر کی۔

"یقین کریں میں بہت اچھی ڈرائیور ہوں۔ آپ کی گاڑی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"یہ تو خیر میں بھی بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ساتھ لے جانے کی آفر اس لئے کر رہا تھا کہ تم یہاں کے راستوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہوگی۔" اس نے مسکراتے ہوئے وضاحت دی اور پھر سائیڈ ٹیبل کی دراز سے گاڑی کی چابی اور کاغذات نکال کر اسے تھما دیئے۔

"تھینکس......! ویسے گاڑی میں پٹرول تو ہے ناں......؟"

"بے فکر رہو، ٹینکی فل بھری ہوئی ہے اور پھر ہمارا گاؤں ہے ہی کتنا بڑا جس کی سیر

لئے تمہیں گیلنز کے حساب سے پٹرول چاہئے ہو۔"

اس بار اس کے ہونٹوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ بہت واضح تھی۔ دریشہ مطمئن سی ہو واپس پلٹ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے ایک شاپر میں جلدی جلدی اپنے دو تین ے رکھے اور ہینڈ بیگ ساتھ لے کر باہر پورٹیکو میں آ گئی۔ اکا جان کی شاندار بلیک کرولا پیچھے ہی حنیر کی سفید مہران کھڑی تھی۔ اپنا سامان پچھلی سیٹ پر پھینکتے اس نے ڈرائیونگ سنبھالتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گیٹ پر موجود چوکیدار نے اس کے ہارن دینے ا سا پھاٹک پھرتی سے کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر وان تھی۔ وہ بہت بہتر ڈرائیو کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ اکا جان کے حویلی سے نکلنے سے پہلے ہی ؤں سے باہر ہائی وے تک پہنچنا چاہتی تھی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگئی۔

اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچ کر اسے آٹھ دس منٹ ہی انتظار کرنا پڑا تھا کہ اکا جان کی ہ کرولا سبک رفتاری سے اس کے سامنے سے گزری۔ زرینہ پھپھو سے کئے ہوئے وعدے ے مطابق اکا جان سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھے تھے۔ دریشہ نے ا سا وقفہ دے کر اپنی گاڑی ان کی گاڑی کے پیچھے ڈال دی۔

"آپ زبردستی مجھے یہاں سے لے جانا چاہتے تھے ناں۔ اب دیکھتی ہوں آپ ے کیسے ڈھونڈتے ہیں۔ میں ایسی جگہ جا کر چھپ جاؤں گی جہاں آپ کا دھیان بھی نہیں ئے گا۔"

ہونٹ بھینچے گاڑی کا تعاقب کرتی وہ دل ہی دل میں ڈیڈی سے مخاطب تھی۔

دو گھنٹے بعد وہ اکا جان کی گاڑی کے پیچھے پیچھے اپنی مہران کو بھی ایک بڑے سے گھر ے گیٹ کے اندر لے جا رہی تھی۔ حنیر کی جانی پہچانی گاڑی کو دیکھ کر گیٹ کیپر نے اسے اندر نے سے نہیں روکا تھا۔ اس نے مہران اکا جان کی گاڑی کے پیچھے لے جا کر پارک کی۔ اکا ان کے ڈرائیور نے اُتر کر ان کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ بیک وقت وہ اور اکا جان اپنی ی گاڑیوں سے برآمد ہوئے۔ اکا جان اسے وہاں پا کر بری طرح چونکے۔

"تم......! تم یہاں کیسے آئیں......؟"

"آپ کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہوئے۔" پچھلی سیٹ سے اپنا مختصر سا سامان اُٹھاتے ہوئے اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ جواباً اکا جان نے سوالیہ نظروں سے اپنے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

"صاحب......! یہ گاڑی تو گاؤں سے ہی ہمارے پیچھے تھی۔ میں سمجھا حنیر صاحب ہیں۔ آپ سو رہے تھے اس لئے آپ کو نہیں بتایا۔" ڈرائیور کچھ غلط ہو جانے کے احساس کے ساتھ گھبرا کر وضاحت دے رہا تھا۔

"اوکے......! مگر اب کسی کو بی بی کی یہاں آمد کے بارے میں معلوم نہ ہونے دینا۔" انہوں نے قدرے سخت لہجے میں ہدایت دی اور پھر اس سے بولے۔

"آؤ......! اندر چلیں۔"

"تمہاری اس حرکت کا سبب میری سمجھ سے باہر ہے۔ حویلی میں اماں پہلے ہی پریشان ہیں کہ تم اتنے دنوں سے کس لئے وہاں رُکی ہوئی ہو اور اب یہ جاننے کے باوجود کہ تمہارا باپ مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ میرے پیچھے پیچھے یہاں تک آ گئی ہو۔" اسے اپنے ساتھ لئے ایک آرام دہ کمرے میں آ کر بیٹھنے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوئے تھے۔ جواباً اس کی آنکھوں سے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔

"رونا کسی مسئلے کا حل نہیں ہے دریشہ......! اگر تم مجھے اپنا پرابلم بتا دو تو ہو سکتا ہے میں تمہاری کچھ ہیلپ کر سکوں۔" سید کمال شاہ کی سنجیدہ آواز کمرے میں گونجی۔

"ممی اور ڈیڈی میری شادی میری مرضی کے خلاف کرنا چاہتے ہیں، مجھے ان کا فیصلہ منظور نہیں تھا اس لئے میں حویلی سے بھاگ آئی مگر صبح ڈیڈی کا فون آیا تھا کہ وہ رات تک مجھے لینے آ رہے ہیں اور واپس جا کر جلدی ہی میری شادی کی ڈیٹ فکس کر دیں گے۔ ڈیڈی سے بچنے کے لئے میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ کسی ایسی جگہ چلی جاؤں جہاں وہ مجھے تلاش نہ کر سکیں اور اس کام کے لئے آپ کے گھر سے بہتر جگہ اور کون سی ہو سکتی تھی۔ سوری اکا جان......! مگر میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔" وہ سوں سوں کرتی انہیں ساری تفصیل سنا رہی تھی۔

"ممی ڈیڈی کا پسند کیا ہوا رشتہ پسند نہیں تو پھر کہاں شادی کرنا چاہتی ہو......؟"

"کہیں نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔

"میرا مطلب ہے اکا جان......! آپ کوئی ایسی ویسی بات مت سوچیں۔ میرے ... کے پیچھے کوئی پسند ناپسند کا معاملہ نہیں بلکہ ممی ڈیڈی کا پسند کیا ہوا رشتہ ہی ایسا ہے کہ میں کسی ... خود کو ہامی بھرنے کے لئے راضی نہیں کر پا رہی۔" وہ آہستہ آہستہ انہیں وحید درانی کے ... میں تفصیلات بتانے لگی۔ جسے سن کر ان کے ماتھے پر شکنوں کا جال پھیلنے لگا۔

"تمہارا باپ آج بھی اتنا ہی خود غرض ہے، جتنا اب سے بیس بائیس برس پہلے ہوا تھا۔ خیر، تم یہاں آرام سے رہو۔ میں سوچتا ہوں کہ اس سلسلے میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ...۔"

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلی دیتے ہوئے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

حویلی میں عجیب سے سراسیمگی طاری تھی۔ زرینہ کمروں اور برآمدوں کے درمیان ... پھر رہی تھیں اور دادی کے دل کو تو جیسے پنکھے ہوئے تھے۔

تین چار گھنٹے تک تو انہیں دریشہ کے غائب ہونے کا علم ہی نہیں ہو سکا۔ وہ تو جب ... وہ ڈھائی بجے کے قریب سو کر اُٹھا تو اپنی گاڑی موجود نہ پا کر چوکیدار سے معلوم کیا۔ اس ... مطابق دریشہ اکا جان کی روانگی سے پہلے سے نکلی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔

حنیر کو تشویش ہونے لگی اور وہ بنا کسی سے کچھ کہے اسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹے بھاگ دوڑ میں وہ اتنا جاننے میں ضرور کامیاب ہو گیا تھا کہ دریشہ اس کی گاڑی ... گاؤں سے باہر جانے والے راستہ پر جاتی دیکھی گئی ہے۔ وہ اُلجھا اُلجھا سا حویلی لوٹ ... جہاں زرینہ پریشان سی اس کی منتظر تھیں۔

"کہاں چلے گئے تھے حنیر......! دریشہ کا بھی کچھ پتا نہیں۔ عظمت خالہ اور صغریٰ ساری حویلی چھان ماری ہے۔" انہوں نے اسے دیکھتے ہی بولنا شروع کر دیا۔

"وہ حویلی میں ہو گی تو آپ کو ملے گی ناں۔" وہ خود پریشان سا ایک صوفے پر بیٹھ

گیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟"

"مطلب یہ والدہ حضور......! کہ آپ کی بھتیجی مجھ غریب کی اکلوتی گاڑی لے کر یہاں سے فرار ہو چکی ہے اور اس وقت یقیناً اپنے شہر واپس پہنچنے والی ہو گی۔"

اس نے انہیں جواب دیتے ہوئے وریشہ کے گاڑی کی چابی مانگنے سے لے کر اپنی تلاش کے نتائج تک ساری تفصیل کہہ سنائی۔

"مگر اسے اس طرح یہاں سے جانے کی ضرورت کیا تھی......؟ وہ ہمیں بتا کر بھی تو جا سکتی تھی بلکہ تم تو خود واپس شہر جانے والے تھے، اگر اسے جانا ہی تھا تو تمہارے ساتھ چلی جاتی۔" وہ حیران سی بول رہی تھیں۔ حنیر جواباً کندھے اُچکا کر رہ گیا۔

"ہائے میرے اللہ......! بچی کو خیریت سے رکھنا۔ جمال......! تجھے اللہ سمجھے۔ ماں باپ کی طرح اولاد کو بھی برباد کرنے پر تلا ہے۔" دادی کے علم میں جیسے ہی ساری بات آئی، انہوں نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔

"کیا مطلب اماں......! کیا کیا ہے جمال بھائی نے......؟" زرینہ نے دہل کر پوچھا۔

"زیادہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔ صبح جمال سے فون پر بات ہوئی تھی۔ اس سے بس اتنا ہی پتا چلا کہ اس نے وریشہ کا رشتہ کہیں طے کر دیا ہے اور وریشہ راضی نہیں، اس لئے روٹھ کر یہاں چلی آئی ہے۔ رات اپنے پہنچنے کا بھی کہہ رہا تھا۔ میں نے سوچا سامنے بیٹھ کر آرام سے ساری بات پوچھوں گی لیکن جانے کیا معاملہ ہے کہ بچی باپ کے آنے کا سن کر اس طرح بھاگ کھڑی ہوئی۔ مجھے یقین ہے وہ واپس گھر نہیں گئی ہو گی۔ گھر جانا ہوتا تو باپ کے آنے کا انتظار کرتی، یوں بھاگ نہ کھڑی ہوتی۔" وہ حالات کا بالکل ٹھیک ٹھیک تجزیہ کرتی بے حد تشویش کا شکار تھیں۔

"مگر اب ہم اسے کہاں تلاش کریں......؟ ہمیں تو اس کی دوستوں وغیرہ کے بارے میں بھی کوئی علم نہیں۔" زرینہ بھی ماں کے ساتھ پریشان تھیں۔

"حنیر بیٹا......! تم تو اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی میں پڑھتے ہو۔ تم اپنے دوستوں یرہ کے ذریعے معلوم کرنے کی کوشش کرو۔" انہوں نے ایک حل پیش کیا۔

"پہلی بات تو یہ ہے امی......! کہ وہ اور میں بالکل الگ الگ ڈپارٹمنٹس میں ہیں۔ ہرے یہ کہ میرے اس طرح سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے سے اس کی ریپوٹیشن ی خراب ہو سکتی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ماموں جان کے آنے کا انتظار کریں۔ وہ خود ہی اس ی تلاش کے لئے کوئی لائحہ عمل طے کر لیں گے۔ ویسے بھی انہیں اندازہ ہو گا کہ وہ یہاں سے ل کر کون سے دوست یا عزیز کے گھر جا سکتی ہے۔"

حنیر نے ماں کو سمجھایا تو وہ اس کی بات سمجھتے ہوئے خاموش ہو گئیں۔

حویلی کی خاموش اور اُداس فضا میں ہلچل سید جمال شاہ کی آمد کے بعد مچی تھی۔ یشہ کے غائب ہونے کا سن کر وہ بری طرح بپھر گئے۔

"میں نے اپنی بیٹی آپ کے پاس بھیجی تھی اماں......! اس کی حفاظت آپ کی ذمہ ری تھی۔ آپ کے یہاں ہوتے آخر وہ اس حویلی سے نکلی کیسے......؟"

"میرے ہونے کی بھی خوب کہی تم نے۔ میرے ہونے سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے......؟ میں تو کبھی تمہیں کسی بات سے نہیں روک پائی، تمہاری اولاد کو کیا خاک روکتی......؟" ہوں نے بیٹے کی خفگی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دوبدو جواب دیا۔

"آخر میں اس پر ایسا کون سا ظلم کا پہاڑ توڑ رہا ہوں۔ اچھے گھرانے میں بیٹی کا شتہ طے کرنا ایسا بھی جرم نہیں کہ وہ مجھے یوں خوار کرے۔" وہ جھنجھلا رہے تھے۔

"وہ تمہاری بیٹی ہے جمال......! پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بزرگوں کے فیصلے کے لاف اپنی من مانی نہ کرے۔" ان کا انداز سرد تھا۔

"آپ کو تو موقع چاہئے مجھے طعنے دینے کا۔" وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑے وئے۔ زرینہ اور حنیر خاموشی سے انہیں حویلی سے نکلتے دیکھنے لگے جبکہ دادی اپنے چہرے کے اثرات چھپائے پان پر کتھا چونا لگانے میں مشغول ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

"اے بیٹی.....! تم نے تو ہماری جان ہی نکال دی تھی۔ یہ سوچ سوچ کر دل دہلتا رہا کہ جانے تم کس حال میں اور کہاں ہوگی.....؟ نفل پڑھ کر اللہ سے تمہاری خیریت کی دُعا مانگتے رہے۔" اگلی صبح وہ دادی اور پھپھو کو اپنے سامنے پا کر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوگئی تھی۔

"آپ کو اکا جان نے میرے یہاں ہونے کا بتایا ہوگا.....؟"

"نہ صرف بتایا ہے بلکہ گاڑی بھیج کر بلوایا بھی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ کچھ اہم کام انجام دینے ہیں۔" دادی نے جواب دیا۔

"دادی.....! کل ڈیڈی آئے ہوں گے ناں۔ کیا کہا انہوں نے مجھے حویلی میں نہ پا کر۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے دادی سے پوچھا۔

"آیا تھا، ہم نے کہہ دیا ہمیں نہیں معلوم کہاں گئی تمہاری بیٹی مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ تم سے ناراض ہو کر گئی ہے۔ اس لئے اب تم خود ہی اسے ڈھونڈو۔" دادی کے انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اسی وقت سید کمال شاہ دستک دے کر اندر چلے آئے۔

"السلام علیکم اکا جان.....!" اس نے فوراً ہی سنجیدگی اختیار کی۔

"وعلیکم السلام.....! اُمید ہے ان لوگوں کو یہاں دیکھ کر تمہیں خوشی محسوس ہوئی ہوگی۔" وہ پاس پڑے سنگل صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"جی اکا جان.....!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"میں نے اماں اور زرینہ آپا کو اس لئے یہاں بلوایا ہے کہ تمہارے معاملے میں کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔ ایک فیصلہ تمہارے پیرنٹس نے کیا تھا جسے ٹھکرا کر تم ہم تک آ گئی ہو۔ تم نے اپنے انکار کی جو وجہ بتائی اسے بالکل درست مانتے ہوئے میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ باقی لوگوں کو میرے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں اور مجھے اُمید ہے کہ جس طرح تم نے پناہ کے لئے مجھ پر اعتبار کیا ہے، اسی طرح مجھے اپنا بزرگ مانتے ہوئے اس سلسلے میں بھی اعتبار کرو گی۔"

"میں سمجھی نہیں اکا جان.....!"

"ہم سب لوگوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ تمہارا نکاح حقیر سے کر دیا جائے۔ تعلیم اور شکل وصورت کے حساب سے تمہارے لئے بالکل موزوں ہے۔ دوسرے جس تم اپنے باپ کے لئے غائب ہوئی ہو، وہ تمہیں تلاش کرنے کے لئے قانون کا سہارا بھی سکتے ہیں۔ اگر انہیں پتہ چلا کہ تم یہاں میرے گھر میں چھپی ہوئی ہو تو ان کا غصہ کئی گنا لتا ہے۔ میرا تو وہ خیر کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن تمہاری مشکلات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ وہ تمہاری شادی وحید درانی سے کر دیں گے۔ البتہ اگر تم حقیر سے نکاح کر لیتی ہو تو ایسی میں وہ تمہیں تلاش کر لینے کے باوجود کم از کم تمہاری شادی اپنی مرضی سے نہیں کر سکیں

وہ دم بخود ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے باپ سے اپنی دشمنی نکالنے کے لئے تمہیں ل کر رہا ہوں۔ حقیر ایک نہایت بہترین لڑکا ہے اور اگر میری اپنی سگی بیٹی بھی تمہاری جگہ تو اس کے لئے میرا انتخاب یہی ہوتا۔"

"مجھے آپ پہ اعتبار ہے اکا جان.....!" اس نے لمحوں میں سر جھکائے ہوئے اپنا سنا ڈالا۔

"جیتی رہو بیٹی.....!" دادی اور پھپھو اس کی بلائیں لینے لگیں۔

"چلیں اماں.....! ڈرائیور کے ساتھ بازار چلتے ہیں۔ میں اپنی بہو کے لئے کچھ اری تو کر لوں۔ کمال نے کہہ دیا تھا کہ اگر ریشہ نے ہاں کہی تو شام کو ہی نکاح کی رسم ادا یں گے۔ اب وقت ہی کتنا بچا ہے۔" پھپھو نے دادی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کھڑا کر دیا تھا۔

"ارے بھئی.....! ذرا چھری تلے دم تو لینے دو۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم نہیں ایل چھیلی بنی تمہارے ساتھ بھاگتی پھروں۔" دادی مستقل احتجاج کر رہی تھیں لیکن پھپھو ابھی سنے بغیر ان کا ہاتھ پکڑے پکڑے انہیں باہر لے گئی تھیں۔

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں وریشہ.....! تم اس دُنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی ہو حقیر جیسے لڑکے اور اتنی محبت کرنے والے لوگوں کا ساتھ جس لڑکی کو ملے، اس کی خوش قسمتی

پہ کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔" اپنی روشن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے اکا جان نے کہا اور پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے پلٹنے ہی لگے تھے کہ جیسے کچھ یاد آ جانے پر رُک کر بولے۔

"حنیر نے بزرگوں کے فیصلے کو بنا کسی جھجک کے قبول کیا ہے لیکن وہ نکاح سے پہلے تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے اجازت دے دی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ تمہارے پاس آئے گا۔"

"جی......!" وہ فقط اتنا ہی کہہ سکی۔ اسے خود بھی اپنے رویے پر حیرت تھی۔ وہاں اپنے گھر میں اس کی بات بات پر ممی سے بحث ہوتی تھی اور یہاں وہ بنا چوں چرا کئے سر جھکاتی جا رہی تھی۔

"آ جائیں......!" تھوڑی دیر بعد دروازے پر اُبھرنے والی دستک کا جواب دے کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ حسب توقع آنے والا حنیر اسد ہی تھا۔ وریشہ نے ذرا کی ذرا اس پر نظر ڈالی۔

بلیک جینز پر اس نے بلیک اور وائٹ لائننگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ مضبوط کاٹھی کا ایک دراز قد لڑکا تھا جس کی روشن آنکھیں یقیناً اکا جان سے مشابہ تھیں۔ حنیر اسد سے بارہا سامنا ہونے کے باوجود وہ اس کی شخصیت کے یہ رنگ آج سے پہلے محسوس نہیں کر سکی تھی۔ وجہ یقیناً اس کی بے نیاز فطرت اور رشتہ داروں سے عدم دلچسپی تھی۔

"میری اس طرح ملاقات کی خواہش کو اُمید ہے کہ آپ نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا......؟" سامنے پڑے صوفے پر بیٹھتے اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جی نہیں......!" وریشہ نے نظر جھکا کر مختصراً جواب دیا۔ رشتے اس طرح ایمرجنسی میں طے نہیں کئے جاتے لیکن کیونکہ یہ فیصلہ اکا جان کا ہے، اس لئے میرے پاس اس کو قبول کرنے کے سوا کوئی گنجائش نہیں۔ اکا جان نے زندگی میں اب تک میرے لئے جو بھی فیصلے کئے، وہ ہمیشہ میرے حق میں بہتر ثابت ہوئے۔ مجھے اس فیصلے کے بارے میں بھی یہی اُمید ہے لیکن چونکہ تم اس معاملے کی سب سے اہم فریق ہو، اس لئے میں چاہتا ہوں۔ تم میرے بارے میں وہ تمام بنیادی باتیں جان لو جن کا ہمارے مستقبل پر کسی بھی طرح اثر پڑ سکتا ہے۔"

ذرا سا رُک کر وریشہ کو دیکھنے لگا۔ وریشہ نے نظر اُٹھا کر اسے اپنے متوجہ ہونے کا عندیہ دیا۔

"میرے بابا، جب میں بہت چھوٹا تھا تب ہی اس دُنیا سے چلے گئے تھے۔ امی کے ساتھ وہی ہوا جو عموماً جاگیرداروں اور زمینداروں کی بہوؤں کے ساتھ ہوتا ہے۔ میرے ددھیال والوں نے بابا کے بعد اس شرط پر مجھے امی کے حوالے کیا کہ وہ جائیداد میں بابا کے حصے سے دستبردار ہو جائیں گی۔ امی کے لئے سب سے بڑی دولت میں تھا، اس لئے انہوں نے یہ شرط مان لی۔ نانا جان کے ہاں میرے لئے کچھ کمی نہیں تھی لیکن پھر جلد ہی یہاں کے حالات بھی پلٹ گئے۔ نانا نے اپنی تینوں اولادوں میں جائیداد تقسیم کر دی۔ دونوں ماموں چونکہ کاروبار کرنے اور شہروں میں رہنے کا ارادہ رکھتے تھے، اس لئے نانا نے حویلی امی کے نام کر دی کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ یہ حویلی ہمیشہ آباد رہے۔ حویلی امی کے حصے میں آنے کی وجہ سے امی کو زمینوں میں بہت کم حصہ مل سکا۔ جمال ماموں اور اکا جان نے اپنے اپنے حصے کی زمینیں فروخت کر کے اپنے پسند کے شہروں میں رہائش اختیار کر لی۔ زمینوں سے ہونے والی آمدنی بس اتنی ہے کہ حویلی کی روایات کو قائم رکھا جا سکے۔ جدی پشتی ملازمین کے اخراجات اور مہمانداری کے تقاضوں کو پورا کرنا کچھ ایسا آسان نہیں ہے، البتہ اکا جان وقتاً فوقتاً نانی جان کو اس سلسلے میں رقم فراہم کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے حویلی کی شان آج بھی قائم ہے۔ یہ باتیں تمہیں بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ تم پر میری حیثیت واضح ہو سکے۔ لوگوں کے عمومی تاثر کے برخلاف میں کوئی لینڈ لارڈ نہیں جس کی بیوی زندگی کے ہر لمحے سے مسرت کشید کرتی ہے۔ میری بیوی کو میری ماں کی طرح ہی حویلی کی روایات نبھاتے ہوئے زندگی گزارنی ہوگی۔ جہاں تک میری ذاتی حیثیت کی بات ہے، میرے پاس مستقبل قریب میں ملنے والی ڈگری اور اس ڈگری کے بل بوتے پر اکا جان کی فیکٹری میں ایک اچھی پوسٹ کے حصول کی اُمید کے سوا فی الحال کچھ نہیں۔ ہاں پہلے ایک چھوٹی سی گاڑی بھی ہوا کرتی تھی لیکن اسے بھی کوئی باذوق اغواء کر کے لے گیا۔" وہ خفیف سا مسکرایا۔

"کوئی اغواء نہیں کیا۔ باقاعدہ پرمیشن کے بعد آپ کی گاڑی کو ہاتھ لگایا تھا۔" وہ ذرا ہی تنک کر بولی۔

"خیر، اگر اس ساری گفتگو کے بعد بھی تمہیں شام کو ہونے والی تقریب پر کوئی اعتراض نہ ہوا تو اس گاڑی سمیت میں اور میرا سب کچھ تمہارا ہی ہوگا جس کے لئے تمہیں مجھ سے، کسی بھی قسم کی پرمیشن لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

وہ ایک بار پھر تھوڑا شوخ ہوا تھا۔ یقیناً وریشہ کا نرم انداز اور جھکی نگاہیں اسے ایسا کرنے پر اُکسا رہی تھیں۔

"اچھا پھر چلتا ہوں، تمہارے پاس فیصلے کے لئے زیادہ وقت نہیں جو بھی طے کرو، مجھے فوراً بتا دینا۔ میں تم پر کوئی جبر نہیں ہونے دوں گا۔" وہ واپسی کے لئے پلٹا ہی تھا کہ وریشہ نے اسے پکارا۔

"حنیر......!"

"ارشاد......!"

"آپ اکا جان کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتے، اس لئے کہ آپ کے تجربات نے آپ پر ثابت کیا ہے کہ ان کا ہر فیصلہ آپ کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ میں ان کو ہمیشہ سے نہیں جانتی، نہ میں نے پہلے کبھی انہیں آزمایا ہے لیکن میرا دل کہتا ہے، میں ان کی بات مان لوں۔ بغیر سود و زیاں کے حساب لگائے۔"

"تھینکس......!" اس نے وریشہ کی آنکھوں میں جھانک کر کہا تو وہ بے ساختہ ہی آنکھوں پر پلکوں کی جھالر گرا گئی۔

☆☆☆

"اتنی بڑی جیولری پھپھو......!" پھپھو نے عروسی جوڑے کے ساتھ گولڈ کے سیٹ کا ایک ڈبہ اس کے سامنے رکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

"کیوں......؟ اچھا نہیں لگا......؟" پھپھو اس کی حیرت کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھنے لگیں۔

"نہیں، ہے تو بہت خوبصورت۔ بس ذرا بڑی زیادہ ہے۔" اس نے پوری سچائی کے ساتھ جواب دیا۔

"جو بھی ہے آج تو تمہیں یہی پہننا ہوگا۔ تمہاری ماں نے برسوں سے تمہاری شادی کے لئے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔"

"رئیلی......! امی سے مجھے ایسی ٹپیکل ماؤں والی کسی حرکت کی اُمید تو نہیں تھی۔" وہ سیٹ کے ساتھ کا بھاری کنگن اپنی کلائی میں پہن کر دیکھتے ہوئے مزید حیران ہوئی۔

"اچھا......! تم جا کر غسل وغیرہ کر لو پھر تیار ہو جانا۔ ویسے تو ابھی فی الحال نکاح ہی ہوگا۔ رُخصتی حنیر کے امتحانوں کے بعد رکھیں گے لیکن ہم لوگوں کے کچھ ارمان ہیں اور پھر کمال نے اپنے ایک دو قریبی دوستوں کو بھی ان کی بیگمات کے ساتھ دعوت دے دی ہے۔ دُلہن بنی سنوری نہ ہوئی تو لوگ سمجھیں گے، زبردستی کا نکاح پڑھایا جا رہا ہے۔" پھپھو نے اسے ہدایت دیتے ہوئے تھوڑا سا چھیڑا تو اس کے رُخساروں پر سرخی سی دوڑ گئی۔

"پھپھو......! میں ایک بات سوچ رہی تھی۔" وہ غسل کر کے آئی تو پھپھو اس کے گیلے بال سلجھانے لگیں۔

"وہ کیا بھئی......!" انہوں نے اس کا استری شدہ سوٹ ملازمہ کو صوفے کی پشت پر پھیلا کر رکھنے کا اشارہ کرتے بے خیالی میں پوچھا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ میں کل سے یہاں ہوں۔ اکا جان کی طرف سے وی آئی پی مہمانوں والا پروٹوکول بھی مل رہا ہے لیکن اکا جان کی فیملی کا کوئی ممبر ابھی تک مجھ سے آ کر نہیں ملا۔ کیا ان کے اور ڈیڈی کے آپس کے اختلافات کی وجہ سے......؟"

"نہیں......! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس مجھے تمہیں بتانے کا خیال نہیں رہا۔ اصل میں کمال کی بیوی دو دن سے مری گئی ہوئی ہے اپنے بیٹے سے ملنے۔ وہ وہاں ہاسٹل میں رہتا ہے ناں۔ پڑھائی کے سخت شیڈول کی وجہ سے گھر زیادہ نہیں آ سکتا تو اس کی ماں خود ہی جا کر مل آتی ہے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے، ورنہ میں سوچ رہی تھی اتنے نائس اکا جان کی مسز کتنی بداخلاق ہیں جو گھر آئے مہمان سے ملنا بھی گوارا نہیں کرتیں۔" اس نے پھپھو کے جواب پر اطمینان کا سانس لیا۔

"بال ڈرائیر سے سکھا کر کپڑے چینج کر لو۔ میں حنیر کو جا کر دیکھتی ہوں کہ اس نے بھی کوئی تیاری ویاری کی یا ابھی تک وہی موٹی جینز پہنے گھوم رہا ہے۔" پھپھو اسے ہدایت دیتی باہر نکل گئیں۔

"یہ وہ لوگ ہیں ممی.....! جن سے آپ نے ہم لوگوں کو ہمیشہ دور ہی رکھا جن کی خودغرضیوں اور چالاکیوں کی داستانیں سنا سنا کر آپ نے ہمارے دلوں میں بدگمانی ڈال دی لیکن اب ان کے ساتھ ان کے درمیان رہ کر پتہ چلا ہے کہ یہ کتنے سادہ اور پرخلوص لوگ ہیں۔ آپ کے ساتھ اگر انہوں نے کچھ برا کیا بھی ہو تو اب آپ کی بیٹی کو یہاں سے اتنا پیار مل رہا ہے کہ ان کی ہر غلطی قابل معافی ہے۔" پھپھو کی ہدایات پر عمل کرتے وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔

"وریشہ.....! یہ کمال کے دوست کی بیگم ہیں۔ میک اَپ کا کورس کر رکھا ہے۔ کہہ رہی ہیں، تمہیں تیار کر دیں گی۔" تھوڑی دیر بعد پھپھو ایک اسمارٹ سی خاتون کو اپنے ساتھ لئے چلی آئیں۔ وریشہ نے انہیں سلام کرتے سکھ کا سانس لیا۔ اصل میں تو خود اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس قسم کی تیاری کرے۔ ایک دلہن کے لئے جس قسم کا سنگھار مطلوب ہوتا ہے، اسے اپنے ہاتھوں کرتے شرم سی محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ تو بہت کیوٹ ہے، بس ہلکے سے فچر دوں گی تو بھی کام چل جائے گا۔ ویسے تو بغیر میک اَپ بھی اس پر یہ لباس بہت جچ رہا ہے۔" آنے والی خاتون نے بے ساختہ ہی اس کی تعریف کی۔

"ماشاء اللہ.....! اللہ سدا اسے یوں ہی رکھے۔" پھپھو نے فوراً ہی اسے دُعا دی۔ اس کی سنہری رنگت پر میرون کامدار شرارہ واقعی بہت جچ رہا تھا۔

"مجھے تو لگتا ہے تمہارا یہ روپ دیکھ کر تمہارا دُولہا نکاح کے ساتھ ساتھ رخصتی پر بھی اصرار کرنے لگے گا۔" اپنے دعوے کے مطابق انہوں نے اسے منٹوں میں تیار کر دیا تھا اور آئینہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ بے حد حسین لگ رہی ہے۔

"صاحب کہہ رہے ہیں بی بی کو نیچے لے آئیں۔ قاضی صاحب پہنچ چکے ہیں۔"

ملازمہ نے آ کر اطلاع دی تو وہ خاتون اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر لے گئیں۔ سیڑھیاں اُترتے اس کی نگاہ سب سے پہلے قاضی صاحب پر پڑی۔ اسے اپنے قدم ڈگمگاتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ وہ ممی ڈیڈی کی مرضی کے خلاف کرنے جا رہی تھی۔

"چلو بیٹا.....! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" اکا جان نے شاید اس کی کیفیت جانچ لی تھی۔ اس لئے لپک کر اس کے قریب آئے اور اسے اپنے بازو کے حصار میں لے لیا۔ وریشہ کو اپنے لرزتے دل میں اطمینان سا اُترتا محسوس ہوا۔ اکا جان کے بازو کے حصار میں وہ قدرے اعتماد سے چلتی اس صوفے تک آئی تھی جس کے ایک طرف وادی پہلے ہی سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہاں اس وقت گھر والوں اور ملازمین سمیت پندرہ سے بیس افراد موجود تھے۔ یقیناً سامنے نظر آنے والے چہرے اکا جان کے دوست اور واقف کار تھے۔

اس کے وہاں آ کر بیٹھتے ہی نکاح کی کارروائی شروع ہو گئی تھی۔ اس کا اپنے نکاح نامے پر سائن کرنا، مبارک سلامت کا شور، وادی، پھپھو اور اکا جان کا پیار سب ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ حنیر اسد کو اس کے برابر میں بٹھا کر تصویریں کھینچی جانے لگیں، تب بھی وہ یونہی خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی رہی۔

"آپا.....! میں اسے اوپر کمرے میں پہنچا رہا ہوں۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہو گی۔" آخر ایک بار پھر اکا جان ہی اس کی مدد کو آگے بڑھے تھے۔

"میں جانتا ہوں، یہ جو کچھ ہوا ہے تمہارے لئے بہت اچانک ہے مگر اتنا یقین کر لو کہ جو ہوا ہے بہت اچھا ہوا ہے۔" وہ اسی طرح اسے اپنے بازو کے حصار میں لئے اس کے لئے مخصوص کمرے تک لائے تھے۔

"اکا جان.....! کاش میں ڈیڈی کے بجائے آپ کی بیٹی ہوتی۔" وہ یکدم ہی ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"تم اب بھی میری ہی بیٹی ہو وریشہ.....!" انہوں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے یقین دلایا۔

"تمہیں زندگی میں جب بھی ضرورت پڑی، تم مجھے اپنے آس پاس ہی پاؤ گی۔" اس کے نکلتے آنسو انہوں نے اپنے رومال سے صاف کیے تھے۔

"سوری اکا جان......! میں نے آپ کو پریشان کر دیا۔" وہ ذرا سنبھلی تو شرمندگی سے معذرت کرنے لگی۔

"اپنی بیٹی کی آنکھ سے آنسو پونچھنے میں پریشانی کیسی......؟" انہوں نے اسے مسکرا کر تسلی دی۔

"اچھا ایسا کرو، تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔ میں جب تک مہمانوں کو دیکھتا ہوں۔" اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ وریشہ نے تکیہ اونچا کر کے رکھا اور بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ چند لمحے ہی گزرے تھے اس طرح بیٹھے کہ سائیڈ پر رکھا انٹرکام بج اٹھا۔

"جی......!" اس نے یونہی بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔

"ابھی چینج مت کرنا، خنیر تمہارے پاس آ رہا ہے۔" نرم سی آواز میں اسے ہدایت دے کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ وہ جو کافی ریلیکس ہو کر بیٹھ گئی تھی، ایک دم سے حساس ہو گئی۔ تین چار منٹ کے وقفے سے اسے باہر مردانہ جوتوں کی چاپ سنائی دی اور پھر دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ آنے والے نے اس بار دستک دے کر اجازت نہیں لی تھی کہ اب وہ سارے حقوق اپنے نام لکھوا کر آ رہا تھا۔

"سوچا جانے سے پہلے تمہیں خدا حافظ کہہ دوں اور اگر تم کوئی پیغام اپنے میکے بھجوانا چاہو تو اس بارے میں بھی پوچھ لوں۔" وہ بیڈ پر اس سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں اس وقت بھی اپنے میکے میں ہی موجود ہوں۔" اس نے جتایا۔

"اوہ......! پھر ایسا کرتے ہیں امی سے کہتا ہوں آج ہی رخصتی کروا لیں۔ آپ کی بھتیجی سسرال جانے کو بے چین ہے۔"

"میں نے ایسا کب کہا......؟" اس نے حیران ہو کر پلکیں اٹھائیں۔

"کہنا بھی مت ورنہ جو امتحان دینے جا رہا ہوں، اس سے پہلے ہی ایک امتحان میں ...ا گا۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی گلابی ہتھیلی اپنی مضبوط گرفت میں لے لی۔

"کب جا رہے ہیں آپ......؟" وریشہ نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کے لئے ...ا۔

"بس ایک گھنٹے میں۔"

"اتنی جلدی......!" وہ اس کے بتانے پر بے ساختہ ہی بولی۔

"محترمہ......! آپ خود تو سارے امتحان وغیرہ بھول کر یہاں اطمینان سے بیٹھی ...ں مجھ غریب کو لازماً اس سال ماسٹرز کمپلیٹ کرنا ہے ورنہ اکا جان ہرگز نہیں بخشیں گے۔ ...ا صبح سے وہ میرے ساتھ دامادوں والا سلوک کر رہے ہیں۔"

"ہاں تو اب انہوں نے مجھے اپنی بیٹی جو بنا لیا ہے۔" وہ معصومیت سے بولی تو وہ ...ب تک دیکھنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں......؟" وہ فوراً ہی پزل ہو گئی۔

"دیکھ رہا ہوں وہ لڑکی جو دور سے دیکھنے پر تھوڑی مغرور اور بدمزاج سی لگتی تھی، ...سے کتنی معصوم اور سادہ معلوم ہوتی ہے۔" جواباً اس کی پلکیں رخساروں پر لرز کر رہ گئیں۔ ...لے اپنے ہاتھ میں تھاما اس کا ہاتھ ذرا سا اپنے لبوں سے چھوا اور تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اگر کچھ دیر اور رک گیا تو جا نہیں سکوں گا۔ اس لئے اللہ حافظ......!"

"اللہ حافظ......!" اس کی پشت کی طرف دیکھتے وریشہ کے ہونٹ ذرا سے کپکپائے ...اس نے اس کے لمس سے دہکتے اپنے ہاتھ کی پشت پر لب رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ ان ...یں اس کا دل ہر طرح کے اندیشے سے آزاد ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"یس کم آن......!" دروازے پر ہونے والی دستک پر اس نے ہاتھ میں پکڑی ...ے سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ نکاح کے بعد اکا جان نے اسے مصلحتاً اپنے پاس ...یا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ حویلی جانے کی صورت میں ڈیڈی سے اس کی موجودگی چھپی

نہیں رہے گی اور وہ فی الحال حنیر کے امتحانوں سے فارغ ہونے تک اس مسئلے کو دبائے
چاہتے تھے تاکہ وہ سکون سے امتحان دے سکے۔ اکیلے اتنے بڑے گھر میں وقت گزارنا
کے لئے مشکل ہو رہا تھا، اس لئے وہ زیادہ وقت اکا جان کی لائبریری میں موجود کتابیں پڑھ
گزار رہی تھی۔ اکا جان دن بھر اپنی فیکٹری میں ہوتے تھے۔ اس سے ان کی ملاقات صبح
ناشتے اور رات کے کھانے پر ہی ہو پاتی تھی۔ ان کی بیگم ابھی تک واپس نہیں آئی تھیں
ملازم سب اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ پھپھو البتہ ہر روز دن میں ایک بار ضرور ہی فون
کے اس کی خیریت معلوم کر لیتی تھیں۔

"السلام علیکم.....! آئی ایم سید علی کمال شاہ۔" ولید کے ہم عمر اس لڑکے
اکا جان کی شباہت اتنی واضح تھی کہ اگر وہ اپنا تعارف نہ بھی کرواتا تو دریشہ اسے بآسانی
لیتی۔

"تو آپ ہیں ہماری سویٹ کزن پلس بھابی۔" وہ بہت اشتیاق سے اسے دیکھ
تھا۔

"تم کیسے آئے.....؟ میرا مطلب ہے پھپھو نے بتایا تھا کہ تمہاری پڑھائی
ف ہے، اس لئے تم گھر بہت کم آتے ہو۔" دریشہ نے پوچھنے کے ساتھ وضاحت بھی کی۔

"شی از رائٹ.....! مگر جب پاپا نے بتایا کہ ہمارے گھر میری ایک کزن رُکی
ہیں اور کزن بھی وہ جن کا نکاح حنیر بھائی سے ہوا ہے تو میں ضد کر کے یہاں آ گیا۔ پاپا
آپ کے نکاح کی تصویریں بھی بھجوائی تھیں۔ رئیلی آپ کا اور حنیر بھائی کا کپل بہت
ہے۔ ممی تو دن میں کئی بار وہ تصویریں دیکھا کرتی ہیں۔ اصل میں حنیر بھائی ان کے
لاڈلے ہیں۔ سم ٹائم تو مجھے ان سے جیلسی فیل ہونے لگتی ہے۔"

اکا جان کے سنجیدہ اور ٹھہرے ہوئے انداز کے برخلاف وہ کافی باتونی اور
محسوس ہو رہا تھا۔

"آنٹی واپس آ گئی ہیں۔ چلو پہلے میں ان سے مل لوں پھر آرام سے تمہارے سا
گپ شپ کروں گی۔" دریشہ اس کی گفتگو سے نتیجہ اخذ کرتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"لیکن ممی تو گھر پر نہیں ہیں۔ مجھے یہاں ڈراپ کر کے وہ سیدھی حویلی چلی گئی
شاید انہیں وہاں پر کوئی ضروری کام ہے۔" وہ جو بہت جوش سے کھڑی ہوئی تھی، مایوس
ہ بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا.....؟ آپ کو اچھا نہیں لگا.....؟" علی نے اس کے چہرے کے تاثرات
ازہ لگایا۔

"نہیں.....! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس اصل میں ابھی تک ان سے ملی نہیں ہوں
اس لئے بہت بے چینی ہے۔ جب سے آئی ہوں وہ تمہارے ہی پاس تھیں۔"

"اچھا.....! لیکن میں تو سمجھا تھا کہ وہ آپ کے نکاح میں شرکت کر کے میرے
لی ہیں۔ آئی تھنک بیس بائیس دن تو گزر چکے ہیں اس ایونٹ کو اور ممی تو صرف پندرہ دن
رے ساتھ تھیں۔ مے بی میری طرف آنے سے پہلے انہوں نے اپنی کسی دوست وغیرہ
اسے کیا ہو۔" وہ پہلے حیران ہوا اور پھر خود ہی اندازہ بھی لگا لیا۔ دریشہ کیا کہہ سکتی تھی،
نے صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"آپ اُداس نہیں ہوں، ممی حویلی میں زیادہ لمبے عرصے اسٹے نہیں کرتیں۔ وہ جلد
ں گی۔ ویسے بھی جب تک میں یہاں موجود ہوں، آپ کو بالکل بھی بوریت نہیں ہوگی۔"
نہایت ذہین بچہ تھا جو اس کے جذبات کا بالکل صحیح صحیح اندازہ لگا تا اسے تسلی دے رہا

"او کے سر.....!" دریشہ نے اس کے خلوص سے متاثر ہو کر بہت جوش سے کہا۔
ی لمحے وہ ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

☆☆☆

"بی بی.....! آپ کے لئے صاحب کا فون ہے۔" وہ علی کے ساتھ لان میں بیٹھی
ی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ ملازمہ ہاتھ میں کارڈلیس لئے چلی آئی۔

"السلام علیکم اکا جان.....!" اس نے ملازمہ کے ہاتھ سے کارڈلیس لے کر کہا۔

"وعلیکم السلام.....! کیا کر رہی ہو.....؟" انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے

پوچھا۔

"کچھ نہیں اکا جان.....! بس یہ علی کے ساتھ بیٹھی اس سے اس کے اسکول کے قصے سن رہی تھی۔" اس نے خوشگوار موڈ میں بتایا۔

"اچھا.....! اب ایسا کرو کہ تیار ہو جاؤ۔ میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ حویلی چلنا ہوگا۔"

"خیریت اکا جان.....!" ان کا حکم سن کر وہ گھبرا اٹھی۔

"ہاں ہاں.....! بالکل خیریت ہے۔ تم پریشان نہ ہو اور آرام سے تیار ہو۔ میں گھر آ کر تمہیں سب بتا دوں گا۔" انہوں نے اسے تسلی دے کر فون بند کر دیا۔

"کیا ہوا.....؟" علی نے اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

"اکا جان کہہ رہے ہیں، مجھے ابھی تھوڑی دیر میں ان کے ساتھ حویلی جانا ہوگا۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے.....؟ بالآخر حویلی ہی آپ کا ٹھکانہ ہے۔" اس کے بتانے پر علی نے اسے چھیڑا۔

"مگر علی.....! اتنا اچانک کیوں.....؟ صبح تو اکا جان نے کچھ نہیں کہا تھا۔" اس کی پریشانی بدستور قائم تھی۔

"آپ پاپا کو جانتی نہیں ہیں، وہ سارے کام ایسے ہی کرتے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں اور جا کر تیار ہو جائیں۔" وہ اس سے بہت چھوٹا ہو کر بھی اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ بالآخر اٹھ کھڑی ہوئی جو بھی مسئلہ تھا، اب اس کا سامنا کرنا ہی تھا۔

"دریشہ آپی.....! پاپا آ گئے ہیں۔ اگر آپ تیار ہو چکی ہیں تو پلیز باہر آ جائیں۔ پاپا باہر گاڑی میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" آدھے گھنٹے سے بھی پہلے علی نے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر اسے پکارا۔ دریشہ تیار ہو چکی تھی۔ سو اپنا ہینڈ بیگ لے کر باہر آ گئی۔

"بی بریو۔" علی اس کا ہاتھ تھام کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ دریشہ نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بظاہر اکا جان سے مختلف مزاج کا مالک لگتا تھا لیکن دوسروں کی فیلنگز سمجھ کر سہارا دینے کا انداز بالکل ان ہی جیسا تھا۔

"علی.....! تم اپنی تیاری رکھو، کل صبح ڈرائیور تمہیں تمہارے اسکول چھوڑ کر آئے گا۔ دریشہ حویلی جا رہی ہے، اس لئے تمہارے یہاں مزید رُکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی تمہاری اسٹڈیز کا حرج ہو رہا ہے۔"

اکا صاحب باہر گاڑی کے قریب ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے دریشہ کے ساتھ کھڑے علی کو حکم دیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ یقیناً ڈرائیور کو چھٹی کی وجہ سے چھوڑ کر جا رہے تھے۔

"او کے پاپا.....!" علی نے تابعداری سے جواب دیا۔

وہ علی کو اللہ حافظ کہتی گاڑی میں جا بیٹھی۔

"اکا جان.....! اب تو بتا دیں کہ کیا بات ہے.....؟" گھر سے تھوڑا آگے جا کر دریشہ نے پوچھا۔

"وہ وقت آ گیا ہے جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔ حقیر کے ایگزامز ختم ہو گئے ہیں، وہ حویلی واپس پہنچ چکا ہے۔ تمہارے معاملے میں میں نے اب تک اسی لئے خاموشی اختیار کر رکھی تھی کہ وہ اطمینان سے پیپرز دے سکے، ورنہ تمہارے باپ نے حویلی فون کر کر کے اماں اور آپا کے کان کھا رکھے تھے کہ میری بیٹی کا پتہ بتائیں۔ میں نے ان کا مسئلہ حل کر دیا۔ تمہارے اور حقیر کے نکاح کی تصویریں اور نکاح نامے کی نقل انہیں بھجوا دی تھی جواب میں اس وقت وہ اپنی بیٹی کے ساتھ حویلی میں موجود ہیں اور الزام لگا رہے ہیں کہ ہم نے ان کی بیٹی پر زبردستی کر کے یہ نکاح کروایا ہے۔ اب تم میرے ساتھ چل کر ان کے سامنے خود اپنی زبان سے بتا دو کہ جو کچھ ہوا اس میں تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی گئی۔ یہ نکاح سو فیصد تمہاری رضامندی سے ہوا ہے۔"

وہ قدرے سپاٹ لہجے میں بتا رہے تھے۔ دریشہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ امتحان کی گھڑی سر پر آ پہنچی تھی۔

☆☆☆

"تو یہ تم ہو جس نے مجھ سے بدلہ لینے کے لئے میری بیٹی کے ساتھ زبردستی کی

ہے۔" وہ جیسے ہی حویلی کے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ جمال صاحب اس کے ساتھ آتے کمال صاحب کو دیکھ کر چیخے۔

"میں نے آپ کی بیٹی کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی۔ زبردستی وہ تھی جو آپ اس کے ساتھ کر رہے تھے اور جس سے گھبرا کر یہ ہم لوگوں کے پاس بھاگ آئی تھی۔" سید کمال شاہ نے ان کے غصے کو خاطر میں نہ لاتے اطمینان سے جواب دیا۔

"اس سے تو میں بعد میں پوچھوں گا لیکن پہلے آپ مجھے بتائیں اماں......! آپ نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیوں کیا......؟ میں سارے شہر میں وریشہ کو ڈھونڈتا رہا اور آپ مجھے کچھ بتانے کے بجائے آرام سے بیٹھی تماشا دیکھتی رہیں......؟" انہوں نے پلٹ کر ماں سے شکوہ کیا۔

"اگر پہلے تمہیں یہ سب بتا دیا ہوتا تو جو ہنگامہ تم نے آج مچا رکھا ہے، پہلے ہی مچا دیتے اور ہمیں اپنے بچے کی بھلائی کا خیال تھا۔ ان بکھیڑوں میں پڑ کر وہ صحیح سے امتحان نہ دے پاتا۔"

"نواسے کا بہت خیال ہے اور پوتی جو سرے سے امتحان ہی نہیں دے سکی، اس کی کوئی فکر نہیں......؟" دادی کے جواب پر ممی نے طنز کیا۔

"بڑے نقصان سے بچنے کے لئے کبھی کبھی چھوٹے نقصان کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ امتحان کا کیا ہے، اگلی بار دے دے گی لیکن اگر تمہارے ہاتھ لگ جاتی تو تم لوگ پیسے کی خاطر اس کی زندگی برباد کر کے رکھ دیتے۔" ان کا انداز سرد تھا۔

"آپ لوگ سمجھتے کیا ہیں......؟ میں اس نکاح کو مان لوں گا......؟ حنیر کو ابھی اسی وقت وریشہ کو طلاق دینی ہوگی۔" سید جمال شاہ ہٹ دھرمی سے بولے۔

"میں نے وریشہ سے نکاح اسے طلاق دینے کے لئے نہیں کیا۔ اس لئے بہتر ہے آپ اس قسم کا کوئی مطالبہ نہ کریں۔" اب تک خاموش بیٹھے حنیر نے مداخلت کی۔

"وہ تو میں دیکھ لوں گا کہ تم کیسے نہیں دیتے ہو طلاق......؟ ایسا حشر کر دیا جائے گا تمہارا کہ دوبارہ وریشہ کا نام نہیں لے سکو گے۔" وہ دھمکیوں پر اتر آئے تھے۔

"چلو وریشہ......!" انہوں نے آگے بڑھ کر وریشہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آپ اسے یہاں سے زبردستی نہیں لے جا سکتے۔" سید کمال شاہ نے آگے بڑھ کر ٹوکا۔

"تم بیچ میں مت آؤ۔ تمہارے خلاف تو میں اغواء اور حبس بے جا کا مقدمہ دائر کر گا۔ آخر تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ تم میری بیٹی کا نکاح میری مرضی کے خلاف کسی سے اؤ......؟" وہ دھاڑنے لگے۔

"کمال کو یہ حق میں نے دیا تھا کیونکہ میں وریشہ کی ماں ہوں اور جتنا حق تمہارا ہے ہی میرا بھی۔"

ایک مدہم اور سرد آواز سید جمال شاہ کی دھاڑ پر حاوی ہو گئی تھی۔ وریشہ نے نظر اٹھا اس عورت کو دیکھا جو اس کی ماں ہونے کا دعویٰ کر رہی تھی۔ سادہ سی شلوار قمیص پہنے بالوں بیچ کی مانگ نکال کر بنائی گئی سیدھی چوٹی اور میک اپ سے پاک چہرہ لئے کھڑی اس ت پر سے اس کی نظریں پھسلتی نک سک سے تیار کھڑی ممی پر جا ٹکیں۔ اس کی نگاہوں میں وال تھا، اس نے ممی کو نظر چرانے پر مجبور کر دیا۔ وریشہ جو اتنے دنوں سے سخت اعصابی تناؤ کار تھی، اس صورت حال پر ڈھے گئی۔ اگر پیچھے کھڑا حنیر اسے سنبھال نہ لیتا تو یقیناً وہ ں پر جا گرتی۔

☆☆☆

"بڑے شاہ صاحب آ گئے ہیں بیگم صاحبہ......!" ملازمہ کے اطلاع دینے پر آمنہ ہشتم پشتم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جانتی تھیں اس وقت انہیں ہی سید سجاد شاہ کو سنبھالنا ہوگا۔

"سلام شاہ صاحب......!" ان کے باہر جانے سے پہلے ہی وہ اندر آ چکے تھے۔ کے ساتھ پانچ سال کی دو ہم شکل بچیاں بھی موجود تھیں۔ آمنہ بیگم ان بچیوں کو اچھی طرح تی تھیں۔ وہ سید سجاد شاہ کے جگری دوست کریم بخش کی جڑواں بیٹیاں تھیں۔ کریم بخش، سجاد اہ کے بچپن کے دوست تھے۔ عام سے گھرانے کے سپوت کریم بخش اور جاگیردار سجاد شاہ کی ستی کا سبب دونوں کی تعلیم میں دلچسپی تھی۔ دونوں نے گاؤں کے اسکول سے پڑھا اور پھر شہر

جا کر ایک ہی کالج سے بی اے بھی کیا۔ بی اے کے بعد سجاد شاہ تو اپنی زمینیں سنبھالنے واپس گاؤں چلے آئے جبکہ کریم بخش نے شہر میں ہی رہائش اختیار کر لی۔ الگ الگ جگہ رہنے سے ملاقاتوں کا سلسلہ تو ضرور کمزور پڑا لیکن دوستی جوں کی توں قائم رہی۔ ایسے ہی اچانک ہی شہر سے کریم بخش اور اس کی بیوی کی موت کی اطلاع آنے پر وہ لوگ دہل کر رہ گئے۔ کریم بخش اور اس کی بیوی روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہوئے تھے۔ بچیاں اس وقت ان کے ساتھ موجود نہیں تھیں، اس لئے بچ گئیں۔

موت کی اطلاع پر آمنہ بیگم اور بچے بھی سجاد شاہ کے ساتھ جنازے میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ آمنہ بیگم اور بچوں کو سجاد شاہ نے اسی روز واپس حویلی بھجوا دیا اور خود وہاں کے معاملات نمٹانے کے لئے رُک گئے۔ اب تین دن بعد ان کی واپسی کریم بخش کی بیٹیوں کے ساتھ ہوئی تھی۔

"آؤ بیٹا.....! میرے پاس آجاؤ۔" آمنہ بیگم نے دونوں ہاتھ بڑھا کر بچیوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ بچیوں کو سینے سے لگاتے ان کی آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں لیکن انہوں نے ضبط سے کام لے کر آنسوؤں کو پیچھے سے روکا۔

"آمنہ.....! سمجھ لینا آج سے تمہارے تین نہیں پانچ بچے ہیں۔ جمال، کمال اور زرینہ کے معاملے میں تم سے کبھی کوئی کوتاہی ہو جائے تو ہو جائے، ان بچیوں کے لئے معمولی بھول چوک بھی نہیں ہونی چاہئے۔ کریم میرا دوست نہیں بھائی تھا۔ میرے ہوتے ہوئے اس کی بچیوں کو اس دُنیا میں کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہونا چاہئے۔" مسہری پر بیٹھتے ہوئے سید سجاد شاہ نے آمنہ بیگم سے کہا۔

"بے فکر رہیں شاہ صاحب.....! آپ کی خواہش میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ کو کبھی مجھ سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" بچیوں کو خود سے لگائے ہوئے ہی آمنہ بیگم نے سید سجاد شاہ کی شدت گریہ سے سرخ ہو جانے والی آنکھوں میں جھانکتے عہد کیا اور حویلی کے در و دیوار گواہ تھے کہ ان سے اپنا وعدہ وفا کرنے میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔

ان کے تینوں بچوں کے ساتھ رہ کر ارمانہ اور رومانہ دونوں بہنوں نے زندگی کی بہ

وہ آسائش حاصل کی جو انہیں اپنے سگے ماں باپ کے ساتھ رہ کر شاید ہی میسر آتی۔ آمنہ بیگم مطمئن تھیں کہ اپنے کاندھوں پر پڑی ذمہ داریاں خوش اُسلوبی سے انجام دے رہی ہیں۔ بس کبھی کبھی ارمانہ کی سرکش اور ضدی طبیعت انہیں اُلجھن میں مبتلا کر دیتی تھی۔ وہ زرینہ اور رومانہ کی طرح ہر بات تابعداری سے قبول کر لینے والی بچی نہیں تھی۔ ہر معاملے میں وہ بزرگوں کی رائے کے بجائے اپنی پسند کو ترجیح دینے کی عادی تھی لیکن بہرحال اس کی اس عادت نے جوانی کی عمر تک پہنچتے پہنچتے بھی کبھی کوئی بڑا مسئلہ کھڑا نہ ہونے دیا۔ آمنہ بیگم کی معاملہ فہم فطرت کا بھی اس سلسلے میں بڑا ہاتھ تھا۔

☆☆☆

"حویلی میں سناٹا سا چھا گیا ہے۔" سید سجاد شاہ اُداسی سے بولے۔

"سناٹا تو ہونا ہی تھا، اِدھر زرینہ کو بیاہا، اُدھر آپ نے کمال کو ملک سے باہر بھیج دیا۔ جمال الگ آئے دن شہر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب بیچاری وہ دو بچیاں کیا ہنگامہ کریں گی.....؟" آمنہ بیگم نے شکوہ کیا۔

"تو ایسا کرو کہ جمال کی شادی کر دو۔ گھر میں بہو آئے گی، پوتا پوتی کھیلیں گے تو حویلی کی رونقیں خود ہی جاگ اُٹھیں گی اور یہ جو جمال میاں کے پیروں میں چکر پڑا ہے، اس کی بھی روک تھام ہوگی۔ بیوی بچوں کی ذمہ داری میں اُلجھ کر خود ہی قید ہو جائیں گے۔" ان کے مشورے پر آمنہ بیگم مسرت سے بولیں۔

"تو پھر کیا رائے ہے آپ کی اس سلسلے میں، کسے بہو بیگم بنائیں گے.....؟"

"بھئی.....! یہ شعبہ تو ہم نے تمہیں دے رکھا ہے جو تمہاری مرضی ہوگی، وہ ہماری خوشی۔" سید سجاد شاہ بہت موڈ میں تھے۔

"اس کا تو مجھے بھی یقین ہے کیونکہ میں نے بہو کے لئے انتخاب ہی ایسا کر رکھا ہے۔" وہ فخریہ مسکرائیں۔

"ہائیں.....! یہ کیا بھئی.....! ابھی تو مجھ سے رائے مانگ رہی تھیں اور اب کہہ رہی ہو کہ بہو کا انتخاب بھی کر چکی ہو۔" سجاد شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جب آپ نے کریم بھائی کی بیٹیاں میرے حوالے کی تھیں، تب ہی میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ان میں سے ایک کو ضرور اپنے جمال کی دلہن بناتا ہے اور اب جب یہ وقت آیا ہے تو میں کہیں اور کیوں دیکھوں.....؟"

"اچھا.....! پھر کون ہے آپ کا انتخاب.....؟ ویسے تو دونوں بچیاں ایک سی ہی ہیں۔" سید سجاد شاہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"صرف شکل میں، عادت و اطوار میں دونوں بالکل جدا ہیں۔ برائی کسی کی نہیں کروں گی کہ دونوں کو میں نے ہی پالا ہے لیکن بہو بنانے کے لئے مجھے رومانہ پسند ہے۔ حویلی کی بڑی بہو کو جیسا ذمہ دار اور سلجھا ہوا ہونا چاہئے، ہماری رومانہ بالکل ویسی ہی ہے۔ ارمانہ کے لئے برداری میں یا باہر کوئی مناسب رشتہ دیکھ لیں گے یا اگر واپس آکر کمال راضی ہوا تو اس کے بارے میں سوچیں گے۔ پانچ چھ مہینے ہی چھوٹا ہوگا کمال ان دونوں بہنوں سے، اتنا فرق تو خیر چل ہی جاتا ہے۔"

"تم تو گویا ہر بات پہلے سے سوچ کر بیٹھی ہو۔" سید سجاد شاہ ہنسے۔

"ماں جو ہوں۔" وہ برا منائے بغیر بولیں۔

"تو پھر دیر کس بات کی ہے.....؟ سارے گاؤں اور برادری میں مٹھائی بٹوا دو کہ ہم نے جمال کا رشتہ رومانہ سے طے کردیا ہے۔ شادی بھی جلد کردیں گے۔" انہوں نے فیصلہ سنایا۔

سید جمال شاہ جو ان دنوں شہر گئے ہوئے تھے، باپ کے بلاوے پر واپس آئے تو دیکھا حویلی میں ہر طرف جشن کا سماں ہے۔ انہیں کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا اور وہ گھوڑی چڑھا دیئے گئے۔ رومانہ سے ان کی شادی کے بعد بظاہر سب کچھ نارمل ہی تھا۔ بس ارمانہ کے مزاج کی تلخی پہلے سے کچھ بڑھ گئی تھی۔ وہ ملازم جنہیں سجاد شاہ اور آمنہ بیگم نے ہمیشہ عزت دی تھی، اب اکثر اس کے ہاتھوں بے عزت ہوتے دکھائی دیتے۔

☆☆☆

"کیا بات ہے بی بی.....! بچی کے رونے کی آواز مسلسل آرہی ہے۔"

رومانہ روتی بلکتی چند ماہ کی دریشہ کو خاموش کروانے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھی۔ عظمت خالہ نے آواز سنی تو دستک دے کر کمرے میں چلی آئیں۔

"بس خالہ.....! راتوں کو ایسے ہی پریشان کرتی ہے۔ دن بھر آرام سے سوتی رہتی ہے اور رات کو ہنگامہ کھڑا کردیتی ہے۔" رومانہ نے دریشہ کو کندھے سے لگا کر تھپکیاں دیتے ہوئے بتایا۔

"لائیں مجھے دیں، میں چپ کرواتی ہوں۔" عظمت خالہ آگے بڑھیں۔

"رہنے دیں خالہ.....! آپ بھی تو دن بھر کے کام کاج کر کے تھکی ہوئی ہوں گی۔ جا کر آرام کریں، اسے میں سنبھال لوں گی۔" رومانہ نے اپنی ہمدرد فطرت کے مطابق جواب دیا لیکن انہوں نے اصرار کر کے بچی کو گود میں لے لیا۔

"جمال صاحب کہاں ہیں.....؟" دریشہ چپ ہوئی تو عظمت خالہ نے پوچھا۔

"دوسرے کمرے میں سونے کے لئے گئے ہیں۔ یہاں اس کے رونے سے ڈسٹرب ہوتے ہیں۔" رومانہ نے سادگی سے بتایا۔

"یہ تو غلط بات ہے، ماں کے ساتھ باپ کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے اولاد....." انہوں نے اعتراض کیا۔

"تو اب کیا جمال سنبھالیں گے بچی کو.....؟" رومانہ ان کے انداز پر ہنسی۔

"حرج بھی کوئی نہیں، مگر بی بی.....! ایک بات کہوں، برا مت مانیے گا۔ مرد کی طرف سے اتنی لاپرواہی اچھی نہیں۔ اسے تو اپنے ساتھ ذمہ داریوں میں باندھ کر رکھو تو ہی گاڑی چلتی ہے۔ خصوصاً اپنے جمال صاحب جیسے آزاد خیال بندے کی لگامیں تو ذرا زیادہ ہی مضبوطی سے پکڑنی پڑتی ہیں، ورنہ کب رسّی تڑا لیں، کچھ پتا نہیں چلتا۔" عظمت خالہ کی باتوں میں تجربہ اور تھکن رچا تھا۔ رومانہ ذرا سا ٹھٹکی مگر پھر ہنس کر ٹال دیا۔

"آپ کی سادگی سے بڑا خوف آتا ہے بی بی.....! زمانہ آپ جیسے لوگوں کا نہیں، ہم تو آپ کے حق میں یہی دعا کرسکتے ہیں کہ اللہ ہر آفت سے محفوظ رکھے اور آپ سدا اپنے گھر میں ہنستی مسکراتی شاد و آباد رہیں۔"

عظمت خالہ، وریشہ کو بیڈ پر لٹا کر کمرے سے باہر نکل گئیں مگر رومانہ کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ جمال کا رویہ شادی کے ابتداء دنوں سے ہی بہت روکھا سا تھا مگر رومانہ اپنی صلح جو طبیعت کے مطابق خوش دلی سے گزارا کر رہی تھی۔ وریشہ کی پیدائش کے بعد ان میں ذرا تبدیلی دکھائی دی تھی۔ حویلی میں منائے جانے والے جشن میں وہ کافی خوش نظر آئے تھے لیکن جلد ہی ان کا رویہ پھر بدل گیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح روکھے اور لاپرواہ ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں وریشہ کے رونے سے اپنی نیند پر پڑنے والا خلل بھی گوارا نہیں تھا۔ انہوں نے مستقلاً دوسرے کمرے میں سونا شروع کر دیا تھا۔ رومانہ نے برا لگنے کے باوجود چپ سادھ رکھی تھی اور ابھی تک سجاد صاحب اور آمنہ بیگم کو اس بات کا علم نہیں ہونے دیا تھا لیکن وہ جانتی تھی، یہ بات زیادہ عرصے ان کے علم میں آئے بغیر نہیں رہے گی۔ حویلی کے نمک خوار ملازم یہ اطلاع ان تک ضرور پہنچائیں گے۔

☆☆☆

زرینہ کی جواں عمری میں بیوگی نے حویلی کے در و بام ہلا دیئے تھے۔ دو سالہ حقیر کو گود میں لے کے میکے کی دہلیز پر واپس لوٹنے والی زرینہ کا دُکھ سید سجاد شاہ اور آمنہ بیگم کی جان کا روگ بن گیا تھا۔ وہ بیٹی جسے بڑی دعاؤں اور ارمانوں کے ساتھ رُخصت کیا تھا۔ آج اجڑی بیٹھی تھی۔ سانحہ اتنا بڑا تھا کہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ سید سجاد شاہ تو جیسے اپنے کمرے کے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔

بیٹی کا اُجڑا روپ دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ پرسے کے لئے آنے والوں کی ذمہ داریاں اور حویلی کے دیگر انتظامات وفادار ملازموں نے سنبھال رکھے تھے۔ پردیس میں بیٹھا کمال بہن کے غم پر تڑپ اٹھا تھا اور چاہتا تھا کہ وطن لوٹ آئے لیکن سید سجاد شاہ نے اجازت نہیں دی۔ اس کا آخری سمسٹر چل رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کی تعلیم کا حرج ہو۔ جانے والا تو یوں بھی جا چکا تھا اور برباد ہونے والی کا غم کتنا ہی بانٹا جاتا، اس کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی۔ جمال بھی بہن کے دُکھ سے متاثر نظر آ رہے تھے لیکن کب تک؟ آخر جلد ہی انہوں نے سنبھالا لے لیا اور اپنی پرانی روش کی طرف لوٹ گئے۔ رومانہ جو پہلے بھی ان کی لاتعلقی پر

سادھے رہتی تھی۔ اب بھی صبر کیے رہی اور شاید ساری زندگی کرتی رہتی جو اس کی آنکھیں
دات وہ منظر نہ دیکھ لیتیں۔

سردیوں کی راتیں تھیں، وریشہ کے رونے پر اس کی آنکھ کھلی۔ چاہا کہ فیڈر بنا کر اس
منہ میں دے دے لیکن شاید اس روز ملازمہ گرم پانی کا تھرماس کمرے میں رکھنا بھول گئی
۔ خود کچن کی طرف چل پڑی مگر پھر ارمانہ کے کمرے کے آگے سے گزرتے اس کے قدم
گئے۔ سرگوشیوں میں سنائی دیتی ان آوازوں کو وہ بہت اچھی طرح شناخت کر سکتی تھی۔

''آخر کب تک میں یہ سب سہوں، وہ حویلی کی بڑی بہو بنی ہر طرف راج کرتی
ہے اور آپ ہیں کہ مجھے صرف تسلیاں ہی دیتے رہتے ہیں۔ دیکھ لیجئے گا کسی دن میں اپنی
دے دوں گی۔'' ارمانہ کی سسکیاں اس کے قدموں سے جان نکال رہی تھیں۔

''مجھے معاف کر دو ارمانہ.....! میں صرف ابا جان کی وجہ سے مجبور ہوں۔ اگر میں
رومانہ کے خلاف کوئی بھی قدم اُٹھایا تو وہ مجھے جائیداد سے عاق کر دیں گے۔'' سید جمال
اپنی مجبوریوں کا رونا رو رہے تھے۔

''یعنی ان کی موت تک مجھے یوں ہی آپ کے ساتھ رہنا پڑے گا۔ کیا سمجھتے ہیں
، اس معاملے کی کبھی کسی کو خبر نہیں ہوگی۔ حویلی کے ملازم ایک ایک بات کی بو سونگھتے
تے ہیں۔ کسی نے زبان کھول دی تو قیامت آجائے گی۔'' ارمانہ کی باتوں نے اس کے
شت کی ہر حد ختم کر دی۔ وہ ایک زوردار دھکے سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔

''جمال.....!'' اس کی چیخ حویلی میں بہت زور سے گونجی تھی۔

''بچی کے رونے سے تمہاری نیند خراب ہوتی ہے، اس لئے تم اپنے کمرے میں نہیں
تے۔ جھوٹ کہا تھا تم نے مجھ سے۔ تم اپنے اس مکروہ کھیل کے لئے بہانے بناتے تھے۔''

وہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھے چیخ رہی تھی۔ ہنگامے کی آواز سن کر مختلف کمروں
کے دروازے کھلنے لگے لیکن کمرے میں آنے کی ہمت کسی کی نہیں تھی۔ سید سجاد شاہ، آمنہ بیگم
اور زرینہ ہی دوڑے آئے۔

''کیا ہوا بیٹی.....! کیوں اتنی بگڑی ہوئی ہو.....؟'' آخر آمنہ بیگم نے ہی بڑھ کر

اس کو سنبھالنے کی کوشش کی جبکہ سید سجاد شاہ، جمال اور ارمانہ کے فق چہروں پر نظریں جمائے صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اماں جی.....! مجھے جمال سے طلاق چاہئے۔ ابھی اور اسی وقت۔" رومانہ کے مطالبے نے سب کو حق دق کر دیا۔

"کچھ بتاؤ تو بات کیا ہے.....؟ آدھی رات کو تم پر یہ کیسا بھوت چڑھا ہے۔"

"اپنے شوہر کو آدھی رات کے وقت اپنی سگی بہن کی خواب گاہ میں دیکھ کر بھوت نہیں چڑھے گا تو اور کیا ہوگا اماں جی.....!" وہ سست پڑی تھی۔ آمنہ بیگم کی سوالیہ نظریں جمال کی طرف اُٹھیں۔

"اسے غلط فہمی ہوئی ہے اماں.....! میں تو ارمانہ کے پاس ایک کتاب لینے آیا تھا۔ یہ نہ جانے کیا سمجھ کر شور مچانے لگی۔" وہ نظریں چرائے بہانہ بنا رہے تھے۔

"غلط فہمی ہے تو غلط فہمی سہی لیکن جو کچھ میں نے سنا ہے، میں اس کے بعد ایک دن بھی مزید تمہارے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ مجھے تمہاری کوئی وضاحت نہیں، صرف اور صرف طلاق چاہئے۔" ہمیشہ کی صلح جو رومانہ کے لہجے سے قہر برس رہا تھا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہو بیٹی.....! ذرا دم تو لو۔ وہ کیا کہہ رہا ہے، سن تو لو۔"

"کچھ نہیں سننا۔ مجھے صرف اور صرف طلاق چاہئے۔" وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے، میں تمہیں طلاق دے دیتا ہوں مگر اس شرط پر کہ وریشہ میرے پاس رہے گی۔" سید جمال شاہ نے شاید اسے ڈرانے کو کہا تھا۔

"تم سے نجات پانے کے لئے اگر مجھے اپنی ممتا کی قربانی دینی پڑے تو مجھے یہ بھی منظور ہے۔" رومانہ نے فیصلہ سنا دیا۔ باقی افراد کی حیثیت تماشائیوں کی سی ہو گئی تھی۔ آمنہ بیگم نے مدد طلب نظروں سے سید سجاد شاہ کی طرف دیکھا۔

"میں کچھ نہیں کر سکتا آمنہ.....! میری اولاد نے تو آج مجھے کچھ کہنے کے لائق بھی نہیں چھوڑا ہے۔" وہ ڈگمگاتے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح حویلی کی فضاؤں میں بے شمار خاموش ہنگامے لے کر آئی تھی۔ سید جمال شاہ نے رومانہ کو طلاق دے دی تھی۔ شرط کے مطابق رومانہ نے وریشہ کو اسی وقت اس کے حوالے کر دیا تھا۔

دوسری طرف کچھ اہم فیصلے سید سجاد شاہ نے بھی کئے تھے۔ انہوں نے اپنی تمام جائیداد ان پانچوں کے نام تقسیم کر دی اور ارمانہ کا نکاح جمال کے ساتھ پڑھوا کر ان دونوں کو حویلی سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

"مجھے تجھ سے ایسی اُمید نہیں تھی جمال.....!" آمنہ بیگم نے اشک بہاتی آنکھوں سے بیٹے سے شکوہ کیا تھا۔

"مجھے بھی آپ لوگوں سے ایسی اُمید نہیں تھی کہ آپ میری مرضی کے بغیر میرا رشتہ ارمانہ سے طے کر دیں گے۔ مجھے بڑی بوڑھیوں کی طرح سنجیدہ رہنے والی رومانہ کبھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ میں تو ہمیشہ سے ارمانہ کو پسند کرتا تھا لیکن آپ لوگوں نے ایسی جلدی مچائی کہ میں کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں کر سکا۔ جو کچھ ہوا، اس میں میرا نہیں، آپ کا قصور تھا۔" وہ سارے الزام اپنے سر کر کے خود پارسا بنے کھڑے تھے۔

"ہاں.....! ہمارا ہی قصور تھا جو اپنی اولاد سے تابعداری کی اُمید رکھی لیکن تم ہمت نہ ہارنے کا بہانہ نہ بناؤ۔ جیسی "ہمت" تم دکھاتے رہے ہو، اس کے مقابلے میں شادی سے انکار کی ہمت کرنا کچھ دشوار نہیں تھا۔"

وہ جز بز ہوتے ہوئے اُٹھ گئے تھے۔

☆☆☆

سید کمال شاہ تعلیم مکمل کر کے واپس حویلی پہنچے تو یہاں ویسا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا جو وہ جانے سے پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔ رومانہ اپنے کمرے کی قیدی تھی، زریہ کی آنکھوں میں اپنی اور اماں کے ہونٹوں پر آہیں تھیں۔ ابا سب کچھ گنوا کر بستر کے ہو گئے تھے۔

"یہ سب کیا ہو گیا اماں.....!" وہ ضبط ہار کر رو پڑے تھے۔ کتنے کھلونے اور بگڑے تھے جو انہوں نے اپنی پہلی پہلی بھتیجی کے لئے کتنے ارمانوں کے ساتھ خریدے تھے

لیکن اب وہ سب کے سب سوٹ کیس میں ہی بند پڑے تھے جس کے لئے یہ سب لائے تھے وہ تو اس حویلی میں کہیں تھی ہی نہیں۔

"ابا کے سامنے مت رونا کمال.....اور نہ ان کا رہا سہا حوصلہ بھی ختم ہو جائے گا۔"

زرینہ نے انہیں سمجھایا تھا اور پھر واقعی انہوں نے سب کو سنبھال لیا تھا۔ سید سجاد شاہ جو گزرنے والے حادثات کے بوجھ تلے دب کر حوصلہ ہار بیٹھے تھے، انہیں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں زندگی کی رمق جاگ اٹھی۔

"جو ہوا سب بھول جائیں۔ ہمیں سب سے زیادہ آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رہا تو انشاء اللہ ہر نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔" ان کی انہی باتیں سید سجاد شاہ کے ٹوٹے اعتماد کو بحال کرنے لگی تھیں اور آخر اسی اعتماد کے سہارے وہ ایک دن اس سے کہہ بیٹھے۔

"تم مجھے غلط مت سمجھنا بیٹا.....! بس اسے ایک خواہش سمجھو جسے پورا کرنا یا نہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔ اگر تم نے انکار بھی کر دیا تو میں برا نہیں مانوں گا۔ میں نے برا مان کر اب کرنا بھی کیا ہے۔ تھوڑی سی سانسیں باقی ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی طرح کٹ جائیں گی لیکن یہ خلش دل میں رہے گی کہ کریم بخش کی روح سے اس کی اولاد کو سکھی رکھنے کا جو عہد کیا تھا، وہ پورا نہ کر سکا۔" اور کمال سے باپ کی بے بسی نہیں دیکھی گئی تھی۔

"آپ حکم دیں ابا جی.....! آپ کے حکم پر میری جان بھی قربان ہے۔"

"نہیں بیٹا.....! کوئی زبردستی یا حکم نہیں ہے۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو، ایسا فیصلہ جسے ساری زندگی نبھا سکو، ورنہ ایک بیٹے کی وجہ سے پہلے ہی شرمسار ہو چکا ہوں۔" انہوں نے اسے سوچنے کا وقت دیا تھا۔

"کمال.....! اگر تم نے اس عورت سے شادی کی تو سمجھنا تمہارا میرا رشتہ ہمیشہ کے لئے ختم۔ میں زندگی بھر تمہاری شکل نہیں دیکھوں گا۔" سید جمال شاہ کو بھی اس معاملے کی بھنک پڑ گئی تھی۔ سو انہوں نے فوراً فون کر کے بھائی کو دھمکایا۔

"میرے لئے ابا جی کی خوشی ہر رشتے سے بڑھ کر ہے۔ رہی آپ کے رشتہ ختم

ونے کی بات تو وہ تو اسی دن ختم ہو گیا جب آپ ابا جی کو رسوائی اور بے بسی کی دلدل میں نما کر خود نئی دنیاؤں کی دریافت پر نکلے تھے۔"

سید کمال شاہ اپنی اس بات پر ساری زندگی قائم رہے تھے۔ یہاں تک کہ ابا جی کے ال کے بعد اماں نے اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر جمال کو حویلی آنے کی اجازت دے دی ر دونوں بھائیوں کا تعلق بحال نہیں ہو سکا۔ ہوتا بھی کیسے۔ اگر ایک طرف مر جانے والے ابا ی کی بے بسی کا احساس تھا تو دوسری طرف اپنی شریک سفر رومانہ کے جذبات کا پاس۔

☆☆☆

وہ بے یقینی کی کیفیت میں زرینہ پھپھو کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو کہانی سے سنائی گئی تھی، اس نے اس کے وجود میں ہلچل مچا کر رکھ دی تھی۔ اکیس برس کی عمر میں سے بتایا جا رہا تھا کہ وہ جس عورت کو اپنی ماں سمجھتی رہی ہے، دراصل وہ اس کی ماں نہیں، اس ماں تو وہ ہے جو پچھلے کئی دنوں سے اس سے چھپتی پھر رہی ہے۔

ممی سے اس کے لاکھ اختلافات تھے۔ ان کے پاس سے اسے ممتا کی خوشبو نہیں آتی لی لیکن اس نے تو ہمیشہ خود کو ان کی بیٹی سمجھا تھا۔ اس کا چہرہ ان سے مشابہہ تھا۔ دیکھنے والے قریبہ مشابہت ڈھونڈ بھی لیتے تھے لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ان جیسی نہیں تھی، اس کے نقوش ں عورت کا عکس تھے جس نے اسے جنم دیا تھا جو اس کی ماں تھی۔

"رومانہ تمہیں بہت چاہتی ہے۔ حنیر سے تمہاری شادی کا فیصلہ بھی اسی کا تھا۔ وہ یں چاہتی تھی کہ اس کی طرح تم بھی جمال کی خودغرضی کی بھینٹ چڑھ جاؤ۔" پھپھو اس پر ید انکشافات کر رہی تھیں۔

وریشہ کو وہ بھاری سونے کا سیٹ یاد آیا جو پھپھو نے اس کے نکاح والے دن یہ کہہ ر اسے دیا تھا کہ تمہاری ماں نے برسوں سے اسے تمہارے لئے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اس ت وہ حقیقت نہیں جانتی تھی لیکن اب جان گئی تھی تو اسے اپنی ماں کی بے بسی پر شدت سے نا آ رہا تھا۔ جس وقت وہ دلہن بنی تھی، جب اس کا نکاح پڑھایا جا رہا تھا، تب یقیناً اس کی ں خود کو اس سے چھپائے، دور دور سے اسے دیکھ رہی ہوگی۔ اس نے اپنی بیٹی کے ماتھے پر

بوسہ دینے کی خواہش کی ہوگی۔ اس کے ہاتھ اس کی آنکھوں سے بہتے اشک اپنے دو پٹے میں جذب کر لینا چاہتے ہوں گے مگر وہ یہ سب نہیں کر سکی تھی۔ وہ انیس بیس برس بعد سامنے آنے والی بیٹی کو قریب سے دیکھ بھی نہیں سکی تھی۔ یقیناً وہ اسے آگہی کے عذاب سے بچانا چاہتی تھی اور اب انہوں نے خود کو ظاہر کیا تھا تو صرف اس لئے کہ اسے اس کے باپ کی خود غرضی کا شکار ہونے سے بچا سکیں۔

پھپھو کے قریب بیٹھی وریشہ کا سر جھکا ہوا تھا اور آنسو قطرہ قطرہ اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ یکدم ہی اس نے دو جڑے ہوئے ہاتھ اپنی دھندلاتی نظروں کے سامنے دیکھے۔

"مجھے معاف کر دو میری بچی......! میری وجہ سے تمہیں دُکھ پہنچا لیکن تم میرے دکھ کا اندازہ کرو گی تو تمہیں میرا ہر عمل حق پر محسوس ہوگا۔ شوہر بے وفا تھا، شاید سہہ لیتی لیکن سگی بہن کو اپنی بربادی کا حصے دار بنتے نہیں دیکھ سکی۔ تم چاہے اسے میری اَنا ہی کہو لیکن اس وقت میں اتنے شدید دُکھ سے دوچار تھی کہ تمہاری خاطر بھی وہ سب کچھ نہیں سہہ سکی۔"

وہ ہاتھ جنہوں نے کبھی اسے جھولا جھلایا تھا، تھپکیاں دی تھیں، آج اس کے سامنے جڑے معافی کے خواستگار تھے۔ وریشہ نے بے ساختہ ہی ان ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے کر چومنا شروع کر دیا۔

"آپ ٹھیک تھیں، بالکل ٹھیک تھیں مگر کاش آپ نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا ہوتا۔ میں ممی ڈیڈی کے بجائے آپ کی اور اکا جان کی بیٹی بن کر رہتی۔"

"وہ تو اب تمہیں ساری زندگی رہنا ہے، بیٹی اور بہو دونوں بن کر۔ حنیر ہمارے لئے بیٹوں جیسا ہی ہے۔ حویلی کی طرح اس کا ہمارے گھر پر بھی پورا حق ہے اور اب اس سے نکاح کے بعد تم بھی دونوں جگہ کی مالک ہو گئی ہو۔"

انہوں نے اسے بازوؤں میں بھینچے بہت پیار سے کہا تو وہ جھینپ سی گئی۔

☆☆☆

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، آپ زیادہ خوش قسمت ہیں یا اکا جان۔" وہ رومانہ

میں سر رکھ کر لیٹی ان کے چہرے کو محویت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیوں بھئی......! تمہیں ایسا سوچنے کی کیا ضرورت پڑ گئی......؟" انہوں نے اس کے ماتھے سے بالوں کی لٹ ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ اس روز وریشہ نے جمال شاہ کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ تن فن کرتے لوٹے تھے لیکن وریشہ کے فیصلے کے سامنے ان کی ایک نہیں چلی تھی۔ ان کے جانے کے بعد رومانہ اور سید کمال شاہ اسے واپس اپنے گھر لے آئے تھے۔ وہ گھر جہاں پہلے وہ کچھ دن مہمانوں کی طرح گزار چکی تھی، اب وہاں اپنی ماں کی قربت کا لطف اُٹھا رہی تھی۔

"پتا ہے کیا......؟ جب میں آپ کو دیکھتی ہوں تو لگتا ہے آپ سے اچھی کوئی نہیں لگتا اور جب اکا جان کو دیکھوں تو وہ بہت سپر چیز لگنے لگتے ہیں۔" اس نے معصومیت سے بیان کی۔

"تمہارے اکا جان واقعی بہت اچھے ہیں۔ اس وقت جب میں بالکل ٹوٹ چکی تھی اگر وہ مجھے سمیٹ نہ لیتے تو آج شاید تمہیں اپنی ماں کا وجود بھی نہیں ملتا۔ ان کے ساتھ رہ کر مجھے ایک تمہاری جدائی کے سوا کبھی کوئی غم نہیں سہنا پڑا اور اب جو تم مجھے ملی ہو تو اس میں بھی ان کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ اگر وہ میرا ساتھ نہ دیتے تو میں کہاں اتنا بڑا قدم اکیلی اُٹھا پاتی۔" وہ پوری سچائی سے اعتراف کر رہی تھیں۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ زیادہ خوش قسمت ہیں کیونکہ آپ کو اکا جان ملے ہیں۔" وہ چہکی۔

"بالکل......! اب مجھے چھوڑو تا کہ میں کچن دیکھ سکوں۔ تمہارے بہت اچھے اکا جان کو میرے سوا کسی کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں۔ بیچارے پچھلے دنوں بڑی مشکل سے ملازمہ کے ہاتھ کا کھانا زہر مار کرتے رہے ہیں۔" وہ اپنی گود سے اس کا سر نرمی سے ہٹاتے ہوئے بولیں۔

"میرے لئے چاول ضرور بنایئے گا۔" وریشہ نے پیچھے سے آواز لگائی تو وہ اثبات میں سر ہلا کر آگے بڑھنے لگیں مگر پھر فون کی بجتی بیل نے ان کے قدم روک لئے۔

"وعلیکم السلام.....! کیا حال ہے تمہارا.....؟" دوسری طرف جو بھی تھا، وہ اس سے بہت اپنائیت سے پوچھ رہی تھیں۔

"شرم تو نہیں آتی ساس کو حال دل سناتے۔" انہوں نے دھیرے سے ہنستے ہوئے اس بار جو جملہ کہا اسے سن کر دریشہ کو فون کرنے والی ہستی کا اندازہ ہو گیا۔

"اچھا ہولڈ کرو، بات کرواتی ہوں۔" انہوں نے دریشہ کو اشارے سے قریب بلایا اور ریسیور اس کے ہاتھ میں تھما کر باہر نکل گئیں۔

"اور کہو کیسی ہو.....؟ دل لگ گیا وہاں.....؟" سلام دعا سے فارغ ہو کر وہ اس سے پوچھنے لگا۔

"دل تو بہت زیادہ لگ گیا ہے۔ امی کے ساتھ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔"

"اور یہاں وقت گزرنے کا نام نہیں لے رہا۔ اکا جان پہلے تو ہر وقت کہتے رہتے تھے کہ ماسٹرز کر لو تو فوراً فیکٹری جوائن کر لینا اور اب ظالم ساج بنے بیٹھے ہیں۔ ذرا سا اشارہ نہیں دے رہے کہ میں اسی بہانے تمہارا دیدار کر لوں۔" وہ نہایت ٹھنڈی سانسیں لیتا حال دل سنا رہا تھا۔

"آپ یقیناً امی سے بھی ایسی ہی باتیں کر رہے تھے، اسی لئے وہ آپ سے شرم کرنے کو کہہ رہی تھیں۔"

"ان کی فکر نہ کرو۔ وہ میری ممانی اور ساس بعد میں، دوست پہلے ہیں۔ نکاح والے روز بھی تو انہوں نے ہی تم سے ملاقات کا انتظام کیا تھا۔"

وہ مزے سے اسے بتا رہا تھا، دریشہ کو فوراً ہی انٹرکام پر سنائی دینے والی نرم آواز یاد آئی۔ آج وہ جان سکتی تھی کہ وہ آواز کس کی تھی۔

"حویلی میں سب کیسے ہیں.....؟" دریشہ نے موضوع گفتگو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"سب کی چھوڑو۔ ہم سے پوچھو کہ ہم تم بن کیسے ہیں.....؟" وہ بدستور شوخی پر مائل تھا۔

"اگر آپ اس طرح کی باتیں کرتے رہے تو میں فون بند کر دوں گی۔ کوئی سنجیدہ

بات نہیں ہے آپ کے پاس کرنے کو.....؟" اس نے مصنوعی خفگی دکھائی۔

"کیوں نہیں ہے کوئی سنجیدہ بات.....؟ میں نے تو اصل میں فون ہی تم سے یہ پوچھنے کے لئے کیا تھا کہ یہ امریکن سیکرٹری خارجہ نے صدام اور زرقاوی کے آپس میں روابط کا ذکر کرتے ہوئے انہیں عالمی دہشت گردنیٹ ورک کا حصہ قرار دیا ہے، اس میں کتنی سچائی ہے۔"

"مجھے کیا پتہ.....؟" وہ اس کی سنجیدہ بات سن کر جھنجلائی۔

"تمہیں پتہ ہو بھی نہیں سکتا، جو لڑکی اپنے مجازی خدا کا حال دل نہ سنتی ہو، اس نے ایسی تبصرے وتذکرے کہاں سنے ہوں گے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ آپ فون بند کریں پھر میں جا کر کوئی نیوز چینل دیکھتی ہوں۔" اس نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا تھا۔

"اوہو.....! ہماری راہ پر آ رہی ہو، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" حنیر نے بھی اس انداز نوٹ کیا تھا۔

"اس کے سوا اب کوئی راہ ہے بھی تو نہیں۔" وہ بے اختیار اعتراف کر گئی تھی۔ حنیر محظوظ ہوا۔

"اس راہ کے سارے کانٹے اپنے ہاتھوں سے چننے کا وعدہ کرتا ہوں تم سے۔" اس نے اپنی گمبھیر آواز میں یقین دلایا تو کچھ دیر کے لئے دونوں صرف خاموشی چھا گئی۔

"اپنا خیال رکھنا، اللہ حافظ.....!" آخر حنیر نے ہی کہہ کر فون بند کیا۔ دریشہ کچھ دیر یونہی کھڑی رہی پھر ہاتھ میں پکڑا ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے مسکرانے لگی۔ بے خودی کی اس کیفیت سے اسے اکا جان کی آمد نے نکالا۔

"تمہاری امی کہاں ہیں دریشہ.....!" انہوں نے اس سے پوچھا۔

"کچن میں کھانا بنا رہی ہیں۔" اس نے ان کے چہرے پر کوئی غیر معمولی سی کیفیت نوٹ کی۔

"کیا ہوا.....؟ خیریت.....؟ آج آپ اس وقت گھر کیسے آ گئے.....؟" روبانہ ان کی آواز سن کر خود ہی باہر آ گئیں۔

"ایک اہم کام سے شہر سے باہر جا رہا ہوں، تم لوگوں کو بتانے اور اپنی کچھ چیزیں لینے آیا تھا۔"

"آپ بتائیں، میں لا دیتی ہوں۔" رومانہ فوراً ہی الرٹ ہو گئیں۔ کمال شاہ نے انہیں ایک دو چیزوں کے نام بتائے اور ان کے جانے کے بعد فون پر مصروف ہو گئے۔

"ہاں حنیر.....! میں بول رہا ہوں۔ تمہیں یہ بتانے کے لئے فون کیا تھا کہ علی کے بورڈنگ سے فون آیا ہے۔ علی وہاں موجود نہیں، اس کا پتہ نہیں چل رہا۔ مجھے فوراً وہاں جانا ہوگا۔"

"نہیں.....! تمہیں ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں۔ تم یہاں کے معاملات دیکھو۔ مجھے خدشہ ہے یہ دریشہ والے معاملے کی کوئی کڑی نہ ہو۔" انہوں نے نظریں دریشہ پر ڈالی جس کا چہرہ سپید پڑ رہا تھا۔

"ابا جان.....!" وہ فون کر کے پلٹے تو وہ ان کے قریب چلی آئی۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے اسے تسلی دی۔

"یہ سب میری وجہ سے ہو رہا ہے۔" وہ رونے لگی تھی۔

"ضروری نہیں، ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو۔ تم رونے کے بجائے دعا کرو علی جہاں بھی ہو ہمیں صحیح سلامت مل جائے۔" وہ خود بہت پریشان تھے لیکن اسے سمجھا رہے تھے۔

"اور ہاں.....! دیکھو تمہاری امی کو اس بات کا علم نہ ہونے پائے۔" آہٹ محسوس کرتے ہوئے انہوں نے آہستگی سے کہا۔ دریشہ نے تشفی انداز میں سر ہلاتے ہوئے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔ امی کی خاطر اسے اپنے آپ کو سنبھالنا ہی تھا۔

☆☆☆

"علی مل جائے گا حنیر.....! اسے کچھ ہوگا تو نہیں.....؟" ابا جان کی ہدایت کے مطابق وہ یہاں پہنچ گیا تھا۔ رومانہ نے اس کی اچانک آمد پر تعجب کا اظہار کیا تو بولا۔

"بس جیسے ہی مجھے پتہ چلا کہ ظالم سماج منظر سے غائب ہیں، میں فوراً یہاں آ گیا۔"

"تم تو دن بدن بڑے ہی بے شرم ہوتے جا رہے ہو۔" رومانہ نے اس کے انداز پر فس کر اسے ایک چپت لگائی۔ جب تک وہ ان کے درمیان رہیں وہ لوگ ایسی ہی ہلکی پھلکی

نوک جھونک کرتے رہے۔ ان کے سونے کے لئے جاتے ہی دریشہ کا ضبط ٹوٹ گیا۔

"تم فکر مت کرو دریشہ.....! ابا جان گئے ہیں ناں.....! ان کے بہت کانٹیکٹس ہیں، جلدی ہی علی کا پتہ مل جائے گا۔" وہ اسے تسلیاں دینے لگا لیکن دریشہ کے آنسو رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"بی بی.....! آپ کے لئے فون ہے۔" ملازمہ کے اطلاع دینے پر وہ آنسو پونچھ کر حنیر کی سے کھڑی ہوئی تھی۔ حنیر بھی اس کے پیچھے ہی اُٹھ کر آیا تھا۔ دریشہ ریسیور کان سے لگائے کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد صرف ایک جملہ بولی۔

"ٹھیک ہے.....! ایسا ہی ہوگا۔" اور فون بند کر دیا۔

"کس کا فون تھا دریشہ.....!" حنیر نے اس سے پوچھا۔

"کسی کا نہیں، رات بہت ہو گئی ہے، اب ہم لوگوں کو سو جانا چاہئے۔" وہ سپاٹ سے انداز میں جواب دے کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ حنیر اُلجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا اور پھر کچھ خیال آنے پر فون کی طرف بڑھا۔ نمبر سے کال کے مقام کا اندازہ لگاتے ہوئے اس کا ذہن بہت تیزی سے کچھ سوچنے لگا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سید کمال شاہ کا موبائل نمبر ملا رہا تھا۔ اس سے ساری بات جاننے کے بعد انہوں نے اسے کچھ ہدایات دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

حنیر لاؤنج میں ہی ایک صوفے پر آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ یہ بھی سید کمال شاہ کی دی ہوئی ہدایتوں میں سے ایک ہدایت تھی۔ حسب توقع دریشہ تھوڑی دیر بعد سیڑھیاں اُترتی دکھائی دی۔ حنیر کی لاؤنج میں موجودگی نے اسے اُلجھن میں مبتلا کیا لیکن وہ اپنے گہری نیند میں ہونے کا تاثر دے کر انجان بنا لیٹا رہا۔ آخر کار وہ مطمئن ہو کر باہر نکل گئی۔ اس کے نکلنے کے بعد حنیر تیزی سے اُٹھا اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ گیٹ پر موجود چوکیدار نے حنیر کی ہدایت کے مطابق ایک آدھ رسمی سا سوال کر کے اس کے لئے ذیلی دروازہ کھول دیا تھا۔ جیسے ہی دریشہ دروازے سے باہر نکلی حنیر دوڑتا ہوا باہر آیا اور اپنی گاڑی کو اسٹارٹ کر کے گیٹ کے نزدیک لے آیا۔

"بی بی ہرے رنگ کا گاڑی میں بیٹھ کر گیا ہے صاحب.....!" چوکیدار نے اسے دیکھتے ہی بتایا۔ چوکیدار سے معلومات لے کر اس نے گاڑی باہر نکال لی۔ تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے وہ جلد ہی مطلوبہ گاڑی کو نوٹ کر چکا تھا۔ گاڑی اس کے اندازے کے مطابق ہی سفر کر رہی تھی۔ اس نے جیب سے موبائل نکال کر سید کمال شاہ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"تم احتیاط سے اس گاڑی کو فالو کرو۔ میں اپنے ایک ڈی ایس پی دوست کو تمہارا نمبر دے رہا ہوں۔ وہ تم سے کانٹیکٹ کر کے لوکیشن معلوم کر لے گا۔ آگے اس کے بندے سب سنبھال لیں گے۔"

انہوں نے اسے مزید ہدایات دی تھیں۔ حنیر نے ان کی ہدایات کے مطابق احتیاط سے تعاقب جاری رکھا۔ راستے میں اسے ان کے ڈی ایس پی دوست کا فون آ گیا تھا۔ انہوں نے اسے مکمل تعاون کا یقین دلایا تھا۔

کئی گھنٹوں پر مشتمل یہ تعاقب شہر کے ایک پوش علاقے کی کوٹھی پر جا کر ختم ہوا تھا۔ پولیس فورس کے جوان بھی جلد ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ عام حالات میں وہ اس کوٹھی پر ریڈ کرنے کی جرأت نہ کرتے، لیکن سید کمال شاہ کے تعلقات کام آ رہے تھے۔

☆☆☆

"میں آ گئی ہوں ڈیڈی.....!" وحید درانی کے آدمیوں کے ساتھ وہ کوٹھی کے ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئی۔ یہاں صرف چند کرسیاں رکھی تھیں جن پر سید جمال شاہ، ارمانہ اور وحید درانی بیٹھے تھے۔ ایک کرسی سے علی کو بھی باندھ کر بٹھایا گیا تھا۔ کوٹھی کی بے سروسامانی اور سناٹے سے ظاہر تھا کہ اسے رہائش کے لئے استعمال نہیں کیا جا رہا تھا۔

"چلو سگے باپ کی خاطر نہ سہی، سوتیلے بھائی کے لئے ہی تم نے ہماری بات ماننے کا فیصلہ تو کیا۔" ارمانہ نے اسے دیکھتے ہی طنز کیا۔

"میں آپ لوگوں کا ہر مطالبہ ماننے کے لئے تیار ہوں لیکن پہلے آپ علی کو واپس بھجوائیں۔" ان کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"بے وقوف سمجھتی ہو کیا ہمیں.....؟ ابھی تو صرف خلع کے کاغذات پر سائن ہوں

گے جب تک فیصلہ ہمارے حق میں نہیں ہو جاتا تمہیں اور علی دونوں کو یہیں رہنا ہوگا۔ چاہتے تو علی کی رہائی کے بدلے حنیر سے ڈائریکٹ طلاق کا مطالبہ بھی کر سکتے تھے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس اغواء کے لئے ان لوگوں پر ہمارا نام ظاہر نہ ہو۔ تمہارے لئے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میری بیٹی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ اپنے باپ کے پاس واپس آ گئی۔"

"کاش.....! آپ میرے باپ نہ ہوتے اور کاش امی کو نیچا دکھانے کی خاطر آپ نے مجھے ان سے چھین کر میری پرورش نہ کی ہوتی تو آج میں اتنے بڑے عذاب میں مبتلا نہیں ہوتی۔" اس نے سید جمال شاہ اور وحید درانی پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی۔

"تم باپ بیٹی باتیں بعد میں کرنا پہلے اس پیپر پر سائن کرو۔ میں زیادہ دیر یہاں رکنا نہیں چاہتا۔" وحید درانی نے خرا کہا۔

"اسی لاکھ سے زیادہ رقم لے چکا ہے تمہارا باپ مجھ سے، تم سے شادی کے لارے دے کر۔ اب میں اتنی آسانی سے تمہیں ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔" وحید درانی نے پین اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

"وریشہ آپی.....! کیا ان پیپرز پر سائن کرنے سے آپ کی اور حنیر بھائی کی ریلیشن شپ ختم ہو جائے گی.....؟" خاموشی سے تماشا دیکھتے علی نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔

وریشہ کے پاس اس سوال کے جواب میں چند آنسو ہی تھے۔

"اگر ایسا ہے تو پلیز.....! آپ ان پیپرز پر سائن مت کریں۔ سب لوگوں کو بہت دکھ ہوگا۔" وہ چھوٹا سا لڑکا اپنی پرواہ کئے بغیر اسے مشورہ دے رہا تھا۔

"زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں۔ خاموش بیٹھو۔" سید جمال شاہ نے اس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا۔

"ڈیڈی.....! آپ کو علی کو مارنے کا کوئی حق نہیں۔" وریشہ زور سے چلائی تھی۔

"اس کے باپ نے مجھ سے میری بیٹی چھینی ہے۔ اسے تو میں ہرگز معاف نہیں کروں گا۔" ڈیڈی مزید برہم ہو کر علی پر پل پڑے تھے۔ وریشہ ان کو روکنے کے لئے پیچھے لپکی۔

"ہینڈز اپ.....!" اچانک ہی وہاں ایک آواز گونجی۔ پھر جانے کس نے گولی

چلائی تھی جو کمرے کی فضا مستقل دھماکوں سے گونج اُٹھی۔ دریشہ کے ذہن نے اس افراتفری میں جو آخری چیز محسوس کی وہ اس کے بازو میں اُترتی آگ تھی۔

☆☆☆

''اُسامہ.....! ولید.....! جلدی آؤ، دیر ہو جائے گی۔'' دریشہ نے ایک کمرے میں جھانک کر پکارا۔ وہ دونوں ننھی مروئی کو ہاتھ اور پیروں سے پکڑ کر جھولا جھلا رہے تھے اور وہ خوش ہو کر کلکاریاں مار رہی تھی۔

''مجھے پتا تھا تم لوگ اس کے ساتھ ہی لگے ہو گے۔'' اس نے آگے مروئی کو گود میں لیا۔

''کیا ہے آپی.....! ابھی دل بھی نہیں بھرتا کہ اسے چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔'' ولید نے منہ بنایا۔

''گرمیوں کی چھٹیوں میں آؤ گے تو پھر جی بھر کر اس کے ساتھ کھیل لینا۔ ابھی جاؤ حنیر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''چھٹیوں میں وہ آپ کا لاڈلا علی بھی تو آیا ہوتا ہے۔'' ولید نے شکوہ کیا۔

''تو بھئی اس کا بھی حق ہے۔ وہ بھی تو ماموں ہے مروئی کا۔'' دریشہ نے اس کے بال سنوارتے ہوئے سمجھایا۔ اُسامہ اس دوران اپنا اور ولید کا بیگ اُٹھا کر باہر نکل چکا تھا۔

''ممی کو خدا حافظ کہہ دیا تم لوگوں نے.....؟'' اس کی طرف دیکھتے ہوئے دریشہ نے ولید سے پوچھا۔

''میں کہہ چکا ہوں، بھائی کا پتہ نہیں۔'' ولید نے بتایا تو دریشہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اُسامہ رومانہ سے نہیں ملا ہوگا۔ اس واقعہ کو ڈیڑھ دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اُسامہ نے آج تک ارمانہ کو معاف نہیں کیا تھا۔

وحید درانی کی کوٹھی پر ہونے والی پولیس ریڈ میں جو اچانک گولیاں چلی تھیں ان سے بہت زیادہ نقصان ہوا تھا۔ سید جمال شاہ اور وحید درانی تو اپنے دو آدمیوں کے ساتھ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ دریشہ کے بازو میں لگنے والی گولی کا زخم بھی کافی گہرا تھا۔ لیکن فوری طبی امداد کی وجہ سے اس کی زندگی بچ گئی تھی۔

اس حادثے میں سب سے برا ارمانہ کے ساتھ ہوا تھا۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں گولی لگی تھی جس کی وجہ سے وہ ساری زندگی کے لئے معذور ہو گئی تھیں۔ ان کا شمار نہ مردوں میں تھا نہ زندوں میں۔ وہ سب کے لئے تماشۂ عبرت بن کر رہ گئی تھیں۔

اس دن دریشہ کا فون پر ردِ عمل غیر معمولی تھا۔ اس سے ہی ان لوگوں نے کچھ اندازے لگائے تھے اور واقعی وہ اندازے بالکل ٹھیک نکلے تھے۔ حنیر اس سے اس بات پر بعد میں خفا بھی ہوا تھا۔ انہیں یوں بھی اب بچ جانے والے رشتوں کو سمیٹ کر ایک نئی زندگی شروع کرنا تھی۔

اُسامہ اور ولید بھی ان ہی رشتوں کی باقیات تھے جنہیں ان کے ناکردہ گناہوں کی سزا نہیں دی جا سکتی تھی۔ ان دونوں کے عقیل ارمانہ کو بھی حویلی میں ایک کمرہ مل گیا تھا جہاں وہ لاٹھیوں کے سہارے اپنی بے بس زندگی کے دن کاٹ رہی تھیں۔

دریشہ خوفِ خدا کے سبب اور اپنی ہنستی بستی زندگی کے صدقے انہیں معاف کر چکی تھی۔ دادی اور پھپھو نے سارے معاملات اس کے اختیار میں دے دیئے تھے۔ حویلی کا انتظام ویسے ہی چل رہا تھا۔ دریشہ نے یہاں کی روایات کو بدلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

حنیر، سید کمال شاہ کے ساتھ فیکٹری میں پچیس فیصد کی شراکت میں کام کر رہا تھا۔ یہ شیئرز رومانہ نے اپنے حصے کی جائیداد میں سے دریشہ کو گفٹ کئے تھے۔ حنیر کی حویلی اور سید کمال شاہ کے گھر کے درمیان آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ کبھی کبھی دریشہ چڑ کر کہتی۔

''مجھ سے زیادہ تو آپ وہاں کے چکر لگاتے ہیں، جیسے وہ میرا نہیں آپ کا میکہ ہو۔'' اور حنیر کے بلند بانگ قہقہے گونج اُٹھتے۔

ماضی کی راکھ میں دبے چند شدید دُکھوں سے قطع نظر حویلی آج پیار، محبت اور امن کے متوالوں کا مرکز تھی۔ پچھلی نسل کی غلطیوں اور ان غلطیوں کے انجام نے نئی نسل کو قدم سنبھال کر چلنا سکھا دیا تھا۔ قدم سنبھلے رہیں اور ہر فرد اپنے دائرہ کار میں چلے تو ہی زندگی میں توازن آتا ہے اور دراصل توازن میں ہی حسن ہے۔

☆☆☆

تو نے میرا رُوپ سنوارا

"کلرز کے معاملے میں تمہارا ٹیسٹ ابھی تک ویسے کا ویسا ہی ہے۔ ایک دم بکواس اور غیر سنجیدہ۔"

ڈھیروں شاپنگ بیگز سامنے رکھے بڑے ذوق شوق سے اپنی خریدی ہوئی اشیاء جملہ حاضرین کو دکھا کر داد سمیٹتے مصعب عمیر سے یہ بات کہنے کی جرأت صرف روحیہ ظہیر ہی کر سکتی تھی۔

"تم کلرز کو چھوڑو۔ میرا ٹیسٹ تو ہر معاملے میں ہی ابھی تک ویسے کا ویسا ہی ہے۔ بکواس اور غیر سنجیدہ۔"

وہ بھی مصعب عمیر تھا۔ بنا ماتھے پر شکن ڈالے اس کی بات کو اسی کو لوٹا کر پورے اطمینان سے کارپٹ پر پھیلی اپنی شرٹس سمیٹ کر واپس بیگز میں رکھنے لگا۔ تمام لوگوں کے چہرے پر بے ساختہ دوڑ جانے والی مسکراہٹ اس بات کا ثبوت تھی کہ انہوں نے مصعب کی اس بر جستگی سے بے حد لطف لیا ہے۔

"ٹیسٹ چاہے کچھ بھی ہو۔ ہر پسندیدہ چیز انسان کی دسترس میں آجائے یہ ضروری تو نہیں۔" وہ مصعب کی بات کے پس منظر سے خوب واقف تھی سو پوری جان سے سلگ کر بولی اور پھر اگلے ہی لمحے کمرے سے واک آؤٹ کر گئی۔

"ہائیں.....! اسے کیا ہوا.....؟ پاگل ہو گئی ہے۔ بھلا یوں برا ماننے والی کیا بات

تھی.....؟ مذاق کی باتوں کو کون اتنا بڑھاتا ہے.....؟" سب لوگ اس کی اس حرکت پر اپنی اپنی جگہ حیران سے بیٹھے رہ گئے تھے۔

"ابھی تک دونوں میں ایک منٹ کے لئے نہیں بنتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ساری زندگی کیسے ساتھ رہیں گے.....؟"

یہ چھوٹی پھپھو تھیں۔ مصعب عمیر کے چہرے پر پھیلتے تاریک سائے سے بے خبر اپنی تشویش کا برملا اظہار کرتی رہی۔

"کچھ نہیں ہوتا نرجس.....! شادی کے بعد سب سنبھل جاتے ہیں۔ نہ لڑکوں میں اتنا لاابالی پن باقی رہتا ہے اور نہ ہی لڑکیوں میں کنوار پنے کی ہٹ دھرمی۔"

تائی اماں نے ایک دم بدل جانے والی صورت حال کو دور اندیشی سے سنبھالا دیا تو روحیہ کی امی کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنی جٹھانی کی سلجھی ہوئی طبیعت کی شروع ہی سے قائل تھیں سو کم عمری میں ہی روحیہ کا رشتہ ان کے بیٹے سے کرتے انہوں نے ذرا بھی ہچکچاہٹ کا اظہار نہ کیا لیکن وہ اپنی لاڈلی بیٹی کا کیا کرتیں جس کا یکسر مختلف مزاج ذرا بھی مصعب سے میل نہ کھاتا تھا۔ بچپن سے ہی دونوں میں ایک پل کے لئے نہیں بنتی تھی۔ کھانے، پینے سے لے کر پہننے اوڑھنے تک ہر معاملے میں دونوں کی پسند ناپسند میں شدید اختلاف تھا بلکہ اس حوالے سے ایک کو مغرب اور دوسرے کو مشرق کہا جاتا تو کچھ غلط نہ ہوتا۔ ابتداء میں ان لوگوں نے دونوں کے مزاج کے اس فرق اور آپس کے جھگڑوں کو نادانی اور ناسمجھی سے تعبیر کیا اور کوئی خاص اہمیت نہیں دی لیکن اب یہ فرق واضح ہونے لگا تھا۔ خصوصاً روحیہ کی امی اس سلسلے میں کافی تشویش کا شکار تھیں۔ اتنے سال بیٹی کو مصعب کے نام پر بٹھا رکھا تھا۔ اپنوں اور غیروں سب کو خبر تھی کہ روحیہ مصعب کی منگیتر ہے۔ اب اگر خدانخواستہ یہ رشتہ قائم نہ رہتا تو وہ کس طرح لوگوں کا سامنا کرتیں اور انہیں بتاتیں کہ ہر طرح سے لائق اور خاندان ہی کے لڑکے سے رشتہ ٹوٹنے کے پیچھے آخر کون سی وجہ تھی۔ جبکہ انہیں ابھی روحیہ کے بعد دو بیٹیاں اور بھی نمٹانی تھیں۔

"ارے میری پیاری چچی.....! کن فکروں میں ڈوبی ہیں.....؟ ابھی تو مجھے آپ کو

وہ قصہ بھی سنانا ہے جب نہایت حسین، گوری چٹی میم نے آپ کے اس پیارے بھتیجے کے عشق میں ڈوب کر کینیڈین شہزادے کا رشتہ ٹھکرا دیا تھا۔" ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر وہ بڑے لاڈ سے بولا۔

"لیکن کینیڈا میں شہزادے کب ہوتے ہیں مصعب بھائی......! آپ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش مت کریں۔" شبینہ نے اس کی بات پر احتجاج کیا۔

"کینیڈا میں چار سال گزار کر کون واپس آیا ہے......؟"

"آپ......!" اس کے ڈپٹ کر پوچھنے پر وہ مری مری آواز میں بولی۔

"تو پھر وہاں کے بارے میں میری معلومات زیادہ قابل بھروسہ ہیں یا تمہاری......؟ خواہ مخواہ اپنی بڑی بہن کی طرح بیچ میں ٹانگ اڑا کر بات کا مزہ کرکرا کر دیا۔"

"ہاں تو پیاری چچی......! قصہ کچھ ایسا ہے کہ جب میں پہلے ہی دن ائیر پورٹ سے باہر نکلا تو سامنے کھڑی وہ حسین وجمیل دوشیزہ مجھے دیکھ کر گم صم ہوگئی اور لگی ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھنے۔ میں شرم وحیا کا پیکر مشرقی لڑکا اس کی اس دیدہ دلیری پر اپنی جگہ لاج کھا کر رہ گیا۔ ان کم بخت ماریوں میں تو لاج نام کی چیز ہوتی نہیں مجبوراً مجھے ہی شرمانا پڑا۔"

وہ مزے لے لے کر ایک ناوقوع پذیر ہونے والے واقعہ کو نمک مرچ لگا کر سنا رہا تھا اور کمرے میں گونجتے قہقہے اس بات کے گواہ تھے کہ کچھ دیر پہلے چھا جانے والی ٹینشن کا اب وہاں کوئی نام ونشان نہیں۔

☆☆☆

"روحینہ......! میرے کمرے میں آؤ تم۔" اپنے کمرے کی طرف بڑھتی روحینہ کو امی نے جس لہجے میں حکم دیا وہ ان کے مزاج کی برہمی بھانپنے کے لئے بہت کافی تھا۔

"جی امی......! بس ابھی دو منٹ میں کپڑے چینج کر کے آتی ہوں۔" دھیمی آواز میں جواب دے کر وہ اپنے کمرے میں گھس گئی۔

"آج آپی کی خیریت نہیں۔ امی کا موڈ سخت آف ہے۔ پتا نہیں اب تک کس طرح برداشت سے کام لے رہی تھیں......؟" یہ سب سے چھوٹی تہمینہ تھی جس کا کہا جملہ کمرے میں

ں ہوتے ہی اس کے کانوں میں پڑا۔

"موڈ آف ہونے والی بات تو خیر آپی نے کی ہی تھی۔ وہ تو مصعب بھائی ہی اتنے کھ اور صلح جو ہیں کہ بڑی سے بڑی بات بھی مذاق میں ٹال دیتے ہیں۔"

شبینہ کا جوابی تبصرہ اسے پوری جان سے سلگا گیا۔ مصعب کی شخصیت کا یہی رُخ تو ھا اسے کبھی بھی پسند نہ رہا تھا۔ چار سال پہلے جب وہ کینیڈا جا رہا تھا تو اس نے سوچا تھا کہ ماحول کی تبدیلی مصعب عمیر کے مزاج میں بھی تبدیلی لے آئے لیکن اب جبکہ وہ واپس تھا اور پہلے سے زیادہ شوخ اور غیر سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا تو اس سے اس کا یہ روپ قطعی شت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے جیون ساتھی کو ایک سنجیدہ اور بردبار شخصیت کے طور پر دیکھنے واہش مند تھی لیکن اس معاملے میں مصعب عمیر نے اسے پوری طرح مایوس کیا تھا۔

"زندگی کے معاملات ہنسی مذاق میں ٹال کر طے نہیں کئے جاتے۔" اس کا دل چاہا ینہ کو جواب دے لیکن پھر ایک لمبی بحث چھڑ جانے کا اندیشہ تھا اور دوسری طرف وہ امی صرف دو منٹ کا کہہ کر آئی تھی سو خاموشی سے الماری سے کپڑے نکال کر واش روم کی بڑھ گئی۔

"آج جس بدتمیزی کا مظاہرہ تم نے مصعب کے سامنے کیا ہے کیا میں نے تمہیں ی تربیت دی ہے......؟" اب وہ امی کے سامنے بیٹھی ان کی ڈانٹ سن رہی تھی۔

"میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی امی......! صرف اس کی بات کا جواب دیا تھا۔" وہ لی۔

"صرف جواب دیا تھا......؟ کتنے آرام سے کہہ رہی ہو لیکن اس بات کا کوئی خیال کہ شروعات تمہاری ہی طرف سے ہوئی تھی۔ تمہیں کیا ضرورت تھی اس کے لائے ہوئے وں کے رنگ پر تبصرے کرنے کی......؟ اگر تمہیں وہ سب پسند نہیں آ رہے تھے تو تم ی سے اپنا منہ بند رکھ کر بھی بیٹھ سکتی تھیں۔" وہ شدید غصے میں اسے مسلسل ڈانٹے جا رہی اور جواباً وہ بے بسی سے ہونٹوں کو دانتوں کی مدد سے کچلنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اب ں یہ تو بتانے سے رہی تھی کہ اسے مصعب عمیر کے کپڑوں کے رنگ سے زیادہ اس کی

آنکھوں کے بدلتے رنگوں پر اعتراض تھا جو اس کی طرف دیکھتے نہ جانے کتنے رنگوں میں ڈھل جاتے تھے۔

"میں یہ سب تمہارے بھلے ہی کے لئے کہہ رہی ہوں۔ لڑکیوں کا اس قدر منہ پھٹ ہونا کوئی پسند نہیں کرتا۔ آج جس بات کو ہنسی مذاق میں ٹال دیا گیا کل کو وہی مسئلہ بھی لٹکا سکتی ہے۔ لڑکی ہونے کے ناطے تمہیں یوں بھی احتیاط سے کام لینا چاہئے اور تم ہو کہ اپنے سسرال میں، اپنے ہونے والے شوہر کے ساتھ ہی اس قدر بدتمیزی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔" اس کی خاموشی کو محسوس کر کے وہ قدرے نرم پڑیں۔

"یہ سسرال کہاں سے آ گیا بیچ میں.....؟ میں کسی سسرال وسرال کو نہیں مانتی۔ وہ میرے تایا اور تائی اماں کا گھر ہے اور بس۔" وہ ایک دم ہی تنتنا کر بولی۔

"اور بس.....؟" امی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

"اور وہ جو چھ سال پہلے تمہاری تائی اماں نے تمہارے ہاتھ میں مصعب کے نام کی انگوٹھی ڈالی تھی وہ کچھ نہیں.....؟ وہ جو تم اتنے عرصے سے عید، بقر عید کے جوڑے اور ڈھیروں تحفے اپنے تایا تائی سے وصول کر رہی ہو وہ کس رشتے کے حوالے سے.....؟"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے.....؟ کیا وہ لوگ اپنی بھتیجی کو یہ سب نہیں دے سکتے.....؟" اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنا چاہا۔

"بھتیجوں، بھانجیوں کو جس طرح دیا لیا جاتا ہے اس میں اور ہونے والی بہو کو دینے دلانے میں جو زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے وہ تم اتنی سمجھی نہیں ہو کہ سمجھ نہ سکو اور یہاں سمجھانے کا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں انہوں نے تمہیں اپنی بہو بنانا کیا تھا اور ہم نے، تمہارے ماں باپ نے اس رشتے کی منظوری دی تھی۔ اب تم کون ہوتی ہو اتنے سال بعد اس رشتے کی اہمیت کو سمجھنے سے انکار کرنے والی.....؟" ان کا کسی قدر مدہم پڑ جانے والا غصہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے عود کر آیا تھا۔

"آپ نے اتنی کم عمری میں میری زندگی کا فیصلہ کر دیا۔ آپ لوگ اتنی عجلت سے کام لینے کے بجائے ذرا رک کر فیصلہ کرتے۔ کم از کم میرے میچور ہونے کا ہی انتظار کر لیتے تو

جب کی طرح شرما حضوری میں خاموش رہنے کے بجائے آج اپنی رائے دینے کے قابل تو ئی۔" امی کے غصے کے باوجود اسے لگا کہ اگر اب بھی اس نے کچھ نہ کہا تو زندگی بھر کچھ نہ کہہ ے گی۔

"اچھا تو اب دے دو تم اپنی رائے۔ کیا کمی ہے مصعب میں جو تم اسے رد کر رہی .....؟ پڑھا لکھا نہیں.....؟ خاندان میں تم سے کمتر ہے.....؟ شکل صورت معمولی ہے.....؟ پے پیسے کی کمی ہے یا خدانخواستہ کسی برے فعل میں ملوث ہے.....؟"

"میرا مزاج اس سے میل نہیں کھاتا۔ وہ نہایت غیر سنجیدہ انسان ہے۔"

"اور تم نہایت سنجیدہ مزاج ہو جو ایسے بچکانہ خیالات کا اظہار کر رہی ہو.....؟ ارے ر چراغ لے کر بھی نکلو گی تو مصعب جیسا لڑکا نہیں ملے گا تمہیں۔ رہی مزاج ملنے کی بات تو وہ بھی تمہارا ہم سے بھی نہیں ملا تو کیا اس بات کے پیچھے تم ہمیں بھی چھوڑ جاؤ گی.....؟" امی ل طور پر جلال میں آ چکی تھیں۔

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش تو کریں امی.....!"

"مجھے کچھ سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ میں تمہارے ے کہوں کہ کل وہ تمہارے تایا تائی کو بلائیں اور کوئی قریب کی تاریخ دیکھ کر ان سے تمہاری ہتی کی بات کریں ورنہ تم تو شاید ہمارے سر پر خاک ڈلوا کر رہو گی۔ انہی باتوں سے ڈر کر ک بیٹی کے پیدا ہونے پر گھبراتے ہیں۔"

امی غصے میں اتنی سخت بات کہہ گئی تھیں کہ اب اس کے پاس احتجاج کی کوئی گنجائش ی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

عمیر کاظمی اور ظہیر کاظمی سگے بھائی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے۔ ظہیر چھوٹے ہونے کے باوجود نہایت سنجیدہ اور پڑھاکو تھے تو عمیر حد درجے شوخ مزاج اور کتابوں سے بھاگنے والے۔ مزاج کا فرق عملی زندگی میں بھی سامنے آیا۔ ظہیر پڑھ لکھ کر لکچرر شپ کی طرف چلے گئے اور عمیر نے قسمت کی مہربانی سے اپنے چھوٹے چچا نے سے

شروع کئے جانے والے بزنس میں اتنی ترقی کی کہ چند برسوں میں کہیں سے کہیں جا پہنچے۔
البتہ اولاد کے معاملے میں دونوں بھائیوں کی زندگی میں ایک خانہ خالی تھا۔ ظہیر اولادِ نرینہ کی خوشی سے محروم تھے تو عمیر کے گھر اللہ کی رحمت نے اپنی جھلک نہ دکھائی تھی۔ بظاہر دکھائی ا... ان اختلافات کے باوجود دونوں بھائیوں کے دل باہم ایک تھے۔ جہاں لوگ ظہیر کاظمی کی محدود آمدنی اور تین تین بیٹیوں کے بوجھ پر افسوس کرتے وہیں عمیر اپنے چھوٹے بھائی کی قابلیت اور لیاقت کے حد درجہ دلدادہ تھے۔ انہوں نے کبھی بھی ظہیر کی بیٹیوں کو اپنے اکلوتے بیٹے سے کم نہ سمجھا تھا۔ خصوصاً روحینہ تو انہیں بہت ہی زیادہ عزیز تھی۔ بالکل ظہیر ہی کی طرح سنجیدہ اور پڑھاکو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے روحینہ کے میٹرک کرنے سے قبل ہی اسے مصعب کے لئے مانگ لیا تھا۔ ان کی چھوٹی بہن نرجس جو نہ جانے کب سے اپنی بیٹی کے لئے مصعب کے خواب دیکھ رہی تھیں اور بھائی سے اپنی بات منوانے کے لئے کسی خاص موقع کی منتظر تھیں یکدم طے پا جانے والے اس رشتے پر بوکھلا کر رہ گئیں۔

اب اس سلسلے میں ان کی واحد اُمید روحینہ اور مصعب کے مزاجوں میں پایا جانے والا فرق تھا جسے وہ اکثر اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کرتیں کہ روحینہ کو اپنا اور مصعب کا ساتھ نبھنا واقعی بے حد مشکل محسوس ہوتا۔ منگنی کے وقت تو اس نے ای ابو کے فیصلے پر صاد کرتے ہوئے آرام سے مصعب کے نام کی انگوٹھی پہن لی تھی۔ یوں بھی اتنی سی عمر میں وہ اس رشتے اور اس سے منسلک نزاکتوں کو سمجھنے سے قاصر تھی لیکن بعد کے عرصے میں اسے اپنے اور مصعب کے درمیان کا فرق اتنی بار دکھایا گیا کہ وہ اپنی سوچوں کو اُلجھنے سے روک نہ سکی۔ بچپن کے وہ سارے قصے جو اس کی یادداشت سے محو ہو چکے تھے اس عرصے میں اتنی بار دہرائے گئے تھے کہ اسے ازبر ہو گئے تھے۔

"تمہیں یاد ہے روحی......! ایک بار تمہاری سالگرہ پر مصعب نے تمہیں بڑا خوبصورت سے گفٹ پیپر میں پیک کر کے ایک ڈبہ دیا تھا اور جب تم نے وہ گفٹ کھولا تھا اس میں سے ڈھیر سارے لال بیگ نکل کر پوری ڈائننگ ٹیبل پر پھیل گئے تھے۔" پھپھو ہنستے اسے یاد دلاتیں اور اس کا حلق اندر تک کڑوا ہو جاتا۔

مصعب کی اس حرکت کی وجہ سے اس روز اسے اپنی دوستوں کے سامنے بڑی سبکی ...انی پڑی تھی۔ پیکٹ میں سے نکلنے والے لال بیگ نے بڑی افراتفری مچائی تھی۔ کیک کٹنے ...انتظار میں ٹیبل کے گرد کھڑی اس کی سہیلیاں دل دوز چیخیں مارتی اِدھر اُدھر بھاگ رہی ...ں۔ بیچاری سونیا تو اس بری طرح ڈر کر بھاگی کہ سامنے رکھی کرسی کو بھی نہ دیکھ پائی اور اس ...ٹکرا کر اس بری طرح گری کہ اس کی کہنیاں اور گھٹنے چھل گئے جبکہ لال بیگ نے اس ...ان آزادانہ مٹر گشت کرتے ہوئے کیک سمیت تمام لوازمات پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ ...یے تھے۔ اگرچہ ای نے اسی وقت اس کی دوستوں کی خاطر مدارت کے لئے ہر چیز بیکری ...دوبارہ منگوا کر دے دی تھی لیکن اپنی سالگرہ کے اسے چھوٹے سے فنکشن کے خراب ہو ...نے کا قلق دنوں اس کے دل سے نہ نکل سکا تھا۔ وہ گھنٹوں اس گھڑی کو کوستی رہی تھی جب ...نے فون پر باتیں کرتے ہوئے یوں ہی مصعب کو اپنی سالگرہ اور دوستوں کی آمد سے باخبر ...تھا اور وہ اتنا بڑا مفت خورا تھا کہ بغیر دعوت ملے صرف خبر سن کر ہی اگلی صبح تایا ابا کے ساتھ ...کے گھر آ دھمکا۔

روحینہ نے مصعب کی اس حرکت پر رو رو کر تایا ابا سے شکایت کی تھی اور وہ واقعی ...غصے میں آ گئے تھے کہ اگر ظہیر انہیں روک نہ لیتے تو یقیناً ان کا ہاتھ اس پر اُٹھ جاتا۔

"میں نے تو صرف اس کے ساتھ مذاق کیا تھا ڈیڈی......! مجھے کیا پتا تھا کہ یہ کیک ...ٹنے سے پہلے ہی مریدوں کی طرح گفٹ کھولنے بیٹھ جائے گی اور اتنا زیادہ نقصان ہو جائے

سارا الزام اس کے سر ڈالتے ہوئے اس نے اتنے آرام سے اپنی غلطی کی وضاحت ...کی کہ روحینہ واقعی اپنی جگہ شرمسار ہو کر رہ گئی تھی۔ اگر وہ اس قدر جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرتی ...یناً مصعب کا مذاق اتنی سنگین صورت اختیار نہ کرتا۔

"غلطی چاہے جس کی بھی تھی۔ اب تم دونوں جھگڑا ختم کرو اور آپس میں ہاتھ

ظہیر کاظمی کے حکم دینے پر روحینہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی مصعب کی طرف دوستی کا

ہاتھ بڑھانا پڑا تھا لیکن اس دوستی میں پائیداری کبھی بھی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ سبب ہمیشہ مصعب کی شرارتیں ہوتی تھیں۔ کبھی وہ روحینہ کے اسکول بیگ میں ربڑ کی چھپکلی رکھ دیتا تو کبھی اس کی نوٹ بک گھر کے ایسے حصے میں چھپا دیتا جہاں تک روحینہ کے خیال کی پہنچ بھی نہ ہوتی۔ اپنے گھر میں مصعب کی آمد کے ساتھ ہی وہ بے حد الرٹ ہو جاتی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرے گا جس سے اسے پریشانی اُٹھانی پڑے لیکن ہر بار ہی وہ اسے جل دے جاتا تھا۔ مصعب کی شرارتوں کا دائرہ صرف اسی تک محدود نہیں تھا بلکہ اکثر شبینہ اور تہمینہ بھی اس کا نشانہ بنتی رہتی تھیں لیکن وہ دونوں روحینہ کی طرح شور مچانے یا رونے دھونے کے بجائے مصعب کے ساتھ ایسی ہی کوئی شرارت کر کے اپنا بدلا لے لیا کرتی تھیں۔ اصل مسئلہ تو روحینہ کے ساتھ تھا جو نہ اس قسم کی حرکتیں کرتی تھی اور نہ ہی اس سے یہ سب برداشت ہوتا تھا۔

مصعب سے اس کی منگنی بھی صرف اس وجہ سے ہو گئی تھی کہ وہ کالج میں پہنچ کر اپنی پڑھائی میں بے طرح مصروف ہو گیا تھا اور اسے ان لوگوں کی طرف آنے اور شرارتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس عرصے میں روحینہ کے ذہن سے بھی تمام سابقہ واقعات کے نقوش مدہم پڑ گئے تھے بلکہ اس سے جڑ جانے والے سچے رشتے نے دھڑکنوں میں اس کے لئے ایک خاص "لے" بھی پیدا کر دی تھی۔ جس میں یقیناً زیادہ ہاتھ مصعب پر دیئے جانے والے اس کی دوستوں کے کمنٹس کا تھا۔

چارمنگ، ڈیشنگ، وِنڈرفل، ہینڈسم، کون سی اصطلاح تھی جو ان لوگوں نے اس کی تعریف میں بلا دریغ استعمال نہ کی ہو اور پھر مصعب کا تعلیمی ریکارڈ اور مالی حیثیت بھی ایسی غیر متاثر کن خوبیاں نہ تھیں جن سے کوئی مرعوب ہوئے بغیر رہ پاتا۔ پھر وہ تو کچی عمر کی لڑکی تھی اس کے حوالے سے خوبصورت خواب دیکھنے سے خود کو کیسے باز رکھ پاتی۔ لیکن اس کے ان خوابوں کو مصعب نے بہت بری طرح توڑا تھا۔ منگنی کے بعد جو دو سال کا عرصہ مصعب عمیر نے پاکستان میں گزارا۔ وہ روحینہ ظہیر کے لئے بڑا صبر آزما ثابت ہوا۔ مگیتر ہونے کے حوالے سے کوئی خصوصی توجہ اور اہمیت دینا تو ایک طرف رہا وہ اس کا مذاق اُڑانے کا کوئی موقع

سے جانے نہ دیتا۔ کبھی اسے روحینہ کی چٹیا چھپکلی کی دُم سے مشابہہ نظر آتی تو کبھی اسے کی خوبصورت آنکھوں پر بھینس کے دیدوں کا گمان گزرتا۔ اس کے ہلکے اور مدہم رنگوں لے ملبوسات پر وہ اسے بوڑھی روح کا خطاب دیتا تھا۔ غرض اس کی کسی چیز کی تعریف کرنا تو کی بات وہ تو شاید اس کی کسی چیز کو پسند ہی نہیں کرتا تھا۔ روحینہ کے اس خیال کو نرجس پھپھو صبوحی نے ہمیشہ تقویت دی تھی۔

"روحی.....! یہ مصعب بھائی ہمیشہ تمہارے اوپر اتنے برے ریمارکس پاس رتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بڑے ماموں نے زبردستی ان سے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہو دہ دل سے اس رشتے پر راضی ہی نہ ہوں۔"

صبوحی لہجے میں بھرپور تشویش سمیٹ کر اس سے کہتی اور وہ صدقِ دل سے ایمان لے آتی۔ بھلا اور کیا وجہ ہو سکتی تھی مصعب کے اس رویے کے پیچھے۔ خاندان کی دوسری یکیوں کے بارے میں تو وہ کبھی ایسی بات نہیں کرتا تھا۔

"اس میں کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ مصعب بھائی مزاجاً ذرا مختلف ہیں۔ ہیں عام لڑکوں کی طرح اپنی منگیتر کے پیچھے گھومنے اور بلاوجہ ڈائیلاگ مارنے کی عادت نہیں ہے لیکن وہ صرف تم پر تبصرے کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ صرف تمہیں ہی دیکھتے یں۔ اس لئے تمہیں بھی بلاوجہ کے وہم پال کر اپنے آپ کو ٹینشن میں مبتلا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

سونیا اس کے اندیشوں کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے اسے سمجھاتی تو اسے اس کی بات درست محسوس ہونے لگتی۔ یوں ہی اُمید و بیم کے درمیان ڈولتے اس کی منگنی کے دو سال مکمل ہوئے تھے۔

☆☆☆

"روحینہ بیٹا.....! آج شام کو تیار رہنا۔ مصعب تمہیں اپنے ساتھ ڈنر پر لے جانا چاہتا ہے۔" امی کی بات سن کر بائیالوجی کا چیپٹر رٹتی روحینہ کے ہاتھ سے کتاب چھوٹتے چھوٹتے بچی۔

"جی امی.....! کیا کہا آپ نے.....؟ میں نے صحیح سے سنا نہیں۔"

"بیٹا.....! ایک ہفتے بعد مصعب کینیڈا جا رہا ہے۔ جانے سے پہلے وہ تمہیں ایک بار اپنے ساتھ ڈنر پر لے جانا چاہتا ہے۔ ایک تو پہلی بار اس نے ایسی کوئی بات کی ہے اور دوسرے وہ اتنی دور جا رہا ہے کہ شاید کئی سال تک واپسی ممکن نہ ہو اس لئے میں اس کی فرمائش رد نہ کر سکی۔"

اس کی ہونق شکل کو دیکھتے امی نے ذرا وضاحت سے اپنی بات سمجھائی۔

"جی امی.....! ٹھیک ہے۔ میں شام میں سات بجے تک تیار ہو جاؤں گی۔" امی کو یقین دہانی کرواتے خود اس کے اپنے دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔

"کیا وہ جاتے جاتے منگنی کی انگوٹھی مجھے واپس کر کے زبردستی کے اس بندھن سے نجات چاہتا ہے.....؟" دل میں اُٹھتے اس اندیشے نے جہاں بے چین کیا تھا وہیں اُمید کی ایک کرن بھی چمکی تھی۔

"ہو سکتا ہے۔ وہ مجھے اس رشتے کی خوبصورتی کا احساس دلانا چاہتا ہو۔ جاتے سے اپنی محبت کا اعتراف اور ہمیشہ خود کو میرا پابند رکھنے کا عہد کرنا چاہتا ہو۔"

اسی اُدھیڑ بن میں اس کا سارا دن گزر گیا تھا۔ الماری سے ایک ایک کپڑا نکال کر اس نے اپنے بیڈ پر ڈھیر کر دیا تھا لیکن اس سے کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ شینہ کا خیال تھا کہ اسے اپنا بلیو جارجٹ کا سوٹ جس پر سفید موتیوں کی خوبصورت بیل لگی ہے پہننا چاہئے کیونکہ بلیو کلر مصعب کا فیورٹ کلر ہے۔ خود اسے ذاتی طور پر اپنا یہ سوٹ اتنا خاص پسند نہیں تھا اس لئے وہ کشمکش کا شکار تھی۔

"ارے یہ کپڑوں کا ڈھیر کیوں لگا رکھا ہے.....؟ کیا الماری کی سیٹنگ کر رہی ہو وہ بھی ایگزامز کے دنوں میں.....؟" کپڑوں کے ڈھیر کے پاس پریشان بیٹھی روحینہ کو صبوحی کی آواز نے چونکایا۔

"آ ڈیئر صبوحی.....! تم ہی کچھ مشورہ دو۔ میرا دماغ تو اس وقت بالکل کچھ کام نہیں کر رہا۔" وہ بیزاری سے کہتے ہوئے کپڑے ایک طرف ہٹانے لگی تاکہ اس کے بیٹھنے کے لئے

گنجائش نکل سکے۔

"ویسے تو میں اس وقت تم سے نوٹس لینے آئی تھی لیکن تم درخواست کرتی ہو تو تمہیں مشورے سے بھی نواز دوں گی لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہیں مشورہ چاہئے کس سلسلے میں.....؟" وہ روحینہ کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"وہ یار.....! بات دراصل یہ ہے کہ مصعب آج رات مجھے ڈنر پر لے جا رہا ہے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کہ میں کیا پہنوں.....؟ شینہ کا خیال ہے کہ مجھے اس کی پسند کا کلر پہننا چاہئے لیکن میں کچھ مطمئن نہیں ہو پا رہی۔ اب تم بتاؤ کہ میں کیا کروں.....؟" کچھ جھجکتے ہوئے اس نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"تمہیں کیا ضرورت ہے ابھی سے اس کی پسند ناپسند کو اپنانے کی.....؟ وہ کون سا کبھی تمہاری کسی بات کا خیال کرتا ہے جو تم اس کا خیال کرو.....؟ اول تو تمہیں اس کے ساتھ ڈنر پر جانے سے ہی انکار کر دینا چاہئے تھا۔" صبوحی بجائے کوئی مشورہ دینے کے اسے ڈپٹنے لگی۔

"مجھ سے کسی نے پوچھا ہی کب جو میں انکار کرتی۔ اس نے تو ڈائریکٹ امی سے اجازت لی ہے۔ اب امی کی اجازت کے بعد میرے انکار کرنے کا تو کوئی جواز ہی نہیں بنتا ناں۔" وہ گھبرا کر وضاحت دینے لگی۔

"چلو خیر امی کے حکم پر اس کے ساتھ ڈنر پر جانا تمہاری مجبوری سہی لیکن اور معاملات میں تو امی دخل نہیں دیں گی۔ ویسے بھی مجھے پورا یقین ہے کہ اس نے جان بوجھ کر تمہیں تنگ کرنے کے لئے ڈنر کا پروگرام رکھا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ دو دن بعد تمہارا پیپر ہونے والا ہے، اور وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ تم صحیح طرح سے اپنی پڑھائی کر سکو۔ یاد نہیں بچپن سے اس کی عادت رہی ہے۔ تمہارے ایگزامز کے دنوں میں اُلٹے سیدھے پروگرام رکھ کر تمہیں ڈسٹرب کرنے کی۔"

روحینہ کو یاد آ رہا تھا کہ وہ کیسے عین ایگزامز کے دنوں میں گھر پیچ کر شینہ اور تہمینہ کے ساتھ اُلٹے سیدھے کھیل تماشے کرتا تھا اور خود اسے بھی زبردستی اسٹڈی ٹیبل سے اُٹھا کر

اپنے ساتھ شامل ہونے پر مجبور کر دیتا تھا۔

"اب تمہیں کرنا یہ ہے کہ کوئی بھی ایسا ڈریس پہنو جو اسے سخت ناپسند ہو اور اس کے ساتھ گھر سے جاتے وقت ہی ایسا رویہ رکھنا کہ وہ تمہیں جلد از جلد واپس بھیج دے اور تمہارا کم سے کم وقت ضائع ہو۔" صبوحی مسلسل اس کی برین واشنگ کر رہی تھی۔ روحیہ کو اس کا ہر مشورہ دل و جان سے قبول تھا۔

☆☆☆

دبتے ہوئے بالکل سادہ براؤن سوٹ پر، لائٹ براؤن لپ اسٹک لگائے، بالوں کو سختی سے چوٹی کی شکل میں باندھے، ہر قسم کی جیولری سے مبرا وہ ہارن کی آواز پر گھر سے نکل کر مصعب کی گاڑی کی طرف بڑھی تو اس کی شکل کے بگڑتے زاویوں نے اسے اچھی طرح احساس دلایا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی ہے اور مصعب اس کی تیاری سے سخت بدمزہ ہوا ہے۔

"خیال تو یہ تھا کہ تمہیں ڈنر سے پہلے کسی خوبصورت سی جگہ پر لے کر جاؤں گا پھر تمہارے ساتھ ڈنر اور لانگ ڈرائیو ہوگی لیکن اس وقت تم مجھے اتنی زہر لگ رہی ہو کہ میں نے اپنے پروگرام میں فوری طور پر ایک ترمیم کر لی ہے اور اب میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے بجائے ایک دوسری جگہ چھوڑ رہا ہوں۔" اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے بغیر کسی لاگ لپٹ کے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ روحیہ کو اپنی پلاننگ کے دوسرے حصے پر عمل کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا اس کی اس بات پر الجھ کر ہکا بکا بیٹھی رہ گئی۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ اسے قریبی واقع ایک پارلر کے سامنے اتار چکا تھا۔

"آپ ان کا حلیہ درست کریں۔ میں ابھی پچیس تیس منٹ میں ڈریس اور دیگر چیزیں آپ تک پہنچاتا ہوں۔"

ریسپشن پر بیٹھی لڑکی سے کہہ کر وہ اتنی تیزی سے وہاں سے پلٹا کہ وہ اس کی اس حرکت پر احتجاج بھی نہ کر سکی۔

"جی بتائیے۔ آپ کو کس طرح کی سروسز چاہئیں.....؟ ڈلہن میک اپ کروانا ہے یا

پارٹی میک اپ.....؟" ریسپشنسٹ کے الفاظ بظاہر عام سے تھے لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سچویشن کو اپنی مرضی کا رُخ دیتے ہوئے اس کی طرف سے کچھ مشکوک ہو چکی ہے۔

روحیہ کا دل چاہا کہ وہ وہیں سے واپس لوٹ جائے لیکن ایک تو اس کا ہینڈ بیگ مصعب کی گاڑی میں رہ گیا تھا، دوسرے وہ تنہا گھر واپس جا کر امی کے سوالوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ لہٰذا بہت سوچ سمجھ کر اس نے اپنا ہیر اسٹائل چینج کروانے کا فیصلہ کیا۔

بیوٹیشن کے اس کے بال سیٹ کرنے تک مصعب واپس آ چکا تھا۔ ینگر میں لکھے بلیو گر کے سوٹ کو دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے لیکن وائے مجبوری وہ اس جگہ خود کو تماشا نہیں بنا سکتی تھی سو خاموشی سے کپڑے چینج کرنے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ سوٹ کی خوبصورتی اور نفاست جہاں اس کے کسی مہنگے بوتیک سے خریدے جانے کی گواہ تھی وہیں اس کا بالکل درست فٹنگ مصعب کے اس کے بارے میں صحیح اندازے کا واضح ثبوت بھی۔

"آیئے میم! میں جلدی سے آپ کا میک اَپ کر دوں۔ آپ کے ہزبینڈ کہہ رہے ہیں کہ انہیں کہیں ڈنر پر آپ کو لے کر فوراً پہنچنا ہے۔" اس کے ڈریسنگ روم سے نکلتے ہی وہی لڑکی جس نے اس کا ہیر اسٹائل سیٹ کیا تھا فوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ یقیناً یہ مصعب کی سحر انگیز شخصیت کا کمال تھا کہ وہ لوگ پہلے سے موجود کسٹمرز کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ تھے۔

"ویسے آپ بڑی لکی خاتون ہیں جو آپ کے شوہر اتنے صبر و تحمل والے ہیں۔ نجمہ بتا رہی تھی کہ آپ اپنی ہر چیز گھر پر بھول کر آ گئیں اور وہ بیچارے ماتھے پر کوئی شکن لائے بغیر دوبارہ گھر واپس جا کر وہ سب لے آئے ورنہ عموماً سر دائیں باتوں پر شدید غصے میں آ جاتے ہیں۔"

نجمہ یقیناً ریسپشن پر موجود لڑکی کا نام تھا جسے مصعب نے یہ ساری کہانی گھڑ کر سنائی تھی اور اس نے بھی فوری طور پر یہ سب کچھ اندر اپنی ساتھیوں تک پہنچا دیا تھا۔

"ویسے سچ بتاؤں ابھی تھوڑی دیر پہلے ویٹنگ روم میں آپ کے ہزبینڈ کی جھلک

دیکھی تھی۔ آپ تو ان کے سامنے بالکل یونہی سی لگ رہی تھیں لیکن اب ذرا سا حلیہ بدلنے سے بالکل ان کی ٹکر کی لگ رہی ہیں۔ آپ دونوں یقیناً ایک پرفیکٹ کپل ہیں۔"

جتنی تیزی سے اس کے ہاتھ چل رہے تھے اتنی ہی تیزی سے زبان بھی فراٹے بھر رہی تھی اور روحیہ کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اس سچویشن میں اس کی کسی کسی بات کی تردید بھی نہیں کر سکتی تھی سو خاموشی سے بیٹھی صبر کے گھونٹ بھرتی رہی۔

"ویسے لگتا ہے کہ آپ لوگوں کی ابھی نئی نئی شادی ہوئی ہے کیونکہ آپ خاصی کم عمر لگ رہی ہیں اور آپ کے شوہر بھی بہت فریش اور ینگ ہیں۔"

"پلیز زیادہ ڈراک میک اَپ مت کیجئے گا۔ مجھے پسند نہیں۔" پوٹیشن کی بات کا جواب دیئے بغیر اس نے اسے ٹوکا۔ اس نے روحیہ کی ہدایت پر اس کا کافی لائٹ میک اَپ کیا تھا پھر بھی وہ یکسر تبدیل لگ رہی تھی۔ ویٹنگ روم میں انتظار کرتا معصب اسے اپنے سامنے پا کر مبہوت رہ گیا تھا۔

"اپنی مسز کو ہمارے پاس لاتے رہئے گا سر.....! یقیناً آپ ہمیشہ اسی طرح اچھا فیل کریں گے۔" اس کی محویت کو بھانپ کر ریسپشنسٹ نے شرارت سے کہا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"اگر تم گھر سے ہی اس طرح تیار ہو کر نکلتیں تو یقیناً ہمارا یہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ ضائع ہونے سے بچ جاتا۔ لیکن تمہیں تو کچھ عقل ہی نہیں ہے پیاری مسز.....!" گاڑی میں بیٹھ کر اس کو احساس دلاتے ہوئے وہ آخر میں کچھ شرارتی ہوا تھا۔

دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی روحیہ ڈیش بورڈ پر رکھا اپنا ہینڈ بیگ اُٹھا کر اس میں سے کچھ پیپرز نکالنے لگی۔ ابھی اسے اپنی اُدھوری رہ جانے والی پلاننگ کو بھی تو مکمل کرنا تھا۔

"کیا محبت نامہ لکھ کر لائی ہو میرے لئے.....؟ لیکن یار.....! جب میں ساتھ موجود ہوں تو اس تکلف کی کیا ضرورت ہے.....؟ جو کچھ کہنا ہے زبان سے ڈائریکٹ کہہ دو۔" نہ جانے آج وہ خلافِ معمول اس قدر ریلیکس کیسے ہو رہا تھا۔ روحیہ کو اپنا دل پسلیاں توڑ کر

باہر نکلتا محسوس ہوا پھر بھی وہ پیپرز کھول کر خود کو پوری طرح اس میں غرق ظاہر کرنے لگی۔

"کیا ہے یار.....! کیا بوریت پھیلا رکھی ہے.....؟ میں تمہیں لے کر نکلا تھا کہ تم سے کچھ باتیں کروں گا اور تم ہو کہ نہ جانے کیا فضول چیز لے کر بیٹھ گئی ہو۔" وہ اس کی عدم توجہی پر جھنجلا ہی گیا۔

"کوئی فضول چیز نہیں۔ میرے بائیالوجی کے نوٹس ہیں۔ دو دن بعد پیپر ہے میرا۔ میرے پاس وقت کی شدید کمی ہے۔ تم گاڑی چلاؤ جب تک کسی ہوٹل تک پہنچیں گے میں اس میں سے کچھ پوائنٹس یاد کر لوں گی۔" پیپرز پر نظر جمائے وہ نہایت سنجیدگی سے بولی لیکن معصب عمیر کے تو دماغ کا فیوز ہی اُڑ گیا۔

کیا مطلب ہے تمہارا.....؟ میں تمہارا شوفر ہوں جو خاموشی سے گاڑی چلا کر تمہیں کسی ہوٹل تک لے جاؤں اور تم ڈنر کر لو تو واپس تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں.....؟"

"تو امی نے یہی کہا تھا کہ تم مجھے اپنے ساتھ ڈنر پر لے جانا چاہتے ہو۔ اب بیچ میں تم نے کیا کیا فضول پروگرام بنا رکھے تھے میرا وقت ضائع کرنے کے لئے، مجھے اس کی تو خبر نہیں تھی ورنہ گھر پر ہی منع کر دیتی۔"

اس کے ذہن میں مسلسل یہی تھا کہ معصب جان بوجھ کر اس کا وقت ضائع کر رہا ہے سو اپنے خیالات کا اظہار پورے اطمینان سے کر ڈالا۔

"معاف کیجئے گا محترمہ.....! مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اس دُنیا کی سب سے معروف اور وقت کی قدر دان خاتون کے معمولات میں مخل ہوا ہوں۔ جو وقت گزر گیا اسے تو واپس لانا ممکن نہیں۔ میں بس اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آپ کے وقت کو مزید ضائع ہونے سے بچا لوں۔"

نہایت تلخی سے اسے جواب دیتے ہوئے اس نے گاڑی کا رُخ واپسی کے راستے پر موڑ دیا تھا اور پھر فل اسپیڈ میں گاڑی دوڑاتا وہ اسے چند منٹوں میں ہی واپس گھر کے گیٹ پر پہنچا چکا تھا۔

"آؤ.....!" انہوں کی طرح گم صم بیٹھی روحیہ سے اس نے سرد لہجے میں صرف

ایک لفظ کہا اور وہ خائف ہو کر اگلے ہی پل نیچے اتر گئی اور وہ زن سے گاڑی دوڑاتا سیکنڈوں میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

امی ابو کے ساتھ شبینہ اور تہمینہ بھی اسے ائیر پورٹ تک چھوڑنے گئی تھیں۔ ان لوگوں نے اس سے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا تھا لیکن وہ ایگزام کی تیاری کا بہانہ کر کے انہیں ٹال گئی۔

اس دن مصعب کے غصے میں واپس لوٹنے پر وہ بہت گھبرائی تھی اور اسے لگا تھا کہ اس سے کچھ غلط ہو گیا ہے لیکن پھر صبوحی نے اس کی پریشانی کو یہ کہہ کر ختم کر دیا تھا کہ۔

''ارے یہ لڑکے تو ہوتے ہی حد سے زیادہ انا پرست اور خود پسند ہیں۔ مصعب کے سارے غصے کی وجہ یہ تھی کہ تم نے اس کی اس قدر پلاننگ اور محنت کے باوجود اسے لفٹ نہیں کروائی۔ وہ تو یہی سمجھ رہا ہوگا ناں کہ تم ذرا سے کپڑے اور جیولری دیکھ کر اس کے قدموں میں گر جاؤ گی لیکن شاباش ہے تم پر کہ تم نے اس کا سارا غرور خاک میں ملا دیا۔'' صبوحی نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔

''اب تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے اسے سی آف کرنے جانے کی۔ ورنہ وہ سمجھے گا کہ تمہیں اس کی ناراضی کی فکر ہے۔'' صبوحی کے مشورے پر اس نے پوری طرح عمل کیا تھا یہ سوچے بغیر کہ اسے جانے سے روکنے والی صبوحی خود جوش و خروش سے مصعب کو رخصت کرنے گئی تھی۔

مصعب کی جدائی کے چار سال اس نے بڑی بے نیازی سے گزارے تھے۔ اپنی کتابوں کی دنیا میں مصروف وہ اپنے اور اس کے درمیان تعلق کو ایک طرح سے فراموش ہی کر بیٹھی تھی حالانکہ یہ کوئی ایسی بھولنے والی بات نہیں تھی۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ تایا ابا اور تائی اماں ہر موقع پر اسے اس رشتے کا احساس دلاتے، قیمتی تحائف کے ساتھ ان کے گھر آتے رہتے تھے۔ شاید اس کی بے نیازی کے پیچھے صبوحی کا دلایا گیا یہ یقین تھا کہ مصعب بھی اکثر لوگوں کی طرح مغرب کی آزاد فضاؤں میں رچ بس جائے گا اور اسے اپنے اور روحینہ کے

درمیان جڑا رشتہ ہرگز بھی یاد نہیں رہے گا۔ اس کی روانگی کے بعد روحینہ ذہنی طور پر خود کو اس بات کے لئے تیار کر چکی تھی کہ اس کا اور مصعب کا رشتہ آئندہ آنے والے وقت میں کبھی بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے خیال کی پرواز مصعب عمیر تک جانے ہی نہیں دیتی تھی۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اسے پڑھ لکھ کر ابو کا دست و بازو بننا ہے۔ یوں بھی اسے بھائی کی محرومی اور تایا ابا کا مقابلے میں اپنی نسبتاً کمزور معاشی حالت کا احساس اکثر ستاتا رہتا تھا۔

وہ اپنی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ابو کی ذمہ داریوں میں ان کا ہاتھ بٹانے کی شدید خواہش مند تھی لیکن ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اس کی زندگی کے معمولات کو اُلجھانے کے لئے وہ واپس آ گیا تھا۔ خلافِ توقع اس کے ساتھ نہ تو کوئی میم تھی اور نہ ہی اس نے روحینہ سے اپنے رشتے پر کوئی اعتراض کیا تھا۔ البتہ اس کے پاس اپنے کینیڈا کے چار سالہ قیام کے دوران پیش آنے والے واقعات کا ایک بہت بڑا اسٹاک تھا اور ان واقعات میں لڑکی کا ذکر لازم و ملزوم تھا۔ وہ رمضان کے وسط میں وطن واپس آیا تھا۔ روحینہ کی بذاتِ خود اس سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن صبوحی اسے ایک ایک بات تفصیل کے ساتھ پہنچاتی رہی تھی۔ شبینہ اور تہمینہ کے درمیان ہونے والی گفتگو میں سے بھی اکثر ایسے جملے اس کے کان میں پڑ جاتے تھے جن کا سرا کسی نہ کسی طرح صبوحی کی فراہم کردہ معلومات سے جڑ جاتا تھا۔

اس ساری صورتِ حال نے مصعب کے لئے اس کی بیزاری میں بے حد اضافہ کر دیا تھا۔ وہ ہرگز بھی اس جیسی گفتگو کرنے والے شخص سے ملاقات کی خواہش نہ رکھتی تھی لیکن جب عید کے تیسرے دن تایا ابا نے پھپھو اور ان لوگوں کی فیملی کو اپنے گھر دعوت پر بلایا تو اسے مجبوراً وہاں جانا پڑا۔ مصعب سے چاہے اسے کتنی ہی اُلجھن محسوس ہوتی ہو وہ تایا ابا اور تائی اماں کی محبتوں کی دل سے قدر دان تھی۔ ہی کی خواہش پر دعوت والے روز وہ تائی اماں کی مدد کے خیال سے کافی جلدی ان کے گھر پہنچ گئی تھی۔ لیکن اس کا سارا دن نہایت کوفت میں گزرا کیونکہ مصعب سارا وقت اسے ڈسٹرب کرتا رہا تھا۔ اس کے رویے سے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ درمیان میں چار سال کا عرصہ گزرا ہے، وہ بھی اس طرح کہ جانے سے پہلے وہ روحینہ سے ناراض ہو کر گیا تھا۔

"روحینہ......! مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ پلیز چائے کے ساتھ چار کباب تل دو۔ یہ میٹھا تم نے کیسا بنایا ہے......؟ مہمانوں سے پہلے مجھے چکھوا دو ورنہ کہیں بعد میں سب کے سامنے سبکی اُٹھانی پڑے۔ دیکھو سلاد رشین ہی بنانا۔ سادہ سلاد مجھے پسند نہیں۔"

اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے کے باوجود وہ وقفے وقفے سے کچن میں آ کر اس سے کچھ نہ کچھ کہتا رہا تھا۔

"امی......! لگتا ہے آپ آج اپنے کچن کے لئے نئی باورچن اپائنٹ کرنے کے لئے اس کا امتحان لے رہی ہیں جب ہی بیچاری سے ایک ہی دن میں اتنی ڈھیر ساری ڈشز بنوالی ہیں لیکن دیکھئے کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے میری رائے ضرور لے لیجئے گا کیونکہ آخر کار بھگتنا تو مجھے ہی ساری زندگی ہوگا۔" اس کی بات نے روحینہ کو بری طرح تپایا تھا لیکن وہ تائی اماں کی موجودگی کی وجہ سے مروتاً خاموش رہی تھی۔

"مصعب......! میری بیٹی کو تنگ نہیں کرو۔ اس کے ہاتھ میں کتنا ذائقہ ہے اور یہ کتنی سلیقہ مند ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ لہٰذا تمہیں اپنے مستقبل کے لئے پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔"

تائی اماں نے اس کی دلجوئی کے لئے مصعب کو سرزنش بھی ایسے الفاظ میں کی تھی کہ روحینہ کا موڈ مزید خراب ہو گیا تھا اور اس رات مصعب کے ساتھ ہونے والی جھڑپ دراصل اسی خراب موڈ کا شاخسانہ تھا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ معمولی سی جھڑپ اسی کے لئے خطرے کا سگنل ثابت ہوگی اور وہ آناً فاناً اسے مصعب کے ساتھ رُخصت کرنے کا فیصلہ کر بیٹھیں گی۔ تعلیم کے بعد جاب کرنے کا خواب تو ایک طرف رہا وہ اپنا لاسٹ سمسٹر بھی مکمل نہیں کر سکی تھی۔ اس واقعے کے ٹھیک پندرہ روز بعد اُس کی شادی ہونا قرار پا گئی تھی۔

☆☆☆

"یہ...... یہ سوٹ پہنوں گی میں بارات کے دن......؟ اپنی ساری زندگی میں نے ایسے کلرز کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا اور اپنی شادی والے دن مجھے یہ پہننا ہوگا۔ ناممکن، قطعی ناممکن۔ تائی اماں کو اچھی طرح پتا ہے میری پسند ناپسند کا اور پھر بھی انہوں نے میرے لئے ایسا

ٹ لیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

وہ ریڈ اور اورنج کنٹراسٹ کا نہایت قیمتی کام سے بوجھل غرارہ سوٹ سامنے پھیلائے نہایت صدمے اور حیرانی کے عالم میں بیٹھی تھی۔

"یہ سوٹ آپ کے لئے تائی اماں نے نہیں بلکہ مصعب بھائی نے اپنی پسند سے خریدا ہے۔" تہمینہ نے اسے معلومات فراہم کیں۔

"جب اسے تمیز نہیں ہے ایسے کاموں کی تو پھر ضرورت کیا ہے ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑانے کی......؟" وہ جھنجھلائی۔

"مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر آپ کو اس سوٹ میں کیا برائی نظر آ رہی ہے......؟ ر کے سب سے مہنگے بوتیک سے نہایت چھان پھٹک کر خریدا ہے مصعب بھائی نے۔ کلر مبینیشن بھی وہ ہے جو آج کل اِن ہے۔ مصعب بھائی کا خیال ہے کہ ان رنگوں میں زندگی کا ش اور ولولہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ آپ کی پسند کے ڈل اور مرے مرے رنگ خرید کر اپنا دل یں مار سکتے اور ویسے بھی آپ اس قدر اعتراض کیوں کر رہی ہیں......؟ میری سمجھ سے باہر ہے جب سجنا سنورنا ان کے لئے ہے تو ان کی پسند ناپسند کا بھی خیال کرنا ہوگا۔"

چھوٹی ہونے کے باوجود شیبنہ اس کی غلط بات پر بالکل لحاظ نہ کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے روحینہ کو اس کی حرکت پر ڈانٹ دیا تھا۔ کیونکہ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس وقت کمرے یں صبوحی اور دیگر کزنز بھی موجود تھیں۔ اگر ان میں سے کوئی روحینہ کے خیالات تائی اماں یا مصعب تک پہنچا دیتا تو خواہ مخواہ اس کی اپنی آئندہ زندگی میں بدمزگی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

"یہ تم نے خوب کہا شیبنہ......! بھلا کیوں حق نہیں روحی کو اس معاملے میں بولنے ا......؟ جب چیز اسے استعمال کرنی ہے تو اس کی پسند کو اہمیت بھی ملنی چاہئے۔"

حسبِ معمول صبوحی نے روحینہ کے بگڑے مزاج کو مزید بگاڑنے کا سامان کیا۔

"ساری زندگی اپنی پسند سے ہی پہنتی رہی ہیں۔ کبھی کسی نے ان کے معاملات ں دخل نہیں دیا۔ مایوں پر انہوں نے اپنی مرضی سے زرد کے بجائے لیمن کلر کا سوٹ بنوایا ہم نے اعتراض نہیں کیا لیکن بری کے جوڑے سسرال والے اپنی مرضی اور پسند سے نہایت

ارمانوں سے خرید کر لاتے ہیں اور ہر لڑکی وہ جوڑا پہنتی ہے۔ پھر یہ کوئی دُنیا کی انوکھی ہیں اس قدر رواویلا مچا رکھا ہے۔" شبینہ نے دوبدو جواب دیا۔

"اچھا......! اب تمہیں زیادہ بدتمیزی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود تائی اماں سے بات کر کے سوٹ چینج کروالوں گی۔"

"بدتمیز وہ نہیں تم ہو۔ اسے تمیز سکھانے کے بجائے تمہیں خود اپنی طرف دیکھنا چاہئے۔ غضب خدا کا جتنی ڈھیل دو تم اتنا ہی سر پر چڑھتی جارہی ہو۔ جہیز میں تم نے ایک بھی ڈھنگ کا سوٹ نہیں بنایا ہم چپ رہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم بری کے جوڑوں میں خامی نکالنے لگو۔ خبردار جو ایک لفظ بھی نکالا ہو اپنی تائی اماں کے سامنے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

امی نہ جانے کب کمرے میں آئی تھیں جو دونوں بہنوں کی تکرار سن لی تھی اور اب اسے بری طرح جھاڑ کر رکھ دیا تھا۔

"امی تو لگتا ہی نہیں ہے کہ میری سگی ماں ہیں۔ تائی اماں کے بجائے مجھے تو امی ہی اپنی ساس لگتی ہیں۔"

وہ تکیے میں سر دے کر رونے لگی۔ تمام تر باغیانہ خیالات کے باوجود اس میں ان کے حکم کے خلاف جانے کی ہمت نہ تھی۔

☆☆☆

"یہ میں ہوں......؟" آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر وہ خود ہی مبہوت رہ گئی۔ ایک بار کئی سال پہلے بھی وہ مصعب عمیر کی پسند کا لباس پہن کر تیار ہوئی تھی تو اسے اپنی خوبصورتی کا احساس ہوا تھا لیکن آج تو جیسے آئینہ خود اسے جھٹلانے پر تلا ہوا تھا۔ سامنے نظر آتے اپنے عکس کو وہ خود روحینہ ظہیر ماننے سے ہچکچا رہی تھی۔

"آج تو مصعب بھائی کے ہوش اُڑ جائیں گے۔" کسی کزن نے اسے چھیڑا تو پہلی بار اسے اپنے دل کی دھڑکن میں بے ترتیبی محسوس ہوئی۔

"آپی......! آج آپ اتنی حسین لگ رہی ہیں کہ قسم سے میرا دل نہیں چاہ رہا آپ

کو اپنی نظروں کے سامنے سے ہٹانے کا۔ دل چاہ رہا ہے کہ تائی اماں سے کہوں آج ہماری آپی کو یہیں چھوڑ جائیں۔ ہم کل انہیں رُخصت کر دیں گے۔"

تہمینہ میں ابھی کافی بچپنا تھا سو اکثر وہ بات بھی اسی حساب سے کرتی تھی۔

"جان سے ماردیں گے مصعب بھائی تمہیں۔ اگر جو انہوں نے تمہاری یہ خطرناک باتیں سن لیں۔" کسی نے جملہ اُچھالا اور ہر طرف جلترنگ بج اٹھا۔

"مصعب......! مصعب......! مصعب......!" ہر طرف ایک ہی نام کی گردان تھی۔

روحینہ کا ضدی دل اس نام کی مسلسل ضرب سے نئے قالب میں ڈھلنے لگا۔ شاید یہ نکاح کے چند بولوں کا اعجاز تھا جو وہ اپنی دلی کیفیت میں بے حد تبدیلی پا رہی تھی۔

"چشم بددور......! بہت پیاری لگ رہی ہو۔ صبوحی کے لئے بھی اپنے والے پارلر میں بکنگ کروالینا۔" نرجس پھپھو نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے انکشاف کیا۔

"کیا مطلب پھپھو......!" وہ کچھ حیران ہوئی۔

"ارے بھئی......! صبوحی کی پھپھو کا فون آیا تھا امریکہ سے۔ بہت عرصے سے صبوحی کو اپنے بیٹے کے لئے مانگ رہی ہیں لیکن میں ڈر رہی تھی اسے اتنی دور بھیجتے ہوئے۔ لیکن اس بار انہوں نے بے حد اصرار کیا بلکہ ایک طرح سے خود ہی فیصلہ سنا ڈالا تو مجھے ہاں کرتے ہی بنی۔ جب وہ اتنی چاہ کر رہی ہیں تو میں کہاں تک انکار کروں۔ بڑی عید کے بعد آئیں گی وہ پاکستان تو بس فوراً ہی شادی کا فریضہ انجام دے دیں گے۔"

"بہت بہت مبارک ہو صبوحی......! دیکھو تمہیں ویسٹرن ڈریسز پہننا پسند تھا تو اللہ نے تمہارے لئے بندوبست بھی کر دیا۔ اب امریکہ جا کر اپنی مرضی اور پسند سے جو چاہو پہننا۔ کم از کم وہاں یہاں کی طرح ہر بات میں رسم و رواج اور پابندیوں کی زنجیر تو نہ ہوگی۔"

یہ جانے بغیر کہ پھپھو نے مصعب کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اپنی نند کے بیٹے کے لئے حامی بھری ہے وہ جوش سے صبوحی کو مبارک باد دینے لگی۔

"خدا کے لئے روحینہ......! اسٹیج پر تو خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ سب لوگ دیکھ رہے ہیں اور باتیں سنا رہے ہیں دُلہن کے یوں بے شرمی سے پٹر پٹر باتیں بنانے پر۔"

"امی کو تو بس شوق ہے ہر بات میں پابندی لگانے کا۔" یوں ٹوکے جانے پر اس نے منہ بسور کر سوچا۔ لیکن جب رُخصتی کے وقت امی نے اسے گلے لگایا تو وہ یکدم ہر گلہ بھول کر ان کے سینے سے لگ گئی۔ خود بھی خوب روئی اور انہیں بھی جی بھر کر رُلایا۔

"بس کرو بیٹی.....! تم کہیں اور تو نہیں جا رہی ہو۔ تمہارے تایا ابا کا گھر بھی تو تمہارا اپنا ہی ہے۔"

تایا ابا نے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تو اس کا دل جیسے ٹھہر سا گیا۔

☆☆☆

"اُف خدایا.....! یہ خواتین کی رسمیں۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ تمہیں وہاں سب کے درمیان سے اُٹھا کر ایک پل میں اپنے بیڈروم میں لے آؤں۔" رُخصتی کے بعد سسرال میں اس کا نہایت پرجوش استقبال ہوا تھا۔ تائی اماں نے ہر ہر رسم پوری کی تھی۔ جس کی وجہ سے وقت بھی کافی زیادہ لگ گیا تھا۔

"تم آج کیسی لگ رہی ہو میں تمہیں لفظوں میں نہیں بتا پاؤں گا۔ اگر جاننا چاہتی ہو تو میری آنکھوں میں جھانک لو۔"

اور وہ بس ذرا سی ذرا ہی ان آنکھوں کی طرف دیکھ پائی تھی جہاں محبت اور شوق کے ڈھیروں رنگ سجائے وہ اس کا منتظر تھا۔ معصب عمیر کے لئے اس کے دل کے دروازے کیسے وا ہوئے، بدگمانی اور ناراضی کے بادل کیسے چھٹے اسے خبر ہی نہیں ہو سکی۔

"مجھے ڈیڈی سے بے حد محبت ہے لیکن وہ مجھے سب سے زیادہ اچھے تب لگے تھے جب انہوں نے تمہیں میرے لئے مانگا تھا۔ وہ مجھ سے بھی پہلے میرے دل کی بات جان گئے تھے۔ ورنہ خود مجھے تو معلوم ہی نہ تھا کہ ایک خبطی سی لڑکی کو اس کے روٹین سے ہٹا کر زندگی کی سرگرمیوں کی طرف متوجہ کرنے کے لئے میرا دل کیوں بے چین رہتا تھا۔ جب وہ لڑکی امتحان کے دنوں میں اپنی صحت اور کھانا پینا بھول کر کتابوں میں غرق رہتی تھی تو میں اس کے لئے اتنا فکرمند کیوں ہو جاتا تھا کہ اس کی ناراضی کی پروا کئے بغیر صرف اس خیال سے کہ وہ کچھ دیر کے لئے فریش ہو جائے اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتے اسے اسٹڈی ٹیبل سے اُٹھنے پر مجبور کر دیتا

تھا۔ وہ لڑکی پھیکے رنگوں والے لباس پہنتی تھی پھر بھی اس کی ایک جھلک میرے دل میں قوس و قزح کے رنگ پھیلا دیتی تھی۔" اس کے اعترافات روحیہ کو نئی نئی دُنیاؤں کی سیر کروا رہے تھے۔

"کینیڈا جانے سے پہلے تم نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس سے میں سخت ہرٹ ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں کبھی اس بات کو بھول نہیں سکوں گا لیکن پھر تمہاری ایک مہربانی کی وجہ سے جو تم چار سالوں میں ہر روز مجھ پر کرتی رہیں میں نے تمہارا ایک قصور معاف کر دیا۔"

"کون سی مہربانی.....؟" وہ حیران ہوئی۔

"تم ہر روز میرے خواب میں آتی تھیں۔ میری پسند کی روپ میں ڈھل کر۔" اس نے اتنی معصومیت سے بتایا کہ بے ساختہ ہی روحیہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

☆☆☆

"کتنی دیر ہے تمہاری تیاری میں.....؟ امی ڈیڈی تیار بیٹھے ہیں۔ اگر تمہیں دیر لگے گی تو میں ان سے کہتا ہوں وہ ڈرائیور کے ساتھ چلے جائیں ہم لوگ بعد میں پہنچ جائیں گے۔" وہ جو بڑی دیر سے تیار باہر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"بس تیار ہوں میں۔ ذرا یہ نیکلس پہن لوں۔" وہ لاک لگانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔

"لاؤ میں لگا دیتا ہوں۔" وہ فوراً ہی اس کی مدد کو پہنچا۔ سازھی کی پیچنگ کی نگینوں سے مرصع نیکلس اس کی صراحی دار گردن میں بے حد سجنے لگا۔

"پرفیکٹ کپل۔" ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں نظر آتے اپنے اور اس کے عکس کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اسے بے ساختہ ہی وہ پینٹنگ یاد آ گئی تھی جس نے شادی سے پہلے ان دونوں کو یہ ٹائٹل دیا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو.....؟" اس کی محویت کو نوٹ کرتی روحیہ نے پوچھا۔

"تم پہلے تو کبھی اتنے لشکارے نہیں مارتی تھیں ڈیر وائف......! یہ آج کل اتنا چمکنے کیسے لگی ہو......؟" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"اور تم ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھتے ہو۔"

"نہیں......! خیر میرے لئے تو یہ ریمارکس بالکل ہی غلط ہیں۔ کیونکہ میں نے تو وہاں سے ہیرا دریافت کیا ہے جہاں تک کسی کی نگاہ پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا۔ تمہیں تو میری جوہرانہ صلاحیتوں کی داد دینی چاہئے ورنہ رہ جاتیں وہیں اماں بابا کے گھر ایک کونے میں کتابوں میں منہ چھپائے۔"

"اچھا بس۔ اب اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی ضرورت نہیں۔ باہر چلتے ہیں تائی اماں اور تایا ابا انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔" اس کی بات پر مزید کوئی جوابی حملہ کیے بغیر اس نے ٹوکا۔ وہ لوگ دیئے ہوئے وقت سے واقعی لیٹ ہو چکے تھے۔

"اُف آپی......! آپ پر ساڑھی تو بے حد سوٹ کر رہی ہے۔" تقریب چونکہ ان لوگوں کے مشترکہ رشتہ داروں کے ہاں ہو رہی تھی اس لئے امی لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ تہمینہ اور شبینہ حسب معمول اس کی تعریف کرنے لگیں۔ یوں بھی آج اس نے پہلی بار ساڑھی پہنی تھی۔

"صبوحی کہاں ہے شبینہ......! آئی تو ہوئی ہے پھپھو کے ساتھ......؟" تھوڑی دیر امی کے ساتھ بیٹھنے کے بعد وہ صبوحی کے لئے بے چین ہونے لگی۔

"تم نے دی آواز لو ہم آ گئے۔" شوخی سے لہراتی صبوحی اگلے ہی پل اس کے سامنے تھی۔

"بہت بے وفا ہو صبوحی......! شادی میری ہوئی ہے اور بدل تم گئیں۔ یہ نہیں کہ اتنے دنوں میں ایک آدھ چکر لگا لیتیں یا کم از کم فون ہی کر لیتیں۔" وہ خفا ہونے لگی۔

"ارے آپی......! آپ خواہ مخواہ ہی بیچاری صبوحی باجی پر غصہ ہو رہی ہیں آخر دو ماہ بعد انہیں بھی تو رُخصت ہونا ہے، کیا یہ اس کی تیاری نہ کریں......؟" شبینہ نے یاددہانی کروائی۔

"ارے واقعی میں تو بھول ہی گئی۔ تم بتاؤ صبوحی......! کیا کیا خرید لیا اتنے دنوں بں......؟"

"ڈھیر ساری ٹی شرٹس اور جینز۔" شبینہ بے ساختہ بولی۔

"واقعی صبوحی......! کیا تم جہیز میں ایسے کپڑے لے جاؤ گی......؟" روحینہ قدرے ہران ہوئی۔

"لازمی بات ہے۔ انسان کو جو پہننا ہو وہی تو خریدے گا۔ اب تمہاری طرح تو ہیں کہ لئے سارے لائٹ اور سوبر کلرز اور تقریبات میں گلا گنڈا بن کر پہنچ جاتی ہو۔"

"خیر ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپی تو بے حد اچھی طرح بالکل نئی نویلی دُلہنوں کے نایاں شان تیار ہوتی ہیں۔" تہمینہ کو صبوحی کی بات بے حد بری لگی۔

"سچ صبوحی......! کیا واقعی میں بہت بری لگ رہی ہوں ان کپڑوں میں......؟ معب کی پسند پر پہنی تھی میں نے یہ ساڑھی۔ کوئی اور تو ہے نہیں مشورہ دینے والا۔ جیسا اس نے کہا میں نے کر لیا۔" وہ حسب معمول صبوحی کی باتوں میں آ چکی تھی۔

"تمہیں کیا ضرورت ہے اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھنے کی......؟ وہی پہنا کرو جو نہیں خود پسند ہو۔" صبوحی اسے مشوروں سے نواز رہی تھی اور شبینہ اپنی بڑی بہن کی عقل پر تم کر رہی تھی جسے اپنے دوست اور دُشمن کی پہچان تک نہ تھی۔

☆☆☆

"اٹھو ناں مصعب......! مجھے دیر ہو رہی ہے۔" بالوں میں جلدی جلدی برش ہلاتے وہ اس سے بولی جو نہایت سستی سے بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹا تھا۔

"یار......! آج تم ایک دن اور چھٹی نہیں کر سکتیں۔" وہ اپنی جگہ پر لیٹے لیٹے ہی لسمسایا۔

"ہرگز نہیں......! میرا لاسٹ سمسٹر چل رہا ہے اور شادی کے بکھیڑے میں پہلے ہی تنا زیادہ نقصان ہو چکا ہے کہ اب میں مزید ایک بھی چھٹی افورڈ نہیں کر سکتی۔ ویسے تم خود بھی ستی چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہو۔ میں نے تایا ابا سے کہہ دیا ہے کہ آج سے تم بھی آفس جوائن کر

رہے ہو۔"

"اچھا تو تھوڑا لیٹ چلی جانا۔ میں دس بجے تک آفس جاؤں گا تو تمہیں بھی ڈراپ کر دوں گا۔ ایک آدھ کلاس چھوٹ جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اچھا اگر تمہارا موڈ نہیں ہو رہا ہے اُٹھنے کا تو تم آرام کرو میں پوائنٹ سے چلی جاؤں گی۔" وہ جانتی تھی کہ وہ صرف اور صرف اسے اپنے سامنے بٹھائے رکھنے کے لئے بہانے بازی سے کام لے رہا ہے لہٰذا ایسی بات کہی کہ اسے اُٹھتے ہی بنی۔

"اچھا تائی اماں......! تایا ابا......! چلتی ہوں میں۔ اللہ حافظ......!" ڈائننگ ٹیبل پر ان دونوں کو بیٹھے دیکھ کر اس نے کہا۔

"ارے بیٹی......! ناشتہ تو کر لیتیں۔ صبح صبح خالی پیٹ گھر سے جا رہی ہو۔" وہیں

یونیورسٹی میں کینٹین سے لے کر کھا لوں گی تائی اماں......! آپ فکر نہ کریں۔" ان کے ٹوکنے پر وہ یقین دہانی کروانے لگی۔

"امی......! آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ اب اس پر پڑھائی کا بھوت سوار ہو چکا ہے اور اس بھوت کی موجودگی میں یہ محترمہ کسی بھی چیز کو گھاس ڈالنے والی نہیں۔" وہ قدرے خفگی سے بولتا اس کے ساتھ باہر کی طرف بڑھا۔

"مصعب......! آج تم کچھ بھول نہیں گئے......؟" یونیورسٹی گیٹ پر گاڑی سے اُترنے سے قبل اس نے مصعب سے پوچھا۔

"کیا......؟" وہ انجان بنا۔

"میری تعریف کرنا۔ آج تم نے میری تعریف نہیں کی۔" آج وہ اپنے جہیز کا کاٹن کا سوٹ پہنے ہوئی تھی۔

"ہاں......! ٹھیک لگ رہی ہو۔"

"صرف ٹھیک......؟" وہ مایوس ہوئی۔

"یار......! تمہیں پتا ہے میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

مصعب کے جواب نے اسے کچھ کہنے کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔ وہ نہایت خاموشی

سے گاڑی سے اُتر کر گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ یونیورسٹی میں اس کا سارا دن بے دلی سے گزرا۔ وہ اس قدر اَپ سیٹ تھی کہ صبوحی بھی اس کے موڈ کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیا بات ہے روحینہ......! تم کافی چپ چپ لگ رہی ہو۔ کیا مصعب نے کچھ کہہ دیا ہے......؟" اس کے پوچھنے کی دیر تھی روحینہ نے اسے الف سے یے تک سب بتا دیا۔

"بھئی میں تو یہی کہوں گی کہ اس میں مصعب سے زیادہ تمہارا اپنا قصور ہے۔ ان دس پندرہ دنوں میں ہی تم اس قدر اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھنے لگی ہو کہ آج ذرا سا خلافِ معمول ہونے پر اس کا مزاج بگڑ گیا۔ اگر تم پہلے دن سے ہی اپنی پسند کو ترجیح دیتیں تو آج اس کی ہمت نہ ہوتی تمہیں یوں ڈی گریڈ کرنے کی۔"

"یار......! تمہیں نہیں پتا کہ شادی کے بعد شوہر کے منہ سے اپنی تعریف سننا کتنا اچھا لگتا ہے۔ جب تمہاری شادی ہوگی تو تم خود ہی سمجھ جاؤ گی۔"

صبوحی کے موردِ الزام ٹھہرانے پر وہ بے بسی سے بولی۔

"خیر میں کم از کم تمہاری طرح اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ دوسرے کی پسند ناپسند کو خود پر مسلط کرنے لگوں۔" صبوحی نے ناک چڑھا کر نخوت سے جواب دیا تھا۔

☆☆☆

"دیکھو مصعب......! یہ سوٹ کیسا رہے گا شام میں پہننے کے لئے......؟ آج ہی یونیورسٹی سے واپسی پر صبوحی کے ساتھ خرید کر لائی ہوں۔" تہمینہ کے پاس ہونے کی خوشی میں امی نے گھر پر ایک چھوٹا سا فنکشن رکھا تھا۔

"بالکل بیکار۔ تم کوئی دوسرا سوٹ پہن لو۔" مصعب نے ایک ہی نظر میں اس سوٹ کو ریجیکٹ کر دیا۔

"تم سے تو رائے لینا ہی بیکار ہے۔ تمہیں نہ تو کبھی میری کوئی چیز پسند آتی ہے اور نہ ہی کبھی توفیق ہوتی ہے کہ میری تعریف کرو۔" وہ پیر پٹخ کر غصے سے وہاں سے جانے لگی لیکن مصعب نے بازو پکڑ کر اسے روک لیا۔

"کیا کہا تم نے......؟ مجھے تمہاری کوئی چیز پسند نہیں آتی......؟"

''ہاں تو کیا غلط کہا.....؟ کبھی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے تم نے کسی چیز پر.....؟''

''اور میں تمہاری تعریف بھی نہیں کرتا.....؟''

''ہاں.....! نہیں کرتے۔'' مصعب کی اُنگلیاں اس کے بازو میں گڑی جا رہی تھیں۔

''اور اب تم آئندہ مجھ سے کسی چیز کے بارے میں رائے بھی نہیں لوگی.....؟''

''ہرگز نہیں.....!''

''جاؤ.....! جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔ اب اگر تم نے کبھی مجھ سے رائے لینے کی کوشش بھی کی تو تمہیں ناکامی ہوگی۔ تم ترس جاؤ گی میرے منہ سے اپنی تعریف سننے کو۔''

اس کے بازو پر مصعب کی اُنگلیوں کی گرفت ڈھیلی ہوگئی تھی لیکن لہجہ اتنا سخت تھا کہ وہ خود کئی لمحوں تک ساکت کھڑی رہ گئی۔ شادی کے محض پچیس دن بعد ہی ایک چھوٹی سی بات کے پیچھے وہ اپنے درمیان ایک بڑی خلیج حائل کر چکے تھے۔

☆☆☆

''کھیر بہت مزے کی ہے بیٹا.....! آج مزہ آگیا ورنہ تمہاری تائی اماں تو چاول اور دُودھ کا ملغوبہ بنا کر سامنے رکھ دیتی تھیں اور کہتی تھیں کہ یہ کھیر ہے۔ ہم بھی مجبوری کا نام شکریہ سمجھ کر کھا لیتے تھے۔ لیکن کھیر کا اصل ذائقہ تو آج ہی معلوم ہوا ہے۔'' تایا ابا اس کی تعریفوں کے ساتھ ساتھ تائی اماں کو چھیڑنے کا فریضہ بھی انجام دے رہے تھے۔

''یہ تو سچ ہے کہ روحی بیٹی نے بہت مزے کی کھیر بنائی ہے لیکن بھائی صاحب.....! آپ بھابی کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ ان کے پکائے کھانوں کی دھوم تو سارے خاندان میں ہے۔'' نرجس پھپھو جو آج اتفاقاً ہی صبوحی کے ساتھ وہاں پہنچ گئی تھیں چمچ بھر کر کھیر منہ میں رکھتے ہوئے بولیں۔

''تمہارے بھائی صاحب کی تو شروع سے یہی عادت رہی ہے نرجس.....! مجھے چھیڑنے کے لئے اکثر بلاوجہ بھی برائی کر دیتے ہیں لیکن میں ان کے مزاج کو سمجھتی ہوں۔ ان کی پسند ناپسند جاننے کے لئے مجھے کبھی زبانی تعریف کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں چہرے کے

تاثرات سے بھی ان کی مرضی جان لیتی ہوں۔''

تائی اماں کے الفاظ پر تایا ابا کے ہونٹوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ اس بات کی گواہ تھی کہ وہ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں۔

''مصعب.....! اور لو کھیر۔'' یکدم ہی اس کی نظر مصعب کے سامنے رکھی خالی پیالی پر پڑی تو اس نے قدرے فاصلے پر رکھا باؤل اس کی طرف بڑھایا۔ وہ تھوڑی سی کھیر اپنی پیالی میں ڈال کر خاموشی سے کھانے لگا۔ باقی افراد کی طرح اس نے کھیر کی تعریف نہیں کی تھی اور نہ ہی مزید کھیر کھانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن روحینہ نے خود ہی اس کی خواہش کا اندازہ کر لیا۔

''واقعی تائی اماں ٹھیک کہتی ہیں۔ انسان چاہے تو سامنے والے کے تاثرات سے بھی اس کی پسند ناپسند جان سکتا ہے۔'' اس نے بے ساختہ ہی سوچا۔

''روحی.....! تم مجھے بھی اپنے جیسی کھیر پکانا سکھا دینا۔'' وہ کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھی کہ صبوحی نے اچانک ہی اس سے فرمائش کی۔

''ارے.....! لیکن تمہیں تو کُکنگ کا بالکل بھی شوق نہیں۔'' وہ حیران ہوئی۔

''اگر کہہ رہے تھے کہ انہیں ملازمین کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں۔ کھانا مجھے خود ہی بنانا ہوگا اور کھیر کے بارے میں تو انہوں نے خاص طور پر بتایا تھا کہ ان کی پسندیدہ ڈش ہے تو میں نے سوچا سیکھ لوں۔'' یقیناً وہ فون پر اپنے منگیتر سے رابطے میں رہتی تھی۔

''چلو اچھا ہے۔ لڑکیوں کو اپنے گھر کے یہ چھوٹے موٹے کام کم از کم ضرور کرنے چاہئیں۔'' کسی کی پسند میں نہ ڈھلنے کا دعویٰ کرنے والی صبوحی کو کچھ جتائے بغیر وہ عام سے لہجے میں اس کے فیصلے کو سراہنے لگی۔

''ہفتے کو صرف دو کلاسز ہیں۔ ہم لوگ جلدی فارغ ہو جائیں گے۔ تم میرے ساتھ پاپوش چلی چلنا۔ مجھے کچھ کپڑے کام بننے کے لئے دینے ہیں۔'' سب لوگوں کو چائے سرو کر کے وہ صبوحی کے ساتھ ٹیرس پر آکر کھڑی ہوئی تو اس نے کہا۔

''لیکن تم تو وہاں کے حساب سے ڈریسز خرید رہی تھیں۔ پھر یہ اچانک کام والے سوٹ بنانے کا خیال کیسے آگیا.....؟'' روحینہ کو جھٹکے لگ رہے تھے۔

"احمر کو بتایا تھا میں نے اپنی شاپنگ کے بارے میں لیکن انہوں نے کہا کہ انہیں ویسٹرن ڈریسز بالکل پسند نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں روایتی دُلہنوں والے کپڑے ہی بناؤں۔ تو بس میں نے پچھلی ساری شاپنگ لپیٹ کر رکھ دی۔ جس کے ساتھ ساری زندگی گزارنی ہے اس کی پسند ناپسند کا خیال تو رکھنا ہی پڑے گا۔" اسے شوہر کی پسند پر چلنے پر باتیں سنانے والی اپنے منگیتر کی ایک ایک بات پر عمل کر رہی تھی۔

"صحیح کہتی تھی شبینہ...... ! میں ہی بے وقوف ہوں جو دوسروں کی باتوں میں آکر اپنا نقصان کرنے بیٹھ جاتی ہوں۔ پورا ہفتہ گزر گیا معصب نے ڈھنگ سے مجھ سے بات نہیں کی اور تعریف کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ٹھیک ہے جب میں اس کی پسند ناپسند کا خیال نہیں رکھوں گی تو وہ کیسے میری تعریف کرے گا۔" وہ وہیں کھڑے کھڑے اپنا محاسبہ کر رہی تھی۔

☆☆☆

"آج میں بکرے لینے منڈی جاؤں گا۔ ڈیڈی کا ارادہ تو گائے کی قربانی کرنے کا ہے۔ میری ان سے بات ہوئی تھی تو انہوں نے بتایا تھا کہ وہ عید سے ایک دن پہلے جانور لے کر آئیں گے لیکن میں آج ہی لانا چاہتا ہوں۔ کم از کم کچھ دن اپنی قربانی کے جانور کی خدمت کرنے کا موقع تو ملے۔" صبح وہ اور تائی اماں لاؤنج میں بیٹھے تھے تو معصب نے آفس کے لئے نکلنے سے قبل انہیں آگاہ کیا۔

اور پھر وہ شام کو دو نہایت صحت مند بکروں کے ساتھ گھر واپس آیا۔

"وائٹ والا بکرا میرا اور بلیک روحینہ کا ہے۔" تائی اماں کے استفسار پر اس نے بتایا۔

"اگر تمہیں اپنا بکرا پسند نہ آیا ہو تو بتا دو۔ تمہاری پسند سے دوسرا لے آؤں گا۔"

"نہیں...... ! ٹھیک ہے۔" اس کے پوچھنے پر روحینہ نے جواب دیا تھا۔ جس طرح آج کل وہ بکروں پر فدا تھا اسے بکرے سخت زہر لگ رہے تھے۔ آفس سے واپسی پر بنی سنوری روحینہ کے بجائے اس کی توجہ کا مرکز بکرے ہوتے تھے۔ دن بھر تو ملازم بکروں کی دیکھ بھال

کرتا تھا لیکن آفس سے واپسی پر معصب بچھڑی ماں کی طرح ان کی ناز برداریوں میں جت جاتا تھا۔ صفائی ستھرائی اور کھلانے پلانے میں اس کا دونوں بکروں کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا تھا لیکن محبت کا جو اظہار اپنے بکرے کے لئے ہوتا تھا وہ روحینہ کے بکرے کے لئے نہیں۔ روحینہ اس کی اس حرکت پر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی۔ گویا روحینہ تو ایک طرف رہی وہ اس کے نام کے بکرے سے بھی التفات برتنے کو تیار نہ تھا۔ معصب کے اس رویے نے اسے کملا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جو پہننے اوڑھنے میں اس کی پسند کا خیال رکھنے لگی تھی اب اس جانب سے بالکل لاپرواہ ہوگئی تھی۔

دوسری طرف وہ بالکل مگن تھا۔ عید سے ایک روز پہلے اس نے اپنے بکرے کی پشت پر مہندی سے عید مبارک لکھا۔ سفید بکرے پر سرخ سرخ مہندی سے لکھے الفاظ بڑے دلکش لگ رہے تھے۔ گلے میں رنگ برنگے موتیوں کا منکا پڑا تھا۔ بکرے کی اس سج دھج پر مالک اور بکرا دونوں ہی بڑے مسرور تھے۔

"سوری میاں بکرے...... ! ہم تمہیں بھی سجاتے سنوارتے لیکن تمہاری مالکن کافی سوبر خاتون ہیں۔ انہیں یہ ساری چیزیں پسند نہیں۔ اس لئے ہم یہ امتیازی سلوک کرنے پر مجبور ہیں۔" اپنے بکرے کو سجانے کے بعد اس نے روحینہ کے بکرے سے با آواز بلند معذرت کی تھی۔

پیچھے کھڑی روحینہ اس کی اس بات پر پیر پٹختی ہوئی واپس اندر چلی گئی اور معصب کا دل چاہا کہ خوب زور سے قہقہہ لگائے۔

☆☆☆

"معصب اور تمہارے تایا ابا نماز پڑھ کر واپس آتے ہی ہوں گے بیٹا...... ! تم سارے کام چھوڑ اور پہلے تیار ہو جاؤ۔ پہلی پہلی عید ہے تمہاری شادی کے بعد۔ اچھا نہیں لگتا یوں سر جھاڑ منہ پہاڑ پھرنا۔ تم نے تو مہندی وغیرہ بھی نہیں لگائی۔ تمہیں شوق نہیں اس لئے میں نے زور نہیں دیا لیکن کم از کم اب اچھی طرح تیار ہو جاؤ۔ پھر باقی سارا دن گوشت سنبھالنے اور بانٹنے میں بالکل فرصت نہیں ملے گی۔" تائی اماں کے زور دینے پر وہ بوجھل قدموں کے ساتھ

اپنے کمرے میں آ گئی۔

اگرچہ اس کی شادی کے بے شمار سوٹ ابھی اَن چھوئے رکھے تھے لیکن عید کے لئے نیا سوٹ بنانے کی بات ہی الگ ہوتی ہے اور مصعب نے اسے ایسی کوئی پیشکش نہیں کی تھی۔ امی نے بھی بجائے عیدی کا جوڑا بھیجنے کے رقم بھجوا دی تھی کیونکہ وہ دوسروں کی خریدی ہوئی چیزیں کبھی بھی پسند نہیں کرتی تھی۔

''ہر ایک کی پسند کو ریجیکٹ کر کے اپنی مرضی چلانے کا یہ انجام ہے کہ آج میرے پاس میکے سے آئی عیدی کا جوڑا تک نہیں جو کہ ہر لڑکی کے لئے مان کی حیثیت رکھتا ہے۔'' وہ پچھتاووں میں گھری بیٹھی تھی۔ آنسوؤں کے کئی قطرے آنکھ سے نکل کر رُخساروں پر پھیل گئے تھے۔

''السلام علیکم! عید مبارک.....!'' اچانک ہی مصعب کی آواز کمرے میں گونجی تو وہ جلدی جلدی آنسو صاف کر کے سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا ہوا.....؟ تم تیار نہیں ہوئیں.....؟ امی تو کہہ رہی تھیں کہ تم تیار ہو رہی ہو۔''

''کیا فائدہ تیار ہونے کا.....؟ کس کے لئے تیار ہوں.....؟'' باوجود ضبط کے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔

''تم کس کے لئے تیار ہونا چاہتی ہو یہ تو تمہیں خود ہی معلوم ہو گا۔''

''تمہیں نہیں معلوم کہ میں کس کے لئے سنگھار کرنا چاہتی ہوں.....؟ ایک شادی شدہ عورت اپنے شوہر کے سوا کس کے لئے سجتی ہے.....؟'' مصعب کی بے رُخی اسے مار دے رہی تھی۔

''تمہارے رویے سے تو کبھی ایسا ظاہر نہیں ہوا۔'' آج وہ ساری کسر نکالنے پر تلا تھا۔

''وہ میری نادانی تھی۔ کیا میری ذرا سی غلطی کی سزا تم ساری عمر دیتے رہو گے.....؟'' وہ بری طرح رو پڑی۔ اس بار وہ برداشت نہ کر سکا اور اسے بانہوں میں بھر لیا۔

''میں تمہیں کوئی سزا نہیں دے رہا تھا۔ میں صرف تمہیں احساس دلا رہا تھا تمہاری

بے وقوفی اور نادانی کا۔ تم کیا سمجھتی ہو مجھے خبر نہیں تمہارے معاملات کی یا میں تمہارا مزاج نہیں سمجھتا۔ شادی سے پہلے تمہیں کون بہکاتا تھا اور شادی کے بعد تمہیں اچھا خاصا پڑھی پر چلتے چلتے کس نے نیچے اُتارا تھا مجھے سب معلوم ہے لیکن میں چاہتا تھا کہ اس بات کو میرے بتائے بغیر تم خود سمجھو۔ زندگی کا سفر اس طرح نہیں گزارا جا سکتا کہ تم دوسروں کے بہکاوے میں آ کر اُلٹے سیدھے کام کرتی رہو اور میں تمہیں سدھارتا رہوں۔ اگر لوگوں کی باتوں میں آ کر فیصلے کرنے کی عادت مجھے ہوتی تو شاید آج ہم دونوں میاں بیوی نہ ہوتے۔'' وہ آہستہ آہستہ اسے سمجھا رہا تھا اور وہ اس کے سینے پر سر رکھے آنسو بہانے میں مصروف تھی۔

''اچھا چلو شاباش.....! رونا بند کرو اور تیار ہو جاؤ۔ امی ڈیڈی انتظار کر رہے ہوں گے۔'' اسے آہستہ سے خود سے الگ کرتے اس نے اُنگلی کی پوروں سے اس کے آنسو پونچھے۔

''میرے پاس عید کا سوٹ نہیں ہے۔'' وہ بسوری۔

''بھئی ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اتنے اہم دن تمہیں بھول جاتا۔'' وہ بولتے ہوئے الماری کی طرف گیا اور ایک بڑا سا پیکٹ نکال کر اسے تھمایا۔

''اچھا.....! تو یہ میرے لئے تھا.....؟ میں نے سوچا پتا نہیں کیا چیز ہے۔ کھول کر ہی نہیں دیکھا۔'' وہ جلدی جلدی پیکٹ کھول کر اس میں سامان نکالنے لگی۔

''تم دس منٹ کے اندر تیار ہو جاؤ۔ پھر مجھے قصائی سے بھی معاملات نمٹانے ہیں۔'' اور وہ واقعی نہایت پھرتی سے کام لے کر دس منٹ میں تیار ہو چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے عید کے لباس میں دیکھے بغیر باہر نہیں جانا چاہتا۔

''بیوٹی فل.....! زبردست.....! اب لگ رہی ہو نا تم مسز روحیہ مصعب۔'' وہ بہت خوش تھا اسے اپنی پسند کے لباس میں دیکھ کر۔

''تم نے اپنے بکرے کو تو خوب سجایا اور میرا بکرا بیچارہ ایسے ہی کھڑا ہے۔ معصوم جانور کے ساتھ ناانصافی کرتے ذرا شرم نہ آئی۔'' اچانک ہی اسے یاد آیا تھا۔

''فکر مت کرو ڈیئر وائف.....! تمہاری طرح تمہارے بکرے کی آرائش کی ساری چیزیں بھی سنبھال کر رکھی ہیں۔'' اس کے شکوہ کرنے پر اس نے مسکرا کر بتایا۔

''ٹھیک ہے.....! لیکن ایک چیز اب بھی رہ گئی۔''

''وہ کیا.....؟''

''عیدی.....!''

''اچھا.....! لیکن عیدی لینے کے لئے عید ملنا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔'' وہ شریر ہوا۔

''ہاں تو جب تم نماز پڑھ کر آئے تھے تو عید مبارک نہیں کہا تھا تمہیں.....!'' وہ اس کے تیور سمجھ کر بات بنانے کی کوشش کرنے لگی۔

''اونہوں.....! عید تو ویسے ہی ملی جائے گی۔ جیسا کہ رسم دُنیا ہے، موقع ہے اور دستور بھی ہے۔''

وہ اپنی بانہیں وا کئے کھڑا تھا اور روحینہ نے ان بانہوں میں سمانے کی دیر نہ کی۔ صبح عید اس کے لئے مسرتوں کی پیامبر بن کر آئی تھی۔

☆☆☆